قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اگست 2012، قیمت -/15

قارئین اردو دنیا کو 66واں یوم آزادی مبارک

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

سائبر اسپیس میں اردو! نئی پیش رفت

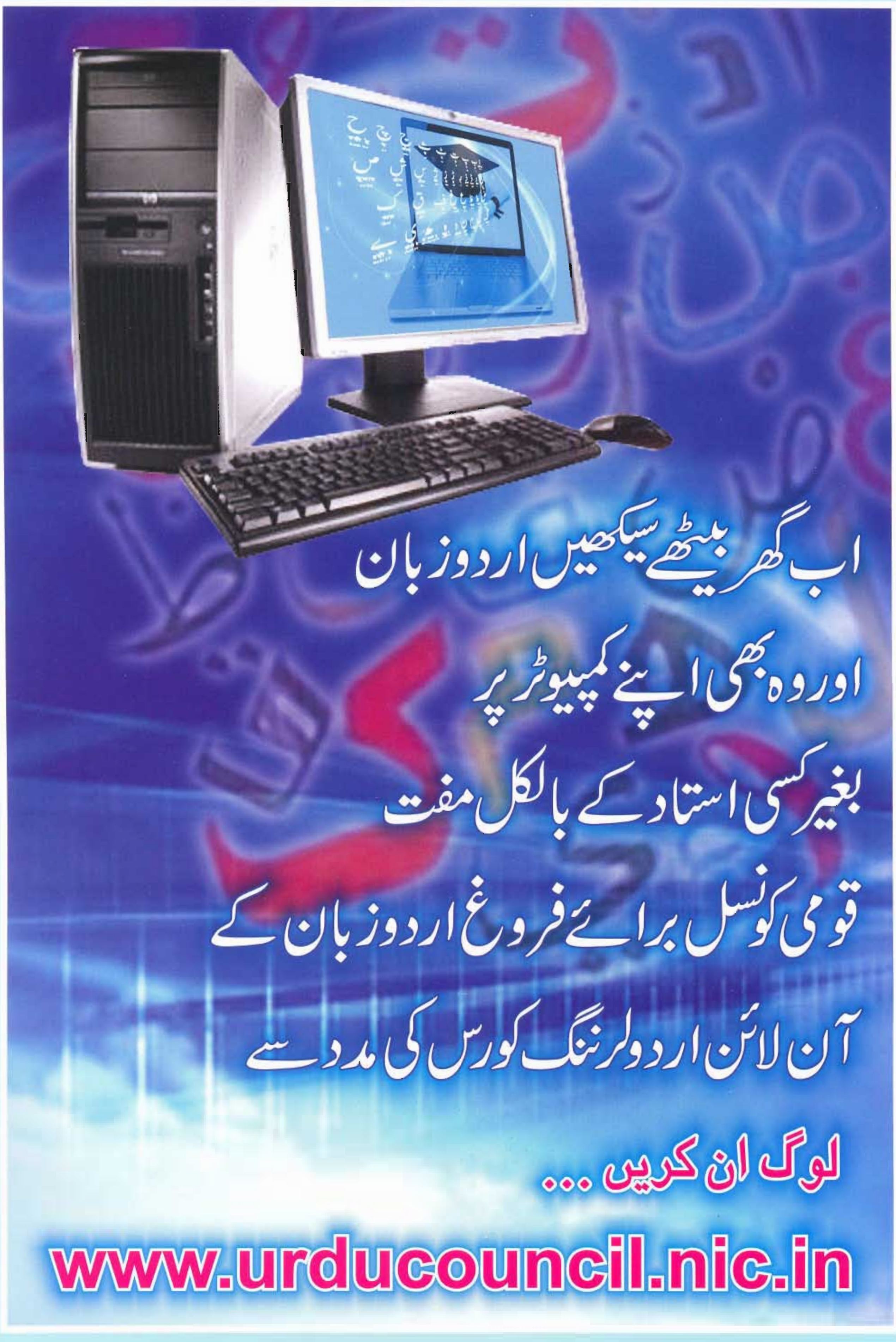

اب گھر بیٹھے سیکھیں اردو زبان
اور وہ بھی اپنے کمپیوٹر پر
بغیر کسی استاد کے بالکل مفت
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے
آن لائن اردو لرننگ کورس کی مدد سے
لوگ ان کریں ...
www.urducouncil.nic.in

ماہنامہ اردو دنیا
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:14، شمارہ:08، اگست 2012

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا
انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

قیمت-/15 روپے، سالانہ -/150 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
(شعبۂ ادارت: 4953909)

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7
آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

مشمولات

اداریہ
ہماری بات — 2

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط — 3

انٹرویو
وسیم بریلوی — نصرت ظہیر — 5

کور اسٹوری
آن لائن میڈیا کا تصور اور اردو — خواجہ اکرام الدین — 10
اردو ڈیجیٹل لائبریری اور آن لائن — راغب اختر — 13
اردو ذریعہ تعلیم اور روزگار — ہاجرہ بانو — 16

یوم آزادی پر
ہمارا قومی پرچم — عظیم اقبال — 18

خراج عقیدت
آہ! وہاب اشرفی — ہماوں اشرف — 20

شخصیات
معین احسن جذبی کی یاد میں — کرشن بھاوک — 24

زبان و تعلیم
اردو کے ارتقا میں — انور ادیب — 28
اڑیسہ میں اردو — سعید رحمانی — 30

ادبی مباحث
لالہ رخ: کشمیر کی الف لیلہ — غلام نبی خیال — 32
گل بکاؤلی کی حقیقت — عبدالسلام — 35

صحافت
مولانا آزاد کی صحافت — حبیب احمد — 39

ہم نے جنھیں بھلا دیا
ادارۂ شمع: اردو کی قندیل — فیروز بخت احمد — 42

مشاہیر ادب/نظم
ن م راشد — ادارہ — 45
انتخاب کلام — ن م راشد — 46

مشاہیر ادب/نثر
فکر تونسوی — ادارہ — 49
دس روپے کا نوٹ — فکر تونسوی — 50

فلم
اینی میشن کی جادوئی دنیا — بانو سرتاج — 52

شہر بین
گوالیار: ایک تعارف — سی ایم خان — 55

ہماری مطبوعات
نواب واجد علی شاہ — کوکب قدر — 58

کیریئر گائڈ
ایرواسپیس — شمیم اختر — 62

دوسری زبانوں سے
تیلگو کہانی 'سنگم' — وولگا
ترجمہ: بلقیس ظفیر الحسن — 64

سائنس
اب کھل رہے ہیں — عبیدالرحمٰن — 68

قومی اردو کونسل کی میٹنگ
ایگزیکیوٹیو بورڈ کی XXXIV میٹنگ — ادارہ — 72

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف — 76

ٹیلی ایڈیشن
اردو دنیا ٹی وی — ادارہ — 82

عالمی اردو نامہ — ادارہ — 83

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 85

ہماری بات

انٹرنیٹ کے کسی بھی سرچ انجن پر آپ 'اردو سائٹس' ٹائپ کیجیے۔ اردو کی درجنوں یا سیکڑوں نہیں، ہزاروں ویب سائٹوں کے لنک آپ کے کمپیوٹر کی اسکرین پر روشن ہو جائیں گے۔ انٹرنیٹ کے ان عالمی دریچوں سے اردو زبان و ادب سے لے کر اردو سے متعلق فنون لطیفہ، اردو تعلیم، اردو صحافت، اور کسی حد تک سائنس، تاریخ اور دیگر علمی موضوعات سے بہت کچھ مواد آپ کو مل جائے گا۔ لیکن انٹرنیٹ پر اردو کی موجودگی اور اردو والوں کے ذریعہ کمپیوٹر کے استعمال کا آپ دوسری زبانوں سے موازنہ کریں اور تقابلی جائزہ لیں گے تو مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کو عام زندگی کا حصہ بنے ہوئے اب دو عشرے پورے ہو رہے ہیں۔ اس مختصر عرصے میں دوسری زبانوں نے ٹیکنالوجی کے ان جدید ترین وسائل سے جتنا فائدہ اٹھایا ہے اسے پیش نظر رکھا جائے تو آپ پائیں گے کہ اردو اس سلسلے میں خاصی پیچھے رہ گئی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ جو ویب سائٹس اردو میں موجود ہیں، ان میں سے بیشتر اردو ادب یا اردو شاعری کے ہی ارد گرد گھومتی ہیں۔ اردو زبان کی تعلیم، کمپیوٹر ایجوکیشن، اردو کے کتابی سرمائے، سائنس، تاریخ، فلسفہ اور دیگر علوم سے وابستہ نصابی و غیر نصابی معلومات، متون اور تراجم کی دستیابی، اردو لغات اور اردو انسائیکلو پیڈیا سے آراستہ، اردو سے جڑی ہوئی تجارتی سرگرمیوں، اشیا کی خرید و فروخت، اور عام اردو آبادی کی روزمرہ زندگی میں کام آنے والی ویب سائٹیں انٹرنیٹ پر یا تو ہیں ہی نہیں اور اگر ہیں تو ان کی تعداد بہت کم ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے کسب فیض کی اس دوڑ میں اردو کے لیے ایک بڑی رکاوٹ اس کا رسم الخط تھا، جو عکس اساس Image Based ہونے کی وجہ سے، اس عالمی مواصلاتی شاہراہ پر، جسے عرف عام میں انٹرنیٹ کہا جاتا ہے، سرپٹ نہیں دوڑ سکتا تھا۔ لیکن یونی کوڈ Unicode نے عکسی اور عددی Digitized رسم الخط کے فرق کو مٹا کر اس مشکل کو بھی دور کر دیا ہے۔ اب آپ اپنے ڈیسک ٹاپ یا لیپ ٹاپ کو پوری طرح ایک اردو مشین میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ آپ کا کمپیوٹر آپ کی تمام ہدایات اردو میں قبول کر لے گا۔ ای میل کے ذریعے خط و کتابت اور چیٹنگ باکس کے ذریعے بات چیت کے لیے اردو الفاظ کو رومن حروف میں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ سیدھے اردو میں لکھیے اور جس سے آپ مخاطب ہیں وہ اردو سے واقف ہے تو اس سے اردو میں ہی جواب پائیے۔ سرچ انجنوں پر اردو رسم الخط کو قبول کرنے اور اردو ترجمے کی سہولت بھی شروع ہو چکی ہے۔ اس مجموعی صورت حال میں فروغ اردو کے سفر کو تیز تر کرنے اور کمپیوٹر و انٹرنیٹ کی فراہم کردہ تمام سہولتوں سے اردو کو جوڑنے کی سمت میں، فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر عالی جناب کپل سبل کی خاص دل چسپی رہی ہے اور ان کی قیادت میں قومی اردو کونسل، اردو زبان کو ایک سائبر انقلاب سے ہم کنار کرنے کے لیے پوری دل جمعی سے کمر بستہ ہو گئی ہے (ملاحظہ ہو اس شمارے کی 'کور اسٹوری') اب آپ کونسل کی ویب سائٹ پر اردو سیکھ سکیں گے، کمپیوٹر کی تربیت پا سکیں گے اور اردو کی بے شمار کتابیں براہ راست اپنے کمپیوٹر کی اسکرین پر پڑھ سکتے ہیں اور مفت ڈاؤن لوڈ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ کپل سبل صاحب کی اردو نوازی ہے کہ انھوں نے اس کام میں پوری دل چسپی لینے اور ہر طرح کی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ ان کا جذبہ ہم سبھی کے لیے لائق تقلید ہے۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ کپل سبل صاحب کی وساطت سے سرکار نے تو اپنے حصے کی ذمے داری قبول کر لی ہے، اب ہم اردو والوں کو بھی اردو کی توسیع کے لیے بڑھ کر آگے آنا ہوگا۔ یہاں بڑے ادب سے یہ بات گوش گزار کرنا مقصود ہے کہ ہمارے بہت سے محترم ادیب، نقاد اور معلمین ابھی تک کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے دور ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ کمپیوٹر کا استعمال ان کے لیے بہت زیادہ مشکل ہے جب کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اب کمپیوٹر سیکھنا اور سمجھنا بہت ہی آسان ہے۔ ہمارے محترم اردو قائدین و قارئین روزمرہ کے کئی کام، مثلاً اردو میں خط و کتابت، اردو ٹائپ، اور تخلیقات لکھنے کے کام کمپیوٹر کی مدد سے بہ آسانی کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم سبھی اردو والے ان جدید ترین سہولتوں سے جتنا زیادہ جڑیں گے اردو کو اتنی ہی وسعت ملے گی۔ اس لیے ہماری ایک ہی گزارش ہے، کمپیوٹر کے ذریعے بڑھ چڑھ کر اردو کا استعمال کیجیے، اور زیادہ سے زیادہ اردو والوں کو کمپیوٹر سے جوڑیے۔ اردو والوں کے ذریعے کمپیوٹر کا زیادہ سے زیادہ استعمال دراصل اردو کی ہی خدمت ہے! یہ بازاری دنیا ہے جتنا ڈیجیٹل مارکیٹ میں جس قدر اردو کا مطالبہ ہوگا اسی مناسبت سے اردو کے سوفٹ ویئر ڈیولپ ہوں گے۔

اس درخواست کے ساتھ دل کی گہرائیوں سے 66ویں یوم آزادی کی مبارک باد قبول فرمائیے۔ آزاد ہندوستان، زندہ باد!

آپ کی بات

ک ملک العزیز

42 پرمبور ہائی روڈ، چینئی 12

'اردو دنیا' کا جولائی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ یہ شمارہ اپنی دیرینہ روایتوں کی غمازیوں سے دو قدم آگے ہی ہے۔ سلام بن رزاق کا انٹرویو بے حد پسند آیا۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا کہ سلام صاحب نے ابتدائی دنوں میں ہی شاعری کو سلام کرلیا اور افسانوی ادب کی طرف پوری طرح مائل ہوگئے ورنہ آج افسانہ نگاری میں انھیں جو مقام نصیب ہوا ہے وہ شاید نہیں مل پاتا۔ سلام نے مذہب اور ادب کی اقدار سے تعلق سے اپنی رائے کا اظہار بڑے اچھے انداز میں کیا ہے۔ افسانہ نگاری میں انھوں نے صرف کرشن چندر کا نام لیا ہے جب کہ اسی دور میں مہندر ناتھ، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ بھی موجود تھے، جن کا رول ترقی پسند تحریک میں کافی اہمیت کا حامل تھا۔ سلام نے شمس الرحمٰن فاروقی کے ناول 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' کے تعلق سے بڑے بے باکانہ انداز میں ایک اہم سچائی کو قاری کے سامنے رکھ دیا ہے کہ ''یہ ناول بے جا تاریخی حوالوں اور اکتا دینے والی تفاصیل کے سبب بوجھل ہوگیا اور فاروقی کا یہ ناول ماضی پرستی کی خراب مثال ہے۔'' ذاتی طور پر میں بھی کئی برسوں سے اس خیال سے متفق رہا ہوں کہ ''زبان کے فروغ کی بات تو بعد میں آئے گی پہلے ہمیں اس کی بقا کے جتن کرنے ہوں گے'' ہماری قوم کو چاہیے کہ اردو تعلیم کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنائے۔ مجاز پر زبیر رضوی نے ایک اچھا مضمون لکھا ہے۔ مجاز کی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے پھر بھی ان کے اندر کی جو زخمی پرتیں تھیں، ان پر نمایاں روشنی بہت کم ڈالی گئی ہیں۔ زبیر نے ایک نئے زاویے کے ساتھ مضمون کا حق ادا کیا ہے۔ ابن صفی کے نثری جواہر پارے کے ساتھ ان کی شاعری کا انتخاب بہت اچھا لگا۔ رؤف خیر کا مضمون 'نئی اردو نظم نئی اصناف نئی فکر' بہت ہی اعتدال پسند رویہ کا حامل ہے لیکن ریکارڈ کی درستگی کے طور پر ایک اہم تذکرہ کا اضافہ کرنا چاہوں گا۔ ہائیکو نظموں پر علیم صبا نویدی کے تین مجموعے 'ریشے' (1968)، 'شعاعِ مشرق' (1969)، اور 'تشدید' (1912) میں منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔ نیز حال ہی میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے علیم صبا نویدی کی تین سطری نظموں کا ایک مجموعہ 'نقش طراز' اپنے تفصیلی مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے اور اس کا اجرا 2011 میں رانچی کے ایک شاندار جلسے میں عمل میں آیا تھا۔ 'ہندوستانی سینما کے سو سال' میں نصرت ظہیر نے فلمی قارئین کے لیے بے حد دلچسپ معلومات سے نوازا ہے۔ من حیث المجموع 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ اپنے نثری حصے کی آب و تاب کے ساتھ ساتھ فکر و احساس کی سربلندیوں کو چھونے میں کامیاب و کامران ہے۔

راشد جمال فاروقی

سی 1452، آئی ڈی پی ایل، ویربھدر رشی کیش، دہرہ دون

'اردو دنیا' سے طویل غیر حاضری کی تلافی کر رہا ہوں۔ گجرال کمیٹی جب اردو کے بارے میں اپنی رپورٹ تیار کرتے ہوئے سروے کر رہی تھی تو اندر کمار گجرال سے پنجاب میں ایک کسان نے شکایت کی۔ اس کی تکلیف یہ تھی کہ اردو میں غالب اقبال پر تو بے شمار کتابیں بازار میں ہیں لیکن جب اس کا ٹریکٹر بگڑ جاتا ہے تو اسے ٹھیک کرنے کی کوئی کتاب اسے کہیں نہیں ملتی۔ وہ صرف اردو لکھ پڑھ سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دیگر زبانوں میں ہر موضوع پر کتابیں دستیاب ہیں بس اردو میں ادب کے سوا کچھ اور ممکن ہی نہیں ہے۔ لیکن آپ لوگوں نے NCPUL کے ترجمان 'اردو دنیا' کو دنیا جہان کے موضوعات کے لیے وقف کر دیا ہے تبھی تو مفید ضروری تقاضوں کو پورا کرنے والے مضامین اردو دنیا کی زینت بنتے ہیں۔

افتخار امام صدیقی

مدیر ماہنامہ 'شاعر' ممبئی

جون 2012 کے اردو دنیا میں، میرے دادا جان علامہ سیماب اکبر آبادی (5 جون 1881 - 30 جنوری 1950) کے لیے جو مختصر سا گوشہ شائع کیا گیا ہے۔ اس میں علامہ کے دواوین کے نام غلط شائع ہو گئے ہیں۔ یہ نام شعری دواوین کے نہیں بلکہ اولین دیوان کلیم عجم کے ابواب کے نام ہیں یہ غلطی انجمن ترقی اردو (ہند) کے ایک البم کی ہے جس میں قلی قطب شاہ سے لے کر احسان دانش تک مشاہیر کی تصاویر، ان کی تحریر کا عکس اور سوانحی کوائف دیے گئے تھے۔ اس غلطی کو نقوش (لاہور) کے کوائف نمبر میں دہرایا گیا۔ اسی کا چربہ صابر دت نے فن و شخصیت کے کوائف نمبر میں کیا تھا یہی غلطی اردو دنیا کے نئے شمارے میں آ گئی ہے۔ اس اہم اور مختصر گوشے میں علامہ پر جو بھی تحقیقی مقالہ دیا گیا ہے، اس میں اگر ان کے شعری دواوین کے صحیح نام کی تصحیح کر دیں تو بندہ احسان مند ہوگا۔ ساہتیہ اکادمی نے ہندوستانی ادب کے معمار کے تحت برادرم حامد اقبال صدیقی کا سیماب اکبر آبادی (مونوگراف) 2009 میں شائع کیا گیا تھا۔ 152 صفحات کو محیط اس کتاب کو اگر علامہ کا اختصار بند سوانح کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ کلیم عجم (1936) سدرۃ المنتہیٰ (1946) لوح محفوظ (1979) کلیم عجم کے دو ایڈیشن شائع ہوئے تھے۔ سیماب اکاڈمی (ممبئی) سے اور سیماب اکادمی کراچی سے۔ سدرۃ المنتہیٰ کا صرف ایک ہی ایڈیشن لوح محفوظ کے تین ایڈیشن شائع ہوئے تھے سیماب اکادمی بمبئی نے 1979 اور دوسرا ایڈیشن سیماب اکادمی کراچی نے 1980 میں شائع کیا تھا اور اسی کا تیسرا جعلی ایڈیشن، حسامی بک ڈپو (حیدرآباد) سے شائع ہوا تھا۔ علامہ کا غیر مدون کلام ماضی کے ادبی رسائل و جرائد میں اپنی تدوین کا منتظر ہے۔ بقول ظ انصاری مرحوم۔ ''علامہ سیماب اکبر آبادی کی غزلوں، نظموں سے یہ اندازہ کرنا مشکل ہے۔ آیا وہ غزل کے بڑے شاعر تھے یا نظم کے'' تین صد سے زائد چھوٹی بڑی کتابوں کی اشاعتی تفصیل، ماہنامہ شاعر کے ضخیم ہم عصر اردو ادب نمبر (تیرہ سو صفحات مطبوعہ، 88-1987) کے تحت دی گئی ہے۔ علامہ ایک ایسا تخلیقی ذہن تھے کہ ہزاروں تلامذہ کے علاوہ مکتبہ قصر الادب سے جاری ادبی رسائل، تاج، ثریا، شاعر، ایشیا، کنول، پیمانہ، بھی تھے۔ علامہ سیماب اکبر آبادی اعلیٰ درجے کے مترجم بھی تھے۔ احادیث نبوی کے منظوم تراجم بہ عنوان مسند احمد کے علاوہ مثنوی معنوی کے چھ دفتروں کا منظوم ترجمہ الہام منظوم۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1926 میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ علامہ کا سب سے عظیم کارنامہ منظوم ترجمہ قرآن بہ عنوان وحی منظوم ہے۔ اس کے چار ایڈیشن سیماب اکاڈمی (کراچی) سے شائع ہوئے تھے۔ 1980 میں اس کو ہجرہ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔ لوح محفوظ کی طرح اس کا بھی ایک جعلی ایڈیشن فرید بک ڈپو (دہلی) سے شائع ہوا تھا۔ یہاں علامہ کے ان آٹھ مجموعوں کا ذکر نہیں ہے جو نظمیہ شاعری اور رباعیات کو محیط ہیں۔ علامہ پر تحقیقی کاموں کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی کی ایک طالبہ نے اپنا طویل مقالہ ڈگری کے لیے جمع کروا دیا ہے۔ بعینہٖ جموں یونیورسٹی کی ایک طالبہ نے علامہ پر کی گئی اپنی جدید تحقیق کو پانچ سو صفحات میں لکھ کر یونیورسٹی میں جمع کروا دیا ہے۔ اوپر مندرجہ اجمالی تفصیلات ایک نابغہ شاعر کے ادبی قد کو فلک بھر بنانے کے لیے کافی ہیں۔ اردو دنیا کے بیشمار قارئین سے التماس ہے کہ علامہ سیماب اکبر آبادی کے لیے

مغفرت کی دعاؤں کے ساتھ یہ بھی دعا کریں کہ مرحوم کا اپاہج پوتا ان کے کاروافکار کی تدوین کرسکے۔

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی

صدر شعبہ اردو، انجمن ڈگری کالج، بھٹکل (کرناٹک)

اردو دنیا ماہ جون 2012 پیش نظر ہے، یہ بہت اچھا ہوا کہ اس بار آپ نے کور اسٹوری کے تحت 'تعلیم کا حق اور اقلیتیں' کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ پچھلے دنوں یہ موضوع کافی زیر بحث رہا ہے، خصوصاً مسلم اقلیتوں کے درمیان یہ ایک بہت ہی سلگتا ہوا سوال تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اب آپ کے اداریہ اور پروفیسر اختر الواسع کے مقالے سے حق تعلیم ایکٹ کے سلسلے میں مسلمانوں کے شکوک وشبہات کا ضرور ازالہ ہوگا۔ پروفیسر مظفر شہ میری نے اردو تنقید میں تعصب پر ادبی بحث چھیڑی ہے اور ادب میں اس کی مختلف صورتوں کا ذکر مثبت اور تعمیری انداز میں کیا ہے۔ اس موضوع پر میں نے بھی اپنی طالب علمی کے دور میں ایک مضمون لکھا تھا جو بعد میں ماہنامہ 'فن کار' حیدرآباد کے جنوری 1988 کے شمارے میں شائع ہوا۔ میرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اردو تنقید بہت کم تعصب سے پاک رہی ہے۔ محمد حسین آزاد سے حالی وشبلی، سرور وکلیم اور احتشام حسین تک کی کتابوں سے اس کے حوالے دیے جاسکتے ہیں۔ اس بار ادبی مباحث کے تحت آپ نے پروفیسر عبدالمغنی کی اقبال شناسی پر، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی کا بہت ہی عمدہ مضمون شائع کیا ہے۔ جس میں عبدالمغنی مرحوم کی تنقیدی نگارشات کا متوازن اور معروضی مطالعہ بڑی جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مشاہیر ادب میں علامہ سیماب اکبرآبادی کا تعارف وتذکرہ اور انتخاب کلام بہت خوب ہے۔ یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ قومی اردو کونسل کی ڈائرکٹر شپ کا قرعۂ فال آپ کے نام نکلا ہے، حق بحقدار رسید کے مصداق ہوا، مبارکباد قبول فرمائیں۔ گذشتہ برس کے ماہ ستمبر میں علی گڑھ میں ادبی تحقیق اور سائبر اسپیس کے عنوان سے آپ کا معلوماتی لکچر سننے کا موقع ملا تھا۔ آپ کے نام کے ساتھ یہ لکچر بھی مجھے یاد آگیا۔

خورشید عالم شمسی رامپوری

مہاراج گنج، پوسٹ رفیع گنج، ضلع اورنگ آباد، (بہار)

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ جون 2012 موصول ہوا۔ آپ کا یہ مجلّہ بلندیوں کو چھوتا جارہا ہے۔ آپ کا اداریہ بے حد پسند آیا۔ جناب ندا فاضلی صاحب کے انٹرویو نے بھی بے حد متاثر کیا۔ 'تعلیم کا حق اور اقلیتیں'، 'حق تعلیم ایکٹ پوری دنیا کے لیے' جناب کپل سبل کی تحریر اور جناب وسیم احمد کا اردو ترجمہ قابل ستائش ہے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ، ضلع نظام آباد (اے پی)

جون 2012 کا 'اردو دنیا' میرے زیر مطالعہ ہے۔ سرورق پر 'تعلیم ہمارا حق ہے'، تعلیم کا حق اور اقلیتیں عصری اور سلگتا ہوا موضوع ہے۔ ماہر تعلیم کپل سبل نے دانش ورانہ انداز سے اقلیتوں کی تعلیمی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ کی بات کالم موثر اور فکر انگیز ہوتا جارہا ہے۔ اس سے شمارے کی قدر وقیمت، حسن وقبح کا تعین ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ ٹھیک ہے۔ ندا فاضلی کا انٹرویو ان سے گفتگو فکر انگیز اور ادبی معلومات سے لیس ہے۔ 'کور اسٹوری' کے تحت 'تعلیم کا حق اور اقلیتیں' (ادار) 'حق تعلیم ایکٹ' (کپل سبل)، 'حق تعلیم ایکٹ شعاع امید' (اختر الواسع) تعلیم کے بارے میں مفید وجدید معلومات ہیں۔ 'ہندوستان عالمی طاقت بننے کی راہ پر' (نسیم احمد) نے عمدہ اور اہم باتوں کو پیش کیا ہے۔ ہندوستان کی عصری ترقی میں جو تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں اُسے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مستقبل میں سپر پاور بنے گا۔ لیکن مزید ترقی درکار ہے۔ طالب علموں کے لیے یہ رسالہ کسی نعمت سے کم نہیں۔ اس رسالے سے اردو ماحول میں عصری انقلاب آرہا ہے۔ عالم گیریت کے اس عہد میں اردو ماحول کے لیے ایسے ہی رسالے کی ضرورت ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ اردو والوں سے کہتا ہوں کہ وہ ضرور اس رسالے کے خریدار بن جائیں تاکہ ہمارے بچے اس کو پڑھ کر عصری شعور وآگہی حاصل کرسکیں۔

پروفیسر محمد فاروق بخشی

صدر شعبۂ اردو، موہن لال سکھاڈیہ یونیورسٹی، ادے پور

'اردو دنیا' کے جون 2012 کا شمارہ موصول ہوا۔ کور، سائز اور شامل چیزیں دیکھ کر جی خوش ہوا۔ آپ کی سربراہی میں اب مزید امکانات روشن ہوں گے۔ ندا فاضلی کا انٹرویو پسند آیا۔ کور اسٹوری کے تحت دونوں مضامین بہت اہم ہیں ایسے مضامین اوبی موضوعات سے بھی زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ زہرہ سہگل کے حوالے سے عبدالحیٔ صاحب کا مضمون بہت اچھا لگا۔ سیماب اکبرآبادی کے کلام کا انتخاب اچھا لگا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے پوری نسل کی ادبی آبیاری کی۔ ایسے شعرا کو بھی عہد ساز کہا جاتا ہے۔ بوم میرٹھی پر ڈاکٹر خالد حسین خاں کا مضمون بوم میرٹھی جنھیں واقعی فراموش کردیا گیا اچھا مضمون ہے۔ میرے ذہن میں اپنے لڑکپن کے دن گھوم گئے جب میرٹھ کے گلی کوچوں میں بوم میرٹھی کی نظموں اور غزلوں کے چرچے تھے۔ مگر زیادہ تر کلام سینہ بہ سینہ لوگوں تک پہنچا ہے۔

معین الدین شمسی

حاجی جمیل احمد روڈ، بھنڈاری ڈیہہ، گریڈیہہ (جھارکھنڈ)

مئی 2012 کا 'اردو دنیا' باصرہ نواز ہوا۔ ہماری بات میں کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب نے بجا فرمایا ہے۔ آج کا دور اطلاعاتی عالم کاری کا دور ہے۔ اردو زبان اب دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی طرح چھاپے خانے کی حدوں سے باہر نکل کر ٹی وی اور انٹرنیٹ کی دنیا میں داخل ہوچکی ہے۔ اردو کے نئے سافٹ ویئر تیار ہورہے ہیں۔ خود اردو کونسل نے اردو سیکھنے کے عمل کو سہل بنانے والے سافٹ ویئر تیار کیے ہیں۔ اردو کے ساتھ لسانی تعصب کی شکایتوں کا زمانہ گزر چکا ہے۔ بڑی اچھی بات ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ریاست جھارکھنڈ کے سرکاری اسکولوں میں زیر تعلیم بچے آج بھی اردو درسی کتابوں سے محروم ہیں۔ 'اردو کونسل' کو اس افسوس ناک سانحہ کی طرف دھیان دینے کی اشد ضرورت ہے۔ خبرنامہ کے تحت اردو سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں دلچسپ اور معلوماتی ہوتی ہیں۔

ایم راگھو راؤ

ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا 480001 (مدھیہ پردیش)

'اردو دنیا' مئی 2012 کا شمارہ اپنی ساری خوبصورتیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ اس کے تمام مشمولات مفید، پرمعلومات اور دلچسپ ہیں۔ جیلانی بانو کا انٹرویو، ساجدہ زیدی سے متعلق تحریر، بانی اور حفیظ جونپوری کی شاعری پر مضمون اور دیگر نگارشات بے حد عمدہ ہیں۔ آزاد نظم کی شروعات میراجی نے کی۔ علامت نگاری کو فروغ دینے میں بھی میراجی پیش پیش رہے۔ سعادت حسن منٹو نے انتہائی کم وقت میں اردو ادب کو ایک بڑا سرمایہ دیا ہے۔ ان کی تمام نگارشات لاجواب ہیں، انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے جانی پہچانی دنیا میں ایک ایسی دنیا کو دریافت کیا جسے لوگ درخور اعتنا سمجھتے تھے۔

محمد توحید الحق

اسماعیل پورہ، کامٹی، ضلع ناگپور (مہاراشٹر)

'اردو دنیا' بابت اپریل 2012 میں شامل بیشتر مضامین قابل ستائش ہیں۔ خصوصاً زبیدہ حبیب کا مضمون 'اسکول میں اردو کی تدریس اور تعین قدر' اساتذہ کے لیے انتہائی مفید ہے۔ اردو میڈیم اسکولوں کا معیار عموماً اطمینان بخش نہیں ہوتا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تعلیمی نقائص کے سلسلے میں تشکیلی قدر پیمائی تیر بہدف علاج ہے اور یہ طلبہ کی کمزوریوں کے لیے اکسیر ثابت ہوگی۔

▪

نصرت ظہیر

اردو تنقید نے ادب کے عوامی رشتے پر توجہ نہیں دی: وسیم بریلوی

اردو مشاعروں کی ’ نصف صدی ‘ کا دوسرا نام ہے وسیم بریلوی۔ دنیا کا کون سا ایسا خطہ ،براعظم، ملک یا شہر ہوگا جہاں اردو والوں کی محفلیں جمتی ہوں اور وہاں کسی نہ کسی مشاعرے میں پروفیسر وسیم بریلوی کو شرکت کے لیے نہ بلایا گیا ہو۔ پچاس سال پہلے مشاعروں میں شرکت اور ان کے لیے دوردراز کے سفر اختیار کرنے کا جو سلسلہ شروع ہوا تھاوہ آج بھی جاری ہے ۔ لہٰذا اپنے سامعین سے کبھی وہ ازراہِ تفنن اگریہ بات کہہ دیتے ہیں کہ میاں آپ اپنی زندگی میںاتنا سوئے نہیں ہوں گے جتنا ہم اردو کی ان محفلوں کے لیے جاگے ہیں، تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوتا۔ اب تک انہوں نے کتنے مشاعرے پڑھے ہیں اس کا کوئی باضابطہ ریکارڈ ان کے پاس نہیں ہے ۔ ہوتا تو ان کا نام گنیز بک آف ریکارڈز میں اردو کے سب سے زیادہ مشاعرے پڑھنے والے شاعر کے طور پر درج ہوچکا ہوتا۔ اور شاعر بھی ایسے کہ مشاعروں میں ان کے لیے جو کریز پچاس برس پہلے تھی وہی آج بھی ہے ۔ ان کے سیکڑوں شعر زبان زد ہو چکے ہیں۔ یہ شعر چھوٹے بڑے سیاسی سماجی جلسوں سے لے کر لوک سبھا اور راجیہ سبھا تک گونجتے اور وزیراعظموں کی تقریروں میں بھی جگہ پاتے ہیں۔ان کا شعری اسلوب ، سیدھا سادا، دو ٹوک مگر جمالیاتی قدروں، مستحسن شعری روایات کے احترام ولحاظ ، گہری معنویت اورنرمی و گداز سے سجا سنورا ایک ایسا متوازن اسلوب اور لہجہ ہے جس نے ان پچاس برسوں میں عصری تقاضوں کے تحت فنی اور فکری سطحوں پر خود کو تھوڑا بہت بدلا ضرور ہے مگر اس کی کشش، حسن اور جاذبیت میں کہیں سے بھی کوئی کمی نہیں آئی ہے ۔ تحت اللفظ ہو یا ترنم، شعر پڑھنے کے ان کے انداز میں بھی ، متانت، شائستگی اور دل کشی پائی جاتی ہے ۔ مائک پر آکر وہ اپنے شعر کو جھنجوڑتے بھنبھوڑتے نہیں، نہ ہی کسی قسم کی اداکاری کرتے ہیں، بس اسے نرم اور دھیمے لہجے میں شائستگی سے سامعین کی نذر کر دیتے ہیں، جس کے بعد شعر اپنا کام خود کرتا ہے ۔

لیکن وسیم بریلوی صرف مشاعرے کے شاعر نہیں ہیں۔ ادب کے پارکھیوں نے ان کے فن کو سراہا ہے ۔ یونیورسٹیوں میں ان پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کا کام ہوا ہے ۔ہندی والے انہیں اپنے کوی سمیلنوں میں شوق وذوق سے مدعو کرتے ہیں۔ خود انہوں نے بھی غیر اردو داں مشاہیر کو اردو شاعری اور اس کے تہذیب سے جوڑا ہے ۔یوں رفتہ رفتہ ان کی شخصیت عوام و خواص میںاردو زبان اوراس کی شاعری کے فروغ کی ، ایک چلتی پھرتی تحریک کے روپ میں ڈھلتی گئی ہے ۔شائدیہی سب دیکھتے ہوئے فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر جناب کپل سبل نے انہیں فروغ اردو کے سب سے بڑے سرکاری ادارے قومی اردو کونسل کی سربراہی و ذمہ داری بطور وائس چیئرمین سونپی ہے ۔پیش خدمت ہیں ان کے پچاس سالہ ادبی ،شعری و ذہنی سفر اور مستقبل کے ارادوں کے تعلق سے کی گئی گفتگو کے اہم اقتباسات: (ادارہ)

نصرت ظہیر: شاعری کی طرف آپ کیسے مائل ہوئے؟

وسیم بریلوی: زندگی کا کوئی ایجنڈا تو تھا نہیں کہ شاعر بننا ہے۔کوئی لہر کوئی جذبہ شاید ایسا ہوتا ہے جو کسی فنِ لطیف کی طرف لے جاتا ہے۔ میں بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میرے والد شاہد حسن نسیم بھی شاعر تھے۔ کچھ اُن سے لاشعوری طور پر تحریک ملی۔ رامپور کے مرتضٰی اسکول میں جہاں میں پڑھتا تھا بیت بازی کے مقابلوں میں بڑا مزا آتا تھا اور میں نے بہت سے شعر یاد کر لیے تھے۔ اس کے علاوہ بیت بازی میں مشکل میں ڈالنے والے حروف ث، ط، ظ وغیرہ سے شروع ہونے یا ان پر ختم ہونے والے حروف اور اشعار کی تلاش میں بھی رہتا تھا۔ بس اس طرح طبیعت موزوں ہوتی گئی اور یوں سمجھ لیجیے کہ میں نے چھٹی جماعت سے ہی تک بندی شروع کر دی تھی۔ ان دنوں بہزاد لکھنوی کی غزل بڑی مشہور تھی۔ ہمیں تو شامِ غم میں کاٹنا ہے زندگی اپنی۔ اسی طرح پر ایک غزل کہہ ڈالی جس کا صرف ایک مصرعہ یاد ہے۔ عجب کچھ کشمکش میں پڑ گئی ہے زندگی اپنی۔ جگر مرادآبادی والد صاحب کے دوست تھے اور اکثر گھر آیا کرتے تھے۔ دراصل ہمارا تعلق مراد آباد ہی سے ہے۔ پروفیسر محمد حسن میرے چچا تھے۔ وہاں سے میرے والد بریلی منتقل ہو گئے تھے اور وہیں ننہال میں میری پیدائش ہوئی تھی۔ آج بھی میں اسی گھر میں رہتا ہوں۔ ہم لوگ زمیندار تھے، حالات اچھے تھے۔ لیکن ملک تقسیم ہوا تو بہت سی پریشانیوں نے گھیر لیا۔ ان حالات نے رام پور منتقل کرا دیا۔ خیر، تو جگر صاحب نے جب غزل سنی تو بہت خوش ہوئے لیکن پھر سمجھایا کہ میاں شاعری کے لیے عمر پڑی ہے۔ پہلے تعلیم

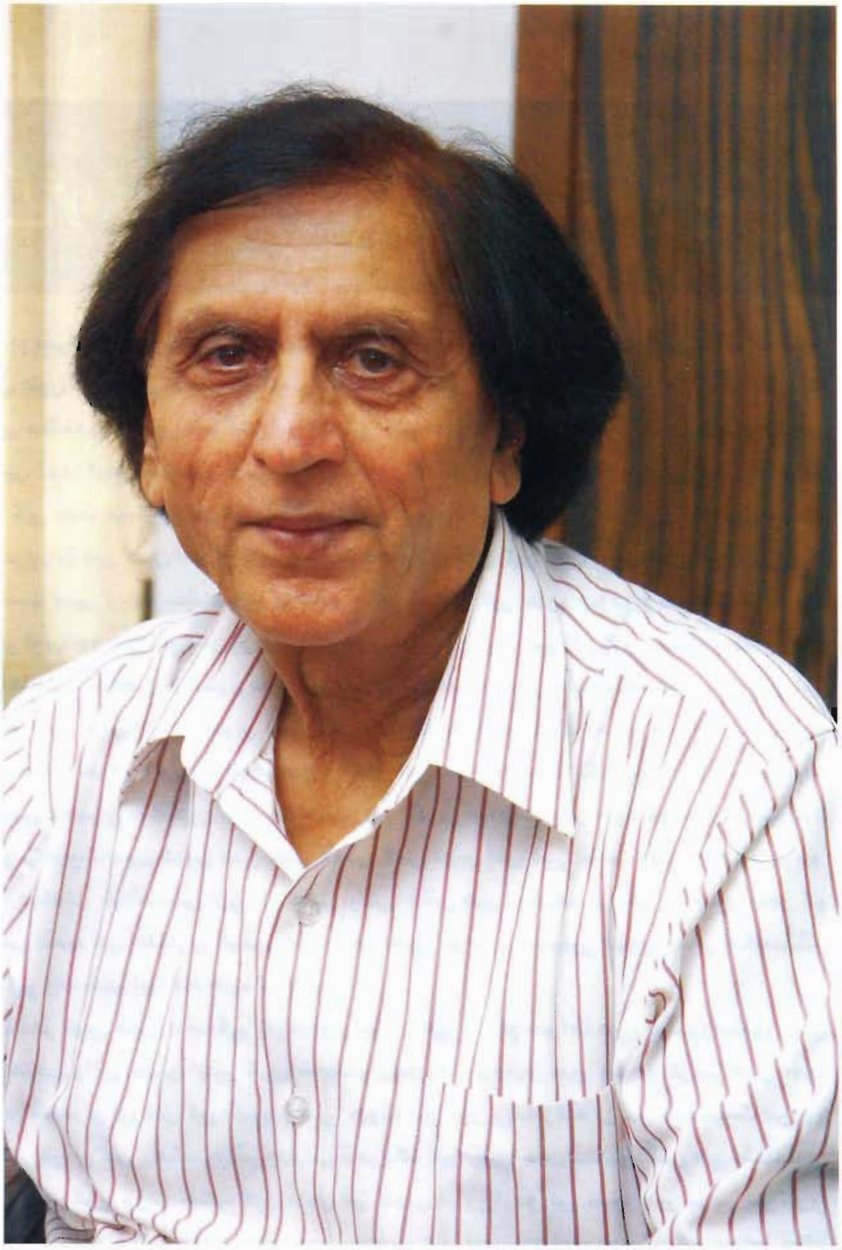

کی طرف توجہ دو۔ اس میں کمال حاصل کرو۔ پھر شاعری کی طرف آنا۔ میں نے یہی کیا۔ ان دنوں حالات اردو کے حق میں نہیں تھے لیکن مجھے اس زبان سے بہت محبت تھی۔ انگریزی شاعروں کو بھی خوب پڑھا کرتا تھا لیکن اصل عشق اردو سے تھا جو لگاتار بڑھتا گیا۔ بی اے میں میرے انگریزی میں کافی اچھے نمبر آئے تو میرے استاد نے مجھے انگریزی سے ایم اے کرنے کا مشورہ دیا۔ یہاں تک کہ گھر والوں کی بھی یہی رائے تھی لیکن میں نے انگریزی کی بجائے اردو میں ایم اے کیا۔ لوگ کہتے تھے انگریزی یا ہندی میں ایم اے کرو گے تو روزگار ملے گا۔ بہرکیف میں نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا اور سچ یہ ہے کہ اردو نے مجھے کبھی بے روزگار نہیں رہنے دیا۔ مجھے یاد ہے ایک موقع پر مرحوم قمر رئیس اور میں نے ساتھ ساتھ انٹرویو دیا تھا تو ناکام ہونے پر قمر رئیس بہت دل برداشتہ ہو گئے تھے اور وکالت کی طرف لوٹ جانے کی سوچنے لگے تھے، لیکن شکر ہے کہ کچھ عرصہ بعد انھیں دہلی یونیورسٹی کے ایوننگ کالج میں ملازمت مل گئی اور میں 1959 میں ہی دہلی یونیورسٹی کے ہندو کالج میں لکچر ہو گیا۔ اس سے پہلے ایم اے کے دوران شاعری شروع ہو چکی تھی اور شاعر جیسے رسائل میں شائع ہونے لگا تھا۔ دہلی میں گلزار دہلوی کی ادبی انجمن جو شعری نشستیں کراتی تھی۔ ان میں بیرسٹر نورالدین اور آنند نرائن ملا بھی شرکت کرتے تھے۔ ہر ماہ کے آخری اتوار کو مشاعرہ ہوتا تھا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، عرش ملسیانی، جوش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد وغیرہ سے ملنے کا موقع وہیں ملا۔ رفعت سروش، فرقت کاکوروی، نریش کمار شاد، سلام مچھلی شہری وغیرہ کی صحبتیں نصیب ہوئیں۔ بس اسی طرح کل ملا کر ہم بھی شاعر کہلانے لگے۔

ن ظ: عوامی مشاعروں میں آپ کیسے آئے؟ سب سے پہلا مشاعرہ کب اور کہاں پڑھا؟

وسیم بریلوی: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹس یونین سالانہ مشاعرے کراتی تھی۔ اب بھی کراتی ہے۔ مجھے 1961 میں اس کے مشاعرے کے لیے بلایا گیا۔ رفعت سروش مرحوم کو جب یہ معلوم ہوا تو کہنے لگے میاں کہاں مذبح میں جا رہے ہو۔ یہ لوگ کسی شاعر کو ٹکنے نہیں دیتے۔ مشاعرے کو تو یہ ہوٹنگ فیسٹول کہتے ہیں۔ لیکن سلام مچھلی شہری، دلاور فگار، نشور واحدی، شمیم کرہانی، فرقت کاکوروی اور مشیر جھنجھانوی جیسے لوگ بھی مدعو تھے تو کچھ ہمت بڑھی اور میں مشاعرے میں چلا گیا۔ بصیر احمد خاں جو بعد میں مسلم لیگ میں چلے گئے تھے اور پھر جامعہ ہمدرد اور اگنو میں اہم عہدوں پر فائز ہوئے، مشاعرے کی نظامت کر رہے تھے۔ پہلے دور میں سوائے دلاور فگار کے کسی شاعر کو جمنے نہیں دیا گیا۔ میں بہت دل برداشتہ ہوا اور اسٹیج پر نہیں گیا۔ دوسرے دور میں بصیر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ پڑھنا چاہیں گے؟ میں نے کہہ دیا جو آپ کی مرضی۔ انھوں نے مجھے بلا لیا۔ مائک پر آتے ہی میں نے کہا کہ سامعین صرف دو باتیں کہنی ہیں۔ ایک خوش خبری ہے اور دوسری گزارش۔ لڑکوں نے کہا، دونوں کہہ دیجیے۔ میں نے کہا، خوش خبری تو یہ ہے کہ میں صرف دو شعر پڑھوں گا اور گزارش یہ کہ دونوں شعر خاموشی سے سن لیجیے۔ اس کے بعد میں نے ایک قطعہ پڑھا اور واپس چل دیا۔ سامعین نے شور مچا دیا۔ بھئی یہ ہیرا کہاں چھپا رکھا تھا۔ واپس لاؤ اسے۔ مجھے پھر بلایا گیا اور چار غزلیں مسلسل سنی گئیں۔ ان دنوں کہتے تھے کہ جس نے علی گڑھ اسٹوڈنٹس یونین کا مشاعرہ کامیابی سے پڑھ لیا وہ کسی مشاعرے میں ناکام نہیں ہو سکتا۔ یہ تھا میرا پہلا مشاعرہ۔ تب سے آج تک علی گڑھ میں کوئی مشاعرہ اس یونین کا ایسا نہیں ہوا جس میں مجھے بلایا نہ گیا ہو۔ اس طرح ہم مشاعروں میں آ گئے۔

ن ظ: مشاعروں کے ماحول اور روایات کے بارے میں کچھ بتائیے کہ اس دوران مشاعرہ کس حد تک تبدیل ہوا ہے؟

وسیم بریلوی: میں جب مشاعروں میں آیا تھا تب

وہ گھرانے موجود تھے جو اردو تہذیب کے ساتھ پلے بڑھے تھے۔ میں اردو کو صرف ایک زبان نہیں مانتا۔ وہ ایک مکمل تہذیب ہے۔ اردو صرف باتیں کرنا نہیں سکھاتی، آپ کی زندگی اور سوچنے کے ڈھنگ کو بھی سنوارتی ہے۔ اس کی پرورش صوفی سنتوں کی گود میں ہوئی ہے۔ امیر خسرو اور سنت کبیر نے انگلی پکڑ کر اسے چلنا سکھایا ہے۔ چنانچہ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ عوامی مشاعروں میں بھی مشترکہ تہذیب اور اخلاقی و روحانی قدروں کے احترام کی جھلک آپ کو نہ ملے۔ تھوڑی بہت ہوٹنگ مشاعروں میں پہلے بھی ہوتی تھی آج بھی ہوتی ہے کیونکہ مشاعرہ بہرحال عوامی ہوتا ہے۔ مائک کے سامنے کھڑا ہوا شاعر ہمہ وقت عوامی پسند نا پسند کی دھار پر رہتا ہے۔

ایک اچھی تبدیلی مشاعروں میں یہ آئی ہے کہ پہلے اس میں زیادہ تر مسلمان حصہ لیتے تھے آج شعرا اور سامعین دونوں میں دیگر مذاہب کے لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اردو زبان اور مشاعروں کا سیکولر مزاج ایک بار پھر مختلف مذاہب ومسالک کے لوگوں کو جوڑنے لگا ہے۔

اور بات صرف ڈی سی ایم کے مشاعروں اور کامنا پرساد کے 'جشن بہار' جیسے مشاعرے تک محدود نہیں ہے۔ اردو کی ترویج کے دوسرے شعبوں میں نہ صرف دوسرے مذاہب کے لوگ بلکہ غیر اردو داں لوگ بھی اب آگے آرہے ہیں۔ بلکہ میں تو مانتا ہوں کہ پچھلے پچاس ساٹھ برسوں میں اردو زبان مشاعروں، اخباروں، ٹی وی چینلز وغیرہ کی شکل میں غیر اردو داں لوگوں کے خرچ پر زندہ رہی ہے۔

اردو کا سب سے پہلا ٹی وی چینل 'ای ٹی وی اردو' شروع کرنے والے ڈاکٹر راموجی راؤ ہوں یا ملک کے طول وعرض میں گیارہ شہروں سے اردو اخبار (روزنامہ راشٹریہ سہارا) ایک ساتھ چھاپنے کا کارنامہ انجام دینے والے سبرت رائے سہارا ہوں، مشہور روزنامہ 'انقلاب' کو خرید کر اسے کامیابی کے ساتھ شمالی ہند میں پھیلانے والے 'جاگرن' گروپ کے مالک ہوں یا اردو زبان کی ترویج اور اس کی شاعری کو پھیلانے کے حق میں مسلسل پرزور آواز اٹھاتے رہنے والے جسٹس مارکنڈے کاٹجو ہوں — یہ سبھی اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ اس کے باوجود ان کی کوششوں سے اردو کا حال اور مستقبل دونوں روشن ہوئے ہیں جس کا ہم سبھی اردو والوں کو کھل کر اعتراف کرنا چاہیے۔

ن ظ: آپ کے خیال میں مشاعروں کا اردو زبان کے فروغ میں کتنا ہاتھ ہے؟

وسیم بریلوی: آپ فروغ کی بات کر رہے ہیں؟ صاحب، اردو کو تقسیم وطن کے بعد ہندوستان میں زندہ ہی مشاعروں نے رکھا ہے۔ میں ادب کے معیار کی بات نہیں کرتا۔ اس پر مختلف آرا ہو سکتی ہیں۔ یہ اردو زبان کی خوش نصیبی ہے کہ یہ دنیا کی شاید واحد زبان ہے جس میں عوام سے شعر و ادب کا سیدھا تعلق قائم کرنے والا ایک انسٹی ٹیوٹ مشاعرے کی شکل میں موجود ہے اور جسے جوش و جگر جیسے اکابرین ادب نے بیسویں صدی میں نوابوں اور جاگیرداروں کی ذاتی محفلوں سے باہر لا کر ایک عوامی رابطہ گاہ کی شکل دی تھی۔ ان عوامی مشاعروں نے ہی اردو کے محاورے کو زندہ رکھا۔ ہر ذہنی سطح کے اردو والوں کو بلکہ اردو نہ جاننے والوں کو بھی اس خوب صورت زبان سے جوڑے رکھا۔ تقسیم کے بعد کا دور اردو زبان کے لیے اس کی تاریخ کا بدترین دور تھا۔ اس اندھیرے میں مشاعروں کی ہی شمع تھی جو امید کی روشنی بن کر ہمارے ساتھ رہی۔ مشاعروں نے ہندی والوں کو بھی کوی سمیلنوں کا راستہ دکھایا۔ اور پھر یہ کوی سمیلن بھی اردو کے مشاعروں سے متاثر ہونے لگے۔ آج کی صورت حال یہ ہے کہ اردو کے جو شاعر ادب میں یا مشاعروں میں سب سے زیادہ پڑھے اور سنے جاتے ہیں، انھیں کوی سمیلنوں میں بھی بلایا جاتا ہے اور مشاعروں میں غیر اردو داں اور غیر مسلم شعرا کی تعداد بڑھنے لگی ہے اس طرح مشاعروں نے قومی آہنگی کی سطح پر بھی اپنی افادیت کو منوایا ہے جس کی بدولت آج اردو کے خلاف تعصب کا وہ ماحول سماجی اور سیاسی سطح پر تقریباً ختم ہو چکا ہے جو اب سے چالیس پچاس سال پہلے تھا۔ اب آپ پوچھیں گے، مشاعروں سے اردو ادب کو کیا ملا؟

ن ظ: بالکل، یہ ایک فطری سوال ہے۔

وسیم بریلوی: اس سوال کا ایک جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ آپ ادب کی بات کر رہے ہیں، مشاعروں نے زبان کو بچا لیا یہ ہی کیا کم ہے۔ لیکن بات صرف اتنی نہیں۔ مشاعروں نے کم از کم شاعری کی حد تک ضرور یہ سکھایا ہے کہ آپ عوام کی ذہنی سطح کو بہتر ادب کی سطح تک کس طرح اوپر اٹھا سکتے ہیں۔ ترسیل اور پر اثر ترسیل، مشاعرے میں شاعر کی سب سے بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر وہ مشاعرے میں ٹک نہیں سکتا۔ چنانچہ وہ ایسا شعر کہتا ہے جو فوراً عوام کی ذہنی سطح تک پہنچے یا عوام کی ذہنی سطح تھوڑا سا زور لگا کر شعر کے مافی الضمیر تک پہنچ جائے۔ مجموعی طور پر ہمارے ہاں مشاعرہ دو سطحوں پر کام کر رہا ہے۔ جو لوگ صرف تفریح کے لیے آتے ہیں ان کا بھی احاطہ کرتا ہے اور جو لوگ ادب سے جڑے ہوئے ہیں شاعری کا ذوق رکھتے ہیں وہ بھی مطمئن ہو جاتے ہیں کہ چلو تین چار اچھے شاعروں کو سن لیا۔

اردو شاعری کی ایک خاص بات جو اسے دنیا کی باقی زبانوں کی شاعری سے الگ کرتی ہے یہ ہے کہ وہ صرف ادب کی کتابوں میں پڑھی یا لکھی نہیں جاتی بلکہ سنی بھی جاتی ہے۔ اردو شاعری اور مشاعرہ زبان کو عوام سے جوڑنے کا وسیلہ ہیں۔ شعر کے ردّ عمل سے جو واہ نکلتی ہے ، اس واہ سے جو سلسلہ قائم ہوتا ہے ، جو مجموعی فضا بنتی ہے اس کا نام مشاعرہ ہے۔ ایسا طاقت ور ادارہ دنیا کی کسی اور زبان کو حاصل نہیں ہے ، اردو والوں کو اس کا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

یہاں میں ایک بات اور کہوں گا کہ آج کے تفریحی سماج میں اردو کا ہی نہیں باقی زبانوں کا ادب بھی پسِ پشت چلا گیا ہے۔ ٹی وی چینلوں کی باڑھ آئی ہوئی ہے، جن میں مذہب سے لے کر سیاست تک اور سائنس سے لے کر تعلیم تک ہر موضوع کی کوئی نہ کوئی چینل موجود ہے، لیکن ادب کی ایک بھی چینل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ملی جلی چینلز پر بھی اب ادب کا کوئی پروگرام نشر نہیں ہوتا، سوائے دوردرشن کی یا اردو کی چند چینلز کے۔ اس ماحول میں مشاعرہ واحد انسٹی ٹیوشن ہے جو لوگوں میں تھوڑا بہت ادبی ذوق قائم رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اردو ٹی وی چینل بھی انھیں خصوصی توجہ کے ساتھ نشر کرتے ہیں۔

ن ظ: پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ ادب میں مشاعروں کی مقبول ترین شاعری کو کچھ خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔

وسیم بریلوی: یہ ناقدین ادب کی ایک نفسیاتی بیماری ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ ادبی تنقید، عوامی مقبولیت کو کبھی قبول نہیں کرتی۔ اس کے پیچھے کوئی حسد کا جذبہ کارفرما ہے یا احساس کم تری کا ہاتھ ہے یہ خدا بہتر جانتا ہے۔ خود نقاد کو بھی وہ عوامی مقبولیت کبھی حاصل نہیں ہوتی جو مشاعرے کے ایک چھوٹے سے شاعر کو مل جاتی ہے۔ نقاد اگر ایماندار ہے اور منطق سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو اسے سوچنا چاہیے کہ شہرت اور مقبولیت بازار میں فروخت نہیں ہوتی۔ یہ اللہ کی دین

ہے اور اس کی مخالفت کرنا دراصل ایک خدائی عمل کی مخالفت کرنا ہے۔ مقبولیت کی اپنی لاجک ہوتی ہے۔ شاعر کی اپنی شخصیت، فنی معیار، ترسیل کی قوت، عام زندگی کے مسئلوں کو متاثر کن انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت، یہ سب چیزیں موجود ہوں تب جاکر مشاعرے میں کسی شاعر کو یا اس کے فن کو مقبولیت ملتی ہے۔ بلکہ آپ مشاعروں کی بات چھوڑ دیجیے۔ میں تو کہتا ہوں کہ کسی بھی طرح کی عوامی مقبولیت سے تنقید کا ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔ ساحر لدھیانوی اتنے بڑے شاعر تھے۔ اردو کا عام قاری آج اتنے برس بعد بھی ان کی نظموں کو بھولا نہیں ہے۔ لیکن ہماری تنقید خاموش ہے۔ چنانچہ عام قاری بھی تنقید کی پروا نہیں کرتا۔ ہندی میں بھی یہی رویہ ہے۔ گوپال داس نیرج ہندی کے سب سے مقبول شاعر ہیں۔ مگر ہندی کا نقاد انھیں لائق توجہ نہیں سمجھتا۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے نظرانداز کرنے سے نیرج کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئے گی اور نہ ہی ان کی شاعری کا وزن کم ہوگا، مگر چونکہ وہ خود مقبولیت کی لذت سے محروم رہا ہے اس لیے ان کی مقبول شاعری کو خود ساختہ ادبی پیمانوں کے تحت کم تر قرار دیتا رہے گا۔ میں یہ نہیں مانتا کہ خود کو نقاد سمجھنے والے چند لوگ مل کر یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون ادب میں بڑا ہے اور کون کم تر۔

ادب اور ادیب کے بڑے ہونے کا فیصلہ اس کی عام قبولیت سے ہوتاہے۔ غالب اس لیے بڑا شاعر نہیں ہے کہ کچھ عالموں نے اس کے اشعار کی شرحیں اور تنقیدی مضامین لکھ کر اسے بڑا بنایاہے۔ وہ بڑا شاعر اس لیے ہے کہ عوامی ذہن اس کے شعر کو قبول کرتا ہے۔اسی طرح میر، کبیر اور نظیر کی شاعری نے کسی نقاد کی بدولت ادب عالیہ میں جگہ نہیں پائی ہے۔ یہ عوامی قبولیت ہے جس نے انہیں عظمت کے تاج پہنائے ہیں۔میر کو آج خدائے سخن یوں ہی نہیں کہا جاتا۔ غالب اور ذوق نے بھی اس کی شاعری کو سلام کیا تھا۔

اُسی میر کا اپنی شاعری کے بارے میں یہ کہنا تھا کہ:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

عوام اور عوامی قبولیت کو اہمیت دینے کے سلسلے میں میر کا یہ شعر قولِ فیصل کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمارے آج کے محترم نقاد اس ادبی حقیقت کا زیادہ بہتر طور پر تجزیہ کر سکتے ہیں کہ آخر کیا وجہ کہ گزشتہ پچاس برسوں میں اردو کے جتنے بھی اشعار فضاؤں میں گردش کر رہے ہیں وہ سب مشاعروں کے اسٹیج سے آئے ہیں۔ چاہے وہ فراق کا شعر ہو کہ: بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں/ تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں، یا فیض کا: وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں/ وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے، یا جگر کے درجنوں اشعار، اور نشور واحدی کا وہ شعر کہ: دیا خاموش ہے لیکن کسی کا دل تو جلتا ہے/ چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے۔ یہ سبھی شعر اسٹیج سے اتر کر ہمارے ماحول کا حصہ بنے ہیں۔ اب رہ گئی مشاعروں میں ہونے والی شاعری کے معیار کی بات، تو جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، تقسیم وطن کے بعد ہندوستان میں اردو محاورے، اور استعارے کو مشاعروں نے زندہ رکھا ہے، اردو تنقید نے نہیں۔ مشاعروں سے اردو کو عوامی سرپرستی ملی ورنہ ظلمت پرست طاقتیں تو اس زبان کو کھا گئی ہوتیں۔ اور پھر جناب، مشاعرے کسی ناقد کا ڈرائینگ روم نہیں ہوتے جہاں آپ خاموشی سے کسی کے ادبی قد کا فیصلہ کرلیں گے۔ مشاعرے عوام کے بیچ کھلی ہواؤں میں ہوتے ہیں۔ یہاں جو ہوتا ہے ڈنکے کی چوٹ پر اور پوری ٹرانسپیرینسی کے ساتھ ہوتا ہے۔ مشاعرے کسی غیر مستحق کو، یا کمزور شعر اور شاعر کو بڑا نہیں بنا سکتے۔ محشر بدایونی کا یہ شعر یہاں پوری طرح صادق آتا ہے:

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا

ن ظ: آپ کی باتوں سے لگتا ہے کہ آپ ادب میں تنقید کی اہمیت کے زیادہ قائل نہیں ہیں۔

وسیم بریلوی: یہ خیال غلط ہے۔ ادب میں تنقید بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کسی بھی تخلیق کار کے فکری و فنی رجحان، تخلیق کی مجموعی افادیت اور اس کی درجہ بندی و معیار کا تجزیہ تنقیدی عمل سے گزرے بغیر نہیں ہوسکتا۔ ہمارے نقادوں نے اس سلسلے میں بہت کام کیا ہے اور ان کے ادبی کردار کو کسی بھی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ میری شکایت صرف اتنی ہے کہ اردو تنقید کو جتنی توجہ ادب اور عوام کے رشتے کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی طرف دینی چاہیے تھی اتنی اس نے نہیں دی ہے۔

ن ظ: گزشتہ برس آپ کو اردو کی ترویج و اشاعت کے سب سے بڑے سرکاری ادارے قومی اردو کونسل کا وائس چیئرمین مقرر کیا گیا تھا۔ مشاعروں میں آج بھی آپ کی زبردست ڈیمانڈ رہتی ہے۔ اس عدیم الفرصتی کے دباؤ میں آپ یہ نئی ذمے داری کس طرح سنبھال رہے ہیں۔

وسیم بریلوی: یہ سوال مجھ سے تب بھی ہوا تھا جب مجھے بریلی کالج میں شعبہ اردو کا سربراہ بنایا گیا تھا۔ میرے اس وقت کے طالب علموں سے پوچھ لیجیے کہ کیا میں نے انھیں کسی بھی طرح سے مایوس کیا۔ مصروف تو جناب میں روز اول سے ہوں اور جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے یہ بڑھتی ہی جارہی ہے۔ آج میری مصروفیات ریٹائر منٹ کے وقت سے تین گنا بڑھ چکی ہیں۔ مگر میں اپنی تمام ذمہ داریوں کو نبھا رہا ہوں۔ دراصل یہ سب اس بات پر منحصر ہے کہ آپ وقت کا کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ آج کے دور میں ٹائم منیجمنٹ کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ ہنر اگر آپ کو آتا ہو تو مصروفیتیں آپ کو پریشان نہیں کر سکتیں۔ خوش قسمتی سے مجھے یہ فن تھوڑا بہت آتا ہے۔ آپ خود قومی اردو کونسل میں موجود ہیں تو خود سے ہی پوچھ لیجیے کہ میں کم وقت میں یہاں کتنا کام کر لیتا ہوں، اور کتنا وقت دیتا ہوں۔

ن ظ: کم از کم مجھ سے تو زیادہ ہی دیتے ہیں۔ خیر، یہ بتائیے کہ اردو کونسل کی اب تک کی کارکردگی کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں اور مستقبل میں آپ اسے کس طرف لے جانا چاہیں گے۔

وسیم بریلوی: اس میں کوئی شک نہیں کہ گزشتہ آٹھ دس برس میں قومی اردو کونسل کو ایک زبردست پہچان ملی ہے۔ اس کی کارکردگی کا دائرہ وسیع ہوا ہے۔ جو لوگ اس سے اب تک کسی بھی حیثیت میں جڑے رہے ہیں ہمیں ان سب کا احسان مند ہونا چاہیے کہ انھوں نے کونسل کو موجودہ مقام تک پہنچایا۔ اردو تعلیم و تدریس، اردو میں کمپیوٹر کی تعلیم، اردو ادب کی ترویج و اشاعت، صحافت کے فروغ، نصابی اور غیر نصابی کتابوں کی اشاعت، اشاعتی کاموں میں ادیبوں اور قلم کاروں کی مالی معاونت وغیرہ کے لحاظ سے یہ آج ہندوستان اور پاکستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں مقتدرہ کی شکل کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ ابھی چند روز پہلے آپ نے دیکھا، قومی اردو کونسل نے پوری دنیا کے لیے اردو کی تین نئی کھڑکیاں کھولی ہیں۔ آن لائن اردو لرننگ پروگرام، کمپیوٹر لرننگ پروگرام اور اردو کی ڈیجیٹل کتابوں کی لائبریری، اردو کے تین نئے رابطے ہیں جن سے انٹرنیٹ پر جڑ کر آپ اردو کو دنیا میں کہیں بھی رہ کر سیکھ اور پڑھ سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ قومی اردو کونسل کے اندر اور باہر جتنے بھی اردو والے ہیں وہ سب مل کر، اپنی ذاتی ترجیحات کو ایک طرف رکھ کر اردو کی ترویج کے کام کو ایک مشن کی طرح آگے

بڑھائیں۔ میری خاص کوشش یہی رہی ہے اور رہے گی اردو زبان کی علمی و ادبی روایات کو بھی بھرپور انداز میں پروجیکٹ کیا جائے اور اسے نئی ٹیکنالوجی، نئی ضرورتوں اور نئے تقاضوں سے بھی جوڑا جائے۔ **ہمارے مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل نے ، اردو کو تیزی سے فروغ پانے والی انٹرٹینمنٹ انڈسٹری سے جوڑنے کا جو مشورہ حال ہی میں دیا ہے وہ بے حد مفید اور اس سے اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے میں بڑی مدد ملے گی چنانچہ ہم اس سمت میں بھی قومی اردو کونسل کو آگے لے جانا چاہتے ہیں۔** ایک اور اہم مسئلہ شمالی ہندوستان میں اردو زبان کے پچھڑ جانے کا ہے۔ اگر ہم کسی طرح اردو رسم الخط کو اس خطے میں بحال کر دیں تو یہ اردو کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ ہم نے اتر پردیش میں ایک سال میں ایک لاکھ لوگوں کو اردو سکھانے کی تجویز رکھی ہے جسے کپل سبل صاحب کی حمایت حاصل ہے اور جلد ہی اس پر عمل شروع ہو جائے گا۔ دیکھیے اردو کا مسئلہ اور زبانوں سے خاصا مختلف ہے۔ ہمیں زندہ حقیقتوں کو سامنے رکھ کر آگے بڑھنا ہوگا۔ یہاں میں اردو زبان سے وابستہ سبھی لوگوں سے اپیل کروں گا کہ وہ زبان و ادب کی ترویج میں اپنے کردار کی اہمیت کو سمجھیں۔ دیگر زبانوں کی طرح اردو کی ترقی کا کام بھی کئی سطحوں پر ہو رہا ہے اور ہونا چاہیے۔ میں اگر مشاعروں کو اہم سمجھتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اسی طرف لگ جائیں۔ زبان اصل ترقی تب کرے گی جب آپ شاعر ہوں تو اچھی اور بہتر سے بہتر شاعری کریں۔ افسانہ لکھتے ہیں تو سب سے اچھے افسانے لکھنے کی کوشش کریں۔ ناول نگاری آپ کا کام ہے تو اور بھی بہتر ناول لکھنے میں جٹ جائیں۔ تعلیم و تدریس میں دل چسپی ہو تو سب سے اچھا معلم بننے کی طرف توجہ دیں۔ ایک دوسرے سے مقابلہ آرائی ہو مگر ٹکراؤ نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے آپ ذاتی طور پر بھی فائدے میں رہیں گے اور زبان بھی ترقی کرے گی۔

ن ظ: اس گفتگو میں اگر آپ سے کچھ شعر سنانے کی فرمائش نہ کی جائے تو یہ ایک غیر فطری سی بات ہوگی۔ کیا قائین کے لیے یہ زحمت گوارہ کریں گے؟

وسیم بریلوی: کچھ متفرق اشعار سنیے جو خاصے مقبول ہوئے ہیں:

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

وہ جھوٹ بول رہا تھا بڑے سلیقے سے
میں اعتبار نہ کرتا تو اور کیا کرتا

غریب لہروں پہ پہرے بٹھائے جاتے ہیں
سمندروں کی تلاشی کوئی نہیں لیتا

جو مجھ میں تجھ میں چلا آرہا ہے برسوں سے
کہیں حیات اُسی فاصلے کا نام نہ ہو

میں اُس سے نظریں ملاتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
کہ آنکھوں آنکھوں میں وہ ذہن پڑھنے لگتا ہے

تجھے پانے کی کوشش میں کچھ اتنا کھو چکا ہوں میں
کہ تو مل بھی اگر جائے تو اب ملنے کا غم ہوگا

کیا بتاؤں کیسا خود کو دربدر میں نے کیا
عمر بھر کس کس کے حصے کا سفر میں نے کیا

ہر شخص دوڑتا ہے یہاں بھیڑ کی طرف
پھر یہ بھی چاہتا ہے اُسے راستہ ملے

اس دورِ منصفی میں ضروری نہیں وسیم
جس شخص کی خطا ہو اسی کو سزا ملے

اصولوں پر جہاں آنچ آئے ٹکرانا ضروری ہے
جو زندہ ہو تو پھر زندہ نظر آنا ضروری ہے

تھکے ہارے پرندے جب بسیرے کے لیے لوٹیں
سلیقہ مند شاخوں کا لچک جانا ضروری ہے

اُس نے کیا لاج رکھی ہے مری گمراہی کی
کہ میں بھٹکوں تو بھٹک کر بھی اُسی تک پہنچوں

جو سب پہ بوجھ تھا اک شام جب نہیں لوٹا
اُسی پرندے کا شاخوں کو انتظار رہا

ن ظ: بہت خوب۔ یہ فیصلہ مشکل ہے کہ کس شعر کو کس پر فوقیت دی جائے۔ اب آخری سوال۔ اس عمر میں بھی ماشا اللہ آپ کی صحت قابل رشک ہے اور شخصیت میں وہی چمک اور دل کشی اب تک باقی ہے جو پچاس برس پہلے تھی۔ اس کا کوئی خاص راز ہے؟

وسیم بریلوی: صرف ایک راز ہے۔ مثبت رویّہ۔ زندگی کے ہر مرحلے پر میرا رویّہ مثبت رہا ہے۔ مشاعروں اور ادب کی دنیا میں رقابتیں، سازشیں اور گروہ بندیاں چلتی رہتی ہیں مگر میں کبھی ان میں شریک نہیں رہا۔ میں منفیت کا قائل نہیں ہوں۔ منفیت آپ کی روح کو ہی نہیں جسمانی وجود کو بھی بدشکل بنا دیتی ہے۔ یہ مثبت رویّہ ہی ہے جو آپ کی پیدائشی معصومیت کو برقرار رکھتا ہے!

□

وسیم بریلوی

اصل نام: زاہد حسن

پیدائش: 8 فروری 1940 بریلی، اتر پردیش

تعلیم: ایم اے (اردو فرسٹ ڈویژن، فرسٹ پوزیشن آگرہ یونیورسٹی، آگرہ)

ملازمت:

لیکچرار شعبۂ اردو بریلی کالج بریلی 1962 تا 1980

صدر شعبۂ اردو 1980 تا 2000

ڈین شعبۂ آرٹ روہیل کھنڈ یونیورسٹی 1998 تا 2000

مجموعہ ہائے کلام: تبسم غم، آنسو میرے دامن تیرا (ہندی)، مزاج، آنکھ آنسو ہوئی، میرا کیا (ہندی)، آنکھوں آنکھوں رہے، موسم اندر باہر کے

ایوارڈ:

میر تقی میر اکادمی لکھنؤ کا 'امتیاز میر' ایوارڈ

ہندی اردو سنگم لکھنؤ کا 'غزل' ایوارڈ

کلا اسمرتی لدھیانہ کا 'اعلیٰ تخلیقی' ایوارڈ

کل ہند ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ' لکھنؤ

انجمن امروہہ کراچی پاکستان کا خصوصی 'غزل' ایوارڈ

ایلیٹ کالج کراچی پاکستان کا 'غزل' ایوارڈ

دی عثمانینس شکاگو امریکہ کا 'نسیم اردو' ایوارڈ، کاونسلیٹ جنرل آف انڈیا جدہ (سعودی عرب) کے ذریعے اعزاز 1997

2005 ہندی ساہتیہ سمیلن پریاگ کے ذریعے 'ساہتیہ سارسوت' اعزاز

گہوارۂ ادب یو ایس اے کے ذریعے 'ادبی اعزاز'

ہیوسٹن سٹی کاونسل ٹیکساس امریکہ کے ذریعے 'اعزاز آنریری سٹیزن شپ اور گڈول ایمبیسڈر' 2007 میں

'فراق انٹرنیشنل' ایوارڈ 2008،

سردار جعفری لٹریری ایوارڈ ٹیکساس امریکہ 2009

دیگر اعزازات: وسیم بریلوی کے فن اور شخصیت پر تحقیق کر کے ڈاکٹر جاوید نسیمی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ان کے فن اور شخصیت پر لکھے گئے جیسے معتبر ادبی رسالے نے خصوصی نمبر شائع کیا جس میں فراق گورکھپوری، ڈاکٹر محمد حسن، شمیم کرہانی، نشور واحدی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر عبد المغنی، محشر بدایونی، ڈاکٹر سحر انصاری، پروفیسر آفاق احمد صدیقی، ڈاکٹر تنویر علوی، رفعت سروش، عشرت ظفر جیسے ہندو پاک کے مشہور قلم کاروں نے ان کی شاعرانہ انفرادیت کو تسلیم کیا۔

خواجہ محمد اکرام الدین

اردو کے در پر سائبر انقلاب کی دستک!

آن لائن میڈیا کا تصور اور اردو

گذشتہ دو دھائیوں میں زمانے کی ترقی کی رفتار کو دیکھیں اور اِس رفتار کی سُرعت کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ اِس کی رفتار نے صدیوں کی رفتار کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ھے۔ عرصۂ دراز سے انکشافات اور ایجادات کا سلسلہ جاری ھے لیکن ماضی کی دودھائیوں میں آج کے انسان نے جو کرشمے کر دکھائے ھیں وہ حیرت واستعجاب کا باعث ھیں۔ سلیمان کی انگوٹھی اورعلاء الدین کے چراغ جیسے حیرت انگیز کرشمے آج کے کمپیوٹر میں موجود ھیں۔ ذخائر کو چھوٹی سی جگہ میں سمیٹ لینے والی عمرو عیار کی زنبیل جیسی صلاحیت کمپیوٹر کے ھارڈ ڈسک، سی ڈی، ڈی وی ڈی اور پین ڈرائیومیں موجود ھیں۔ ابھی کچھ ھی دنوں کی بات ھے کہ ھم 90 کی دھائی کو معلومات کے انقلاب کی دھائی کھتے تھے، زیادہ دن نھیں گزرے کہ اس ترقی نے دنیاکے حجم کو سمیٹ لیا اور ھم نے اسے گلوبل ویلج کھنا شروع کیااور اس عھد کو الیکٹرونک عھد سے موسوم کرنے لگے، پھر جلد ھی اسے ڈیجیٹل عھد کھا جانے لگا اور اب اسے سائبر ایج سے بھی موسوم کرنے لگے ھیں۔ ترقی کی اس رفتارکو کس نام سے موسوم کریں یہ بھی اب شاید نئے لفظ کا متلاشی ھے کیونکہ آج کی ٹکنالوجی نے روشنی اور ھوا کی رفتار کو بھی پیچھے چھوڑنے کا عزم کر لیا ھے۔ آج کے عھد کی ترقی کا یہ عالم ھے ھردن ایک نئے تجربے اورایجاد کادن ھوتا ھے۔

الیکٹرونک میڈیا میں ایک بڑا میڈیم کمپیوٹراور انٹرنیٹ ہے۔ یہ ایسا میڈیم ہے جوگلوبل ویلج کے تصور کو بدل کر اسکرین کی شکل میں پیش کر رہا ہے۔ اسی طرح موبائل بالخصوص آئی فون اور ایبزائیڈ کی سروسز دنیا کو گاؤں سے ہتھیلوں میں سمیٹنے لگی ہے۔ اسی طرح کمپیوٹر میں استعمال ہونے والی اضافی چیزیں بھی بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔ ایک چھوٹے سے پین ڈرائیو یا ہارڈ ڈسک میں آپ چاہیں تو ہزاروں کتابیں رکھ لیں اور چاہیں تو تفریحی فلمیں محفوظ کر لیں۔ یہ آپ کے ذوق پر منحصر ہے کہ کس طرح کے ڈیجیٹل مواد کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں، ترقی کی یہ صورت اور یہ ایجاد عجوبۂ روزگار سے کم نہیں ہے۔

انٹرنیٹ آج کے دور کی ایک عظیم، حیرت انگیز، مفید اور کار آمد ایجاد ہے، جس نے اگر ایک طرف فاصلوں کو کم کر دیا ہے تو دوسری طرف معلومات کا انبار لگا دیا ہے۔ گھر بیٹھے آسانی سے دنیا بھر کی جو من چاہی معلومات آپ کو حاصل کرنی ہے وہ سب یہاں ممکن ہے۔ ایسی معلومات بھی جس کے حصول کے لیے کئی خطوں اور ملکوں کا سفر کرنا پڑتا تھا، لیکن آج کا انسان اس معنی میں

خوش نصیب ہے کہ اسے یہ سب چیزیں آسانی سے مل جارہی ہیں۔ دنیا بھر کی ڈیجیٹل لائبریریز، انسائیکلوپیڈیا، اخبارات و رسائل، ویب سائٹس، بلاگز اور کتب سب کچھ یہاں موجود ہیں۔ بلکہ اس سے بھی آسان ترصورت یہ نکل کر سامنے آئی ہے کہ بہت سی چیزیں آن لائن موجود ہیں۔ آن لائن لرننگ سائٹس، آن لائن سیاحتی امداد، آن لائن شاپنگ، آن لائن بزنس گائیڈ کے علاوہ صحت وتندرستی کی رہنمائی سے مزین ویب سائٹ، امتحانات کے نتائج، تعلیمی اداروں کے داخلہ فارم، حکومتی اداروں سے امداد کے لیے آن لائن فارم بھرنے کی سہولت، دنیا میں موجود تعلیمی، اقتصادی، تہذیبی و ثقافتی روابط اور دیگر تمام ممکنہ معلومات آج آن لائن موجود ہیں۔ بہت سے ایسے فری سائٹس بھی موجود ہیں جن کے ذریعے روبرو باتیں کر سکتے ہیں۔ گویا انٹرنیٹ کی مدد سے کمپیوٹر کی اسکرین آج کے دور کا جیتا جاگتا جادو ہے یا یہ کہیں کہ یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جہاں سے آپ ہر طرح کے علم وفن اور تفریح و تفنن کے اسباب و مواد حاصل کر سکتے ہیں۔

انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی ہمہ جہت افادیت کے پیش نظر اگر اردو کے حوالے سے انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی طرف دیکھتے ہیں تو انٹرنیٹ اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود اردو دنیا کے لیے آج بھی اس کی وسعت پہنائیوں سے محروم ہے۔ انٹرنیٹ پر جہاں دنیا کے تمام علوم وفنون سے متعلق مواد بڑی مقدار اور اعلیٰ معیار میں موجود ہیں وہاں اردو زبان و ادب کے حوالے سے ویب سائٹس کی تعداد اور معیار بہت حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ یہ لمحۂ فکر ہے کیونکہ تیز رفتار ترقی کے اس عہد میں اگر ہم نے اپنے ادب اور اپنی زبان کو اس نئی ٹکنالوجی سے ہم آہنگ نہیں کیا تو ترقی کے اس دور میں ہماری زبان، ادب اور تہذیب سب پیچھے رہ جائیں گی۔ کیونکہ عہد حاضر میں ترقی اور تنزلی اسی سے منسوب ہے۔

جدید ٹکنالوجی بالخصوص کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی ترقی نے ابتدا میں یہ تاثر دیا تھا کہ اس سے زبان وادب کے قارئین کم ہوں گے۔ اس سے عالمی رابطے اور کمپیوٹر کی زبان کے علاوہ دیگر زبانیں اپنے دائرے میں سمٹتی چلی جائیں گی۔ مگر شکر ہے کہ ایسا نہ ہوا بلکہ سائبر اسپیس نے زبان وادب کی ترقی کے نئے امکانات کو روشن کیا اور تیز رفتار ترقی کی راہیں ہموار کیں۔ آج کمپیوٹر کی زبان نہ صرف انگلش ہے بلکہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے پاس بھی یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ کمپیوٹر اور سائبر کی زبان بن سکتی ہیں۔ جن ممالک نے انگریزی کے بجائے اپنی زبان کو کمپیوٹر سے ہم آہنگ کیا ہے، وہ زبانیں تمام تر خدشات کو غلط ٹھہراتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں اور جو زبانیں اب تک اس سے ہم آہنگ نہیں ہو سکیں وہ مقابلتاً پیچھے ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اپنی تہذیب وثقافت کی بقا کے لیے جدید ٹکنالوجی سے زبان کو ہم آہنگ کیا جائے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ ہماری اردو زبان بھی اس لائق ہو چکی ہے کہ وہ جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ ہو سکے۔ اس نے بھی خود کو کمپیوٹر کی زبان بنا لیا ہے۔ اب آپ کو انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کے استعمال کے لیے کسی اور زبان کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنے پورے کمپیوٹر کو اردو میں منتقل کر سکتے ہیں، ای میل، چیٹنگ، براؤزنگ سب اردو زبان میں کر سکتے ہیں۔ اردو یونی کوڈ کی ایجاد نے یہ ممکن کر دکھایا ہے۔ اب آپ گوگل یا کسی بھی سرچ انجن میں جا کر اردو میں ٹائپ کریں اور اردو میں جوابات حاصل کریں۔ یہ سب ممکن ہے لیکن مجھے اندازہ ہے کہ ابھی بھی بہت سے لوگ ہیں جو اس کی واقفیت نہیں رکھتے۔ اسی لیے اردو میں ابھی اس کا رواج بہت کم ہے حالانکہ تمام تر سہولیات موجود ہیں۔ عدم واقفیت کے سبب ہم اپنی زبان میں انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کا استعمال نہیں کر پا رہے ہیں۔ حالانکہ اس کے لیے کسی اضافی سوفٹ ویئر کی بھی ضرورت نہیں تمام چیزیں انٹرنیٹ پر مفت میں دستیاب ہیں۔ صرف چند گھنٹوں میں کمپیوٹر پر اردو کا استعمال سیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ اردو کے ادارے اس سمت میں بیداری مہم چلائیں تو سائبر اسپیس میں، اردو معیاری جگہ بنا لے گی۔

انٹرنیٹ پر اردو میں ڈیجیٹل لائبریری اور کئی اہم ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور تعلیمی سائٹس موجود ہیں۔ اس کے علاوہ آج کی اردو صحافت کو انٹرنیٹ کے استعمال نے کافی بلندیوں تک پہنچایا ہے۔ اردو کے بیشتر اخبارات انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔ کئی اخبارات تو ابھی بھی امیج فائل کی شکل میں انٹرنیٹ پر شائع ہو رہے ہیں۔ مگر زیادہ تر اخبارات یونی کوڈ میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان کے مواد بھی طبع شدہ (کاغذی اخبار سے الگ ہوتے ہیں)۔ ایسے اخبار زیادہ اپ ڈیٹیڈ ہوتے ہیں کیونکہ کسی واقعے یا حادثے یا اطلاع کو وہ فوراً شائع کر سکتے ہیں۔ اسی لیے انٹرنیٹ پر موجود اخبارات کو لوگ زیادہ پڑھتے ہیں کیونکہ یہاں تازہ ترین حالات معلوم ہوتے رہتے ہیں۔

کمپیوٹر اور انٹرنیٹ فاصلاتی تعلیم و تدریس کے سلسلے میں بھی کافی معاون ثابت ہو رہا ہے۔ اسباق کی تیاری، طلبہ تک اس کی رسائی اور طلبہ سے اس کے ردعمل کو اس ٹکنالوجی کی مدد سے جانا جا سکتا ہے اور اُن کی ضرورت اور تقاضے کے مدنظر تدریسی مواد تیار کیا جا سکتا ہے۔ اسی ٹکنالوجی کے سبب یہ بھی ممکن ہو سکا ہے کہ دور بیٹھے طلبہ سے براہ راست مخاطب ہو سکتے ہیں اور ان کے سوالات اور تاثرات کو بھی جان سکتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدید ٹکنالوجی نے جہاں زندگی کے تمام شعبوں میں آسانیاں پیدا کی ہیں وہیں اس نے زبان وثقافت کے حوالے سے بھی نئے امکانات کو روشن کیا ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو بھی جدید ٹکنالوجی سے پورے طور پر ہم آہنگ ہے۔

زبان کی ترویج وترقی کے لیے سائبر اسپیس کے استعمال کی جہاں تک بات ہے تو یہاں وسائل بے شمار

ہیں اور طریقے بھی ہزار ہیں۔ آڈیو، ویڈیو اور ڈیجیٹل تکنیک کی مدد سے ہم ان مسائل پر بھی قابو پا سکتے۔ اس وسیلے کو اردو ادب اور زبان دونوں حوالوں سے استعمال کرنے کی بہت زیادہ گنجائشیں موجود ہیں۔ ادب کے حوالے سے جو کام اب تک کیے گئے ہیں یا جو کچھ سائبر اسپیس میں موجود ہیں وہ تشفی بخش ضرور ہیں مگر یہ ناکافی ہیں اس میں مزید وسعت کی ضرورت ہے۔ اردو ادب کی ڈیجیٹل لائبریری، سیاسی، ادبی وتہذیبی رسالے، اخبارات اور کتابوں کے مختلف سائٹس موجود ہیں۔ مگر ان میں موضوعاتی سائٹس کی بے انتہا کمی ہے۔

وکی پیڈیا جو معلومات کا اہم ذریعہ ہے یہ بھی اردو میں دستیاب ہے۔ اِس وکی پیڈیا کی شروعات 2005 میں ہوئی۔ لیکن اردو والوں کی بے توجہی کی وجہ سے اب تک اس میں بہت سی چیزیں موجود نہیں ہیں، کیونکہ اس کی تخلیق اشتراک سے ہوئی ہے اور یہ ہماری توجہ کی طلبگار ہے۔ اس وکی پیڈیا کی وضاحت اور اس کے تعارف کے لیے خود اس کے صفحہ اول میں جو لکھا ہے ملاحظہ فرمائیں:

''اردو وکی پیڈیا کو رضاکار چلاتے ہیں۔ تمام مصنفین اور مدیر دنیا بھر میں پھیلے ہوئے رضاکار ہیں۔ وکی پیڈیا ایک ایسی مخزن العلوم ہے جو اپنے پڑھنے والوں کے اشتراک سے لکھی گئی ہے۔ یہ سائٹ ایک وکی وکی ہے، یعنی کوئی بھی کسی بھی مضمون میں 'صفحے کو ترمیم کریں' کا لنک کلک کر کے صفحے میں ترمیم کر سکتا ہے۔ وکی پیڈیا میں ہر قسم کے مختلف مضامین پر معلومات موجود ہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے صفحہ اول پر جائیے، اپنی پسند کا مضمون تلاش کیجیے اور تحقیق شروع کردیجیے۔ ہر صفحے کے اوپر والے حصے میں تلاش کرنے کا خانہ بھی موجود ہے۔ اگر آپ کو کوئی مضمون پسند آئے تو آپ اس کے گفتگو والے صفحے پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ پہلے 'صفحے پر گفتگو کریں' والی لنک کو کلک کریں اور وہاں 'صفحے کو ترمیم کریں' والی لنک پر کلک کریں۔ ہمیں آپ کے تاثرات پڑھ کر ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔ اگر آپ کو کچھ مل نہیں رہا تو ہم سے امدادی صفحے پر رابطہ کریں۔ اگر آپ کو کوئی نیا مضمون دیکھنا ہے جو ابھی ہمارے پاس نہیں ہے تو درخواست شدہ مضامین کے صفحے پر موجود فہرست میں اضافہ کر دیں۔''

بحوالہ (http://ur.wikipedia.org/wiki)

اور ترتیب وترمیم کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''وکی پیڈیا میں کوئی بھی کسی بھی مضمون میں ترمیم کر سکتا ہے۔ بس 'صفحے کو ترمیم کریں' والی لنک پر کلک کریں اور صفحے میں ترمیم کریں۔ اس کے لیے آپ کو لاگ ان ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ ہماری مدد کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ وکی پیڈیا کو کسی بھی دوسری مخزن العلوم کی طرح پڑھیں۔ جہاں آپ کو کوئی چیز صحیح نہ لگے تو 'صفحے کو ترمیم کریں' کلک کریں اور غلطی کو صحیح کر دیں۔ غلطی کرنے سے گھبرایئے مت، کیونکہ یہ غلطی بھی صحیح ہو سکتی ہے۔ وکی پیڈیا میں ابھی 15,504 مضامین ہیں اور اس تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آپ نیا مضمون بھی شروع کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کو مضمون بگاڑنے سے ڈر لگ رہا ہے تو ریت خانے میں جائیں اور دل بھر کر ترتیب وترمیم کریں اس صفحے میں کچھ بھی کرنے سے مضمون خراب نہیں ہو سکتا۔ آپ پہلے ہماری ہدایات اور حکمت عملی پڑھ لیجیے۔ خاص کر ہماری غیر جانب داری کی حکمت عملی۔ یعنی کہ مضامین میں غیر جانب داری اور غیر طرف داری کا خیال رکھیں۔''

بحوالہ (http://ur.wikipedia.org/wiki)

اردو میں دائرۃ المعارف کی جانب سے اردو وکی پیڈیا لانچ تو ضرور ہوا مگر یہ استناد کے درجے کو نہیں پہنچا ہے اور نہ ہی اس میں وافر معلومات کا ذخیرہ ہے۔ کیونکہ اب تک منصوبہ بند طریقے سے اس پر کام نہیں ہوا ہے اسی لیے اردو میں منصوبہ بند طریقے سے قومی کونسل اردو وکی پیڈیا لانچ کرنے جا رہی ہے جس میں خاطر خواہ اور مستند مواد موجود ہوگا لیکن اس کی ترقی قارئین / صارفین کے تعاون سے ممکن ہو سکے گی۔ انشاء اللہ ماہ اکتوبر تک قومی کونسل اس منصوبے کو مکمل کر لے گی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے آن لائن اردو لرننگ کے سلسلے میں پیش رفت کی ہے۔ کونسل کا یہ آن لائن لرننگ سائٹ اردو زبان سیکھنے کے لیے سیلف لرننگ کے اصولوں پر مبنی ہے جس میں ملٹی میڈیا کے سہارے اردو سیکھنے، لکھنے اور بولنے کا طریقہ دستیاب ہے۔ کوئی بھی شخص کونسل کے اس آن لائن سائٹ پر اردو لکھنا، پڑھنا اور بولنا سیکھ سکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ سائٹ تمام تر ضرورتوں کی تکمیل کرتی ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ پیش رفت کا یہ سلسلہ آگے بڑھے گا اور صارفین کے فیڈ بیک سے اسے اور بھی بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ قومی کونسل نے کمپیوٹر سیکھنے کے لیے اردو زبان میں آن لائن کمپیوٹر لرننگ کی ابتدا مائکروسوفٹ کے ساتھ کی ہے امید ہے یہ اردو جاننے والوں کے لیے ایک اہم تحفہ ثابت ہوگا۔

اسی طرح قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اہم کتابوں کو آن لائن کرنے کا بھی سلسلہ شروع کیا ہے جو مستقل بنیادوں پر اپ ڈیٹ ہوتا رہے گا اور عنقریب اردو وکی پیڈیا لانچ کرنے کا ارادہ ہے جس میں اہم معلومات دستیاب ہوں گی۔ ان تمام تفصیلات کے بعد آخر میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اردو میں ابھی اس حوالے سے بہت کام کرنے باقی ہیں۔ امید ہے عصری تقاضے کا یہ گوشہ بھی بہت جلد وقت سے ہم آہنگ ہوگا۔

■

Dr. Khwaja Ekramuddin, Director, NCPUL,
Institutional Area, Jasola, New Delhi -25

راغب اختر

اردو ڈیجیٹل لائبریری اور آن لائن اردو کورس

موجودہ دور اپنے پچھلے ادوار سے اس لیے الگ ہے کہ اس دور میں انٹرنیٹ جیسی شے موجود ہے۔ انٹرنیٹ نے معلومات کے شعبے کو جس قدر اثر انداز کیا ہے اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج زندگی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں انٹرنیٹ کو بروئے کار نہ لایا جاتا ہو۔ دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرح تعلیم اور تحقیق کا شعبہ بھی اس تکنیک کو بروئے کار لا رہا ہے اور اس شعبے میں بھی ایک انقلاب برپا ہوتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ ڈیجیٹل لائبریری اس دور میں اس لیے ایک خاص اہمیت کی حامل ہوتی جارہی ہے کیونکہ اس کے ذریعے نہ صرف یہ کہ کتابوں کو بہ آسانی دور دراز کے علاقوں تک پہنچایا جاسکتا ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک اور فلسفہ پنہاں ہے اور وہ یہ ہے کہ جتنے زیادہ لوگوں کے پاس یہ کتابیں ہوں گی اتنی ہی زیادہ طویل اس کتاب کی زندگی بھی ہوگی۔ 'ملین بک پروجیکٹ' سے جڑے لوگوں کا کم از کم یہی ماننا ہے۔ ڈیجیٹل لائبریری در اصل کتابوں کو ایک مجازی فورمیٹ یا قالب میں ڈھالنے اور ان کا ایک مجازی ذخیرہ کرنے کے عمل کا نام ہے۔ دنیا کی تمام بڑی یونیورسٹیز اب اپنی ویب سائٹ کے ساتھ ڈیجیٹل لائبریری کو منسلک کررہی ہیں تاکہ ان کے طلبا اپنے علم کے بے پایاں ذخیرے سے استفادہ کرسکیں اور اس ضمن میں انھیں وسائل کے محدود ہونے کا احساس بھی نہ ہو۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس لائبریری میں بیشتر کتابیں چونکہ یونیورسٹی کی اپنی نہیں ہوتی ہیں اور ان کے کاپی رائٹ کا مسئلہ ہوتا ہے لہٰذا عام لوگ اس سے استفادہ نہیں کرسکتے یا پھر اس کے لیے انھیں کچھ پیسے دینے ہوتے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان گزشتہ کچھ برسوں میں اپنی کارکردگی سے نہ صرف اہل اردو بلکہ تمام اہل علم کو انگشت بدنداں کرتی رہی ہے تاہم کونسل عددی یا ڈیجیٹل دنیا میں اس قدر فعال نہیں تھی جتنی توقع کی جاتی ہے۔ یہ بات اہل اردو اور اہل علم دونوں کے لیے خوش آئند ہے کہ کونسل کے نئے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے کونسل میں قدم رکھتے ہی اس کمی کو محسوس کیا اور دو ماہ کی قلیل مدت میں انھوں نے نہ صرف یہ کہ کونسل کی ویب سائٹ کو معیاری بنایا بلکہ ڈیجیٹل لائبریری کو بھی حقیقی معنوں میں لائبریری کی شکل دی جس کا اجرا 30 جون کو ایوان غالب میں وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل کے ہاتھوں ہوا۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین خود بھی اردو اور اس کے Aspect Digital سے متعلق ملک اور بیرون ملک اپنے مقالے پیش کرتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو کو سوشل نیٹ ورک سے جوڑنے کا کام بھی بخوبی کیا ہے۔ ایسے میں ان سے کونسل

مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب کپل سبل قومی اردو کونسل کے آن لائن اردو لرننگ کورس و ڈیجیٹل لائبریری کے اجرا کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے

مرکزی وزیر کونسل کے آن لائن اردو لرننگ کورس کا اجرا کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، ڈاکٹر ایل رما موتھی، عزیز برنی اور پروفیسر وسیم بریلوی کو بھی دیکھا جا سکتا ہے

کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے جو امیدیں تھیں ان کی پہلی قسط انھوں نے کونسل کی ڈیجیٹل لائبریری کی شکل میں ادا کر دی ہے۔

کونسل اس سلسلے میں خوش قسمت ہے کہ اس کے پاس اپنی کتابوں کی تعداد کافی ہے اور تمام کتابیں معیاری ہیں۔ کونسل کی یہ تمام کتابیں اب اس کی ویب سائٹ پر موجود ہیں جنھیں کوئی بھی ڈاؤن لوڈ کر سکتا ہے اور ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔ اردو کونسل کی یہ کاوش صرف ہندوستان نہیں بلکہ ساری دنیا میں اردو سے محبت کرنے والوں تک اردو کی معیاری کتابوں کی رسائی میں اہم کردار ادا کرے گی۔

اردو کونسل مستقبل کو نظر میں رکھتے ہوئے OCR یعنی Optical Character Recognition پر بھی کام کر رہی ہے جس سے مستقبل قریب میں اردو کی کتابوں کو انگریزی کی کتابوں کی طرح استعمال کیا جا سکے گا۔ یہ تکنیک نہ صرف یہ کہ کتابوں کے سائز کو بہت کم کر دے گی بلکہ اس میں Option Search کا استعمال بھی کیا جا سکے گا۔ اس کے علاوہ اس تکنیک کے آ جانے سے کمپیوٹر کتابوں کی قرات کر سکے گا جو خصوصی طور پر نابینا طلبا کے لیے بہت زیادہ مفید ثابت ہوگا۔

ڈیجیٹل لائبریری اور روایتی لائبریری کا تقابلی تجزیہ کیا جائے تو اس ضمن میں کئی نکات کو زیر غور لانا ہوگا۔

سب سے پہلی بات جو اس ضمن میں کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ گلوبل دور میں جب علم علاقائیت کی قید سے آزاد ہے لائبریری کو بھی قید مقام سے نکلنا ہوگا اور یہ تبھی ممکن ہے جب اسے ڈیجیٹل بنایا جائے۔

بڑی لائبریریوں کا فائدہ ان لوگوں تک نہیں پہنچ رہا ہے جو گاؤں اور دور دراز کے علاقے میں رہتے ہیں حالانکہ اب موبائل کے ذریعے انٹرنیٹ ہر گاؤں میں موجود ہے جس سے عام طور پر صرف گانے ڈاؤن لوڈ کرنے کا کام لیا جا رہا ہے اس لیے اس بات پر بحث بیکار ہے کہ ٹکنالوجی گاؤں تک کیسے پہنچے گی اب صرف اتنا ہونا ہے کہ موبائل کی جگہ ان ہاتھوں میں سستے Tablets آئیں اور انھیں علم کی راہ دکھائی جائے۔

لائبریری سے استفادہ کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کی ممبرشپ کا حصول رہی ہے۔ لیکن ڈیجیٹل لائبریری سے استفادہ کرنے کے لیے نہ تو اس کے ممبرشپ کے لیے طویل سفر کی ضرورت ہے اور نہ ہی کتابیں Issue کرانے اور انھیں واپس کرنے کی۔

دنیا آج جو سب سے بڑے مسئلے سے نبرد آزما ہے وہ ہے گلوبل وارمنگ (Warming Global)، جس پر قابو پانے کے لیے کم سے کم قدرتی وسائل کے استعمال اور ان کے تحفظ کے لیے زیادہ سے زیادہ اقدام کی ضرورت پر زور دیا جا رہا ہے۔ حالیہ دنوں میں بھارتی ریل کی طرف سے یہ مستحسن فیصلہ لیا گیا کہ اب انٹرنیٹ سے خریدے گئے ٹکٹوں کا ایس ایم ایس موبائل پر دکھانے سے ہی کام چل جایا کرے گا جس سے ماہانہ کئی سو کروڑ صفحات بچائے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس ضمن میں انسائکلو پیڈیا برٹینکا کی مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے جس نے حال ہی میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ اپنی روایتی اشاعت کا سلسلہ بند کر رہی ہے اور اب یہ انسائکلو پیڈیا صرف ڈیجیٹل شکل میں دستیاب ہوگا۔ یہ تمام باتیں اس طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ اب زیادہ دن خود کو اس شہ دھارے سے دور نہیں رکھا جا سکتا ہے جسے ڈیجیٹل ورلڈ کہتے ہیں۔

ایک اور بڑی وجہ اس لائبریری کے قیام کی یہ ہے کہ عام طور پر بہت سے نادر مخطوطات لائبریریوں میں یا تو دانستہ طور پر تلف کر دیے جاتے ہیں یا پھر صحیح انتظام نہ ہونے کی وجہ سے خود بخود خاک میں مل جاتے ہیں۔ ایک تخمینے کے مطابق دنیا میں ہر سال شائع ہونے والی کتابیں، فلمیں اور دیگر تخلیقی مواد کو صرف پندرہ لاکھ گیگا بائٹ اسپیس میں محفوظ کیا جا سکتا ہے جو کمپیوٹر کی محض چند فٹ جگہ گھیرے گا۔ جبکہ روایتی شکل میں محفوظ کرنے میں کئی سو ایکڑ زمین کی ضرورت ہوگی۔ اس کے علاوہ روایتی لائبریری پر جو خرچ ہوتا ہے ڈیجیٹل لائبریری اس سے بہت کم خرچ میں Manage کی جا سکتی ہے۔

ایک اور وجہ اس کے قیام اور مقبولیت کی یہ ہے کہ یہ لائبریری کبھی بند نہیں ہوتی لہٰذا کسی بھی وقت اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے اعلاوہ اس میں کتاب کی

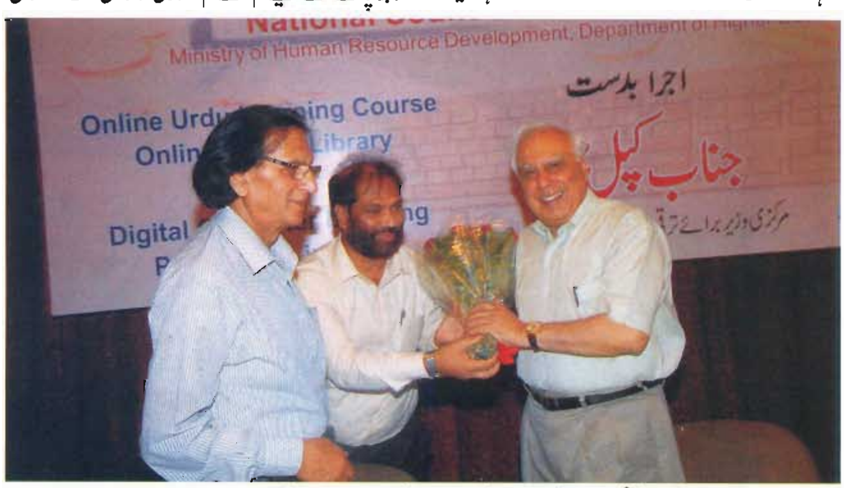

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین مرکزی وزیر کا استقبال کرتے ہوئے
ساتھ میں کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی

فراہمی کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ کسی کتاب سے بہ یک وقت لا تعداد لوگ استفادہ کر سکتے ہیں جبکہ روایتی لائبریری میں کتاب کی واپسی کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

اردو کونسل کی ڈیجیٹل لائبریری قارئین کو دو فورمیٹ یا شکل میں کتابیں فراہم کرتی ہے۔ ایک فورمیٹ صرف مطالعے کے لیے ہے اور یہ فورمیٹ 'فلپ بک' یا 'فلیش بک' کی ہے۔ اس فورمیٹ میں قاری کو کتاب کے صفحات کو پلٹنے کا احساس بھی ہوتا ہے اور وہ اس صفحے کے پلٹنے کی آواز بھی سن سکتا ہے۔ ابھی اس فورمیٹ میں ادب اطفال کو ڈالا جا رہا ہے تاکہ وہ اس سے محظوظ ہو سکیں۔ دوسری شکل PDF ہے جو Ebook کی اب تک کی مقبول ترین شکل ہے۔ اس کے ذریعے قاری کتاب کو اپنے کمپیوٹر پر محفوظ کر سکتا ہے اور اس کا مطالعہ انٹرنیٹ کے بغیر بھی کر سکتا ہے۔ کونسل آئندہ ان کتابوں کو epub کے فورمیٹ میں لانے کا ارادہ رکھتی ہے تاکہ یہ Android موبائل اور دوسرے آلات پر بھی بخوبی پڑھی جا سکیں۔

ابھی ڈیجیٹل ورلڈ میں جو کتب خانے لوگوں کو فیض پہنچا رہے ہیں ان میں سب سے نمایاں نام ملین بک پروجیکٹ کا ہے جس نے دنیا کے روایتی کتب خانوں کو ڈیجیٹل شکل دینے اور انھیں لوگوں تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس ضمن میں عثمانیہ لائبریری اور دوسری لائبریریوں کے کتب Archive.org جیسی ویب سائٹ پر PDF اور دیگر فورمیٹ میں دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ ڈیجیٹل لائبریری آف انڈیا بھی اسی پروجیکٹ اور کچھ اپنے وسائل سے اردو کی کتابیں عوام تک پہنچانے کا کام انجام دے رہی ہے۔ اعجاز عبید کی لائبریری برقی

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین خطاب کرتے ہوئے

کتابیں ہر چند کہ وسائل کے اعتبار سے اتنی قوی نہیں ہے تاہم یہ اردو کتابیں یونی کوڈ میں فراہم کرتی ہے۔ اردو کونسل کی یہ کاوش کونسل کی ذاتی کاوش ہے اور اسے وسائل کی تنگی کا بھی سامنا نہیں ہوگا اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں یہ ایک اہم نام بن کر ہمارے سامنے آئے گا۔

اس کے علاوہ کونسل نے جن دو پروگرام کو عوام کے حوالے کیا وہ آن لائن اردو لرننگ کورس اور 'ڈیجیٹل کمپیوٹر لرننگ' پروگرام ہیں۔ یہ دونوں پروگرام بھی کافی اہم ہیں۔ پہلا پروگرام جو اردو سیکھنے کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہے CIIL میسور کے ذریعے کونسل نے تیار کرایا ہے جو ان لوگوں کے خواب کی تعبیر کی حیثیت رکھتا ہے جو اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ نہ کسی استاد کی ضرورت اور نہ ہی پابندی وقت کی قید۔ کونسل کے اس پروگرام سے کافی امیدیں وابستہ ہیں۔ وہ اس پروگرام کو ساری دنیا میں اردو زبان کی تدریس کے لیے استعمال کرنے کا ارادہ تو رکھتی ہی ہے ساتھ ہی ساتھ بالی ووڈ میں تلفظ کے مسائل کو حل کرنے میں بھی اسے بروئے کار لانا چاہتی ہے۔ اس پروگرام کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے ذریعے اردو رسم الخط کی پیچیدگیوں کو سمجھا اور حل کیا جا سکتا ہے۔ یہ نہ صرف ابجدی اردو کو Illustrate کرتا ہے بلکہ طلبا کو بھی مشق کی دعوت دیتا ہے۔ کل پانچ ابواب پر مشتمل یہ پروگرام اردو لکھنے پڑھنے سے لے کر گفتگو کے آداب تک کی تدریس کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہے۔

ایک اور پروگرام جو اسی تقریب میں کونسل کی ویب سائٹ پر لانچ کیا گیا وہ مائکروسوفٹ کے ذریعے تیار کیا گیا کمپیوٹر لرننگ پروگرام ہے۔ اس پردگرام کے کونسل کی سائٹ پر لانچ کیے جانے کے پیچھے جو سوچ پنہاں ہے وہ ہے عام لوگوں تک کمپیوٹر سے متعلق معلومات اردو میں فراہم کرنا۔ اس پروگرام کے اردو ورزن میں زبان کی بے شمار خامیوں کی وجہ سے کونسل نے ان کو دور کرنے کی تجویز پیش کی جو مائکروسوفٹ کی جانب سے منظور کر لی گئی ہے اور یہ ایک اہم قدم اس لیے ہے کہ مائکروسوفٹ کا یہ پروگرام جو ساری دنیا تک پہنچے گا اگر مبہم رہا تو اس کا مقصد فوت جائے گا جبکہ کونسل اگر اس کی خامیوں کو دور کرنے میں مائکروسوفٹ کی مدد کرتی ہے تو کمپیوٹر کی اساسی معلومات عوام تک اردو زبان میں پہنچ پائے گی۔

■

Raghib Akhtar,169, Sabarmati Hostel, JNU, New Delhi - 1100 67

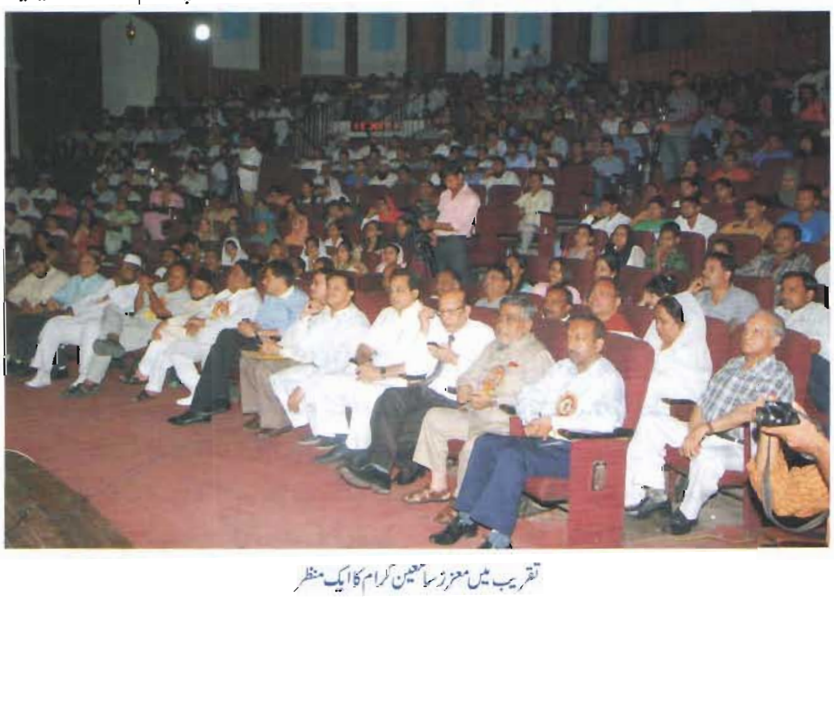

تقریب میں معزز سامعین کرام کا ایک منظر

ہاجرہ بانو

اردو ذریعہ تعلیم اور روزگار

فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر جناب کپل سبل نے یونیورسل اسوسی ایشن فار اسپریچول اورینس کی جانب سے ایک بار اردو زبان کے بارے میں کہا تھا کہ اردو علاقائی نہیں بلکہ قومی زبان ہے جو ہر جگہ بولی جاتی ہے اور سہ لسانی فارمولے کے تحت اس سے متعلق فیصلے ریاستی حکومتیں لیتی ہیں۔ اردو زبان ملک کو جوڑتی ہی نہیں بلکہ ہماری ثقافت کو بھی سامنے رکھتی ہے۔ اگر اردو کو روزگار سے جوڑ دیا جائے تو زبان بھی خود ترقی کی سمت گامزن ہوگی۔ اگنو IGNOU (اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی) کے تحت اردو، عربی اور فارسی زبان میں کئی نئے کورسیز کی شروعات کی گئی ہے جن میں درس وتدریس، صحیح تلفظ، املا نویسی، مادری زبان کا ذرائع ابلاغ میں استعمال، جرنلزم اور اسکرپٹ رائٹنگ جیسے کئی مفید کورسیز شامل ہیں جنہیں اپنا کر دور حاضر کے طلبہ نہایت آسانی سے اپنی مادری زبان میں ہی ان تربیتی کورسیز کو مکمل کر کے اپنا کیریئر بنا کر بہترین ملازمتیں حاصل کر سکتے ہیں۔ عصر حاضر میں تعلیم کو لے کر ریاستی اور مرکزی حکومت نہایت سرگرم ہیں۔ مرکزی حکومت کے تحت رائٹ ٹو ایجوکیشن قانون کے نفاذ کے بعد جو صورتحال نظر آرہی ہے اس کے پیش نظر اساتذہ کی مانگ میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لحاظ سے یہ پیشہ نوجوانوں کے لیے مستقبل میں بے شمار قوی امکانات رکھتا ہے۔ مرکزی حکومت کی تجزیاتی رپورٹ کے مطابق مرکزی و ریاستی سطح پر اگلے چار سالوں کے دوران 12 لاکھ اساتذہ کی تقرری کی ضرورت درپیش ہوگی۔ کئی پرائیوٹ کمپنیاں تعلیمی کیریئر کے میدان میں سرمایہ کاری کی مختلف اسکیمیں بنا رہی ہیں۔ پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کے تحت اسکول کھولے جا رہے ہیں جس کے لیے ٹرینڈ پروفیشنل کی ضرورت ہوگی۔ مرکزی حکومت کے ذریعے 16 سینٹرل یونیورسٹیز، 370 کالج، 8 انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (IIT)، 7 انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ (IIM)، 10 نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (NIT)، 20 انڈین انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، 5 انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس ایجوکیشن اینڈ ریسرچ (IISER) اور 50 ٹریننگ و ریسرچ سینٹر کھولنے کے لیے 306.82 بلین روپے خرچ کرنے کا منصوبہ ہے۔ فی الحال ان میں سے کئی ادارے شروع ہو چکے ہیں اور دیگر اپنے تکمیل کے آخری مراحل میں ہیں۔

اکیسویں صدی کی ٹیکنالوجی اور مواصلاتی انقلاب نے تعلیم اور پیشہ وارانہ تربیت کی اہمیت و افادیت کو بڑی حد تک عوام میں مقبول کروایا ہے۔ شاید یہی بڑا سبب ہے کہ آج کل تعلیم کے ساتھ پیشہ وارانہ تربیت ضروری گردانی جا رہی ہے۔ مغربی ممالک کی طرز پر مشرقی ممالک بھی روزمرہ کی ضروریات کی تکمیل کرنے والے ہنر کی بھی تربیت کی اہمیت اور افادیت سمجھنے لگے ہیں۔ اپنے پیروں پر جلد کھڑا ہونے اور خاندان کی کفالت کی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے ہر نوجوان چاہتا ہے کہ تعلیم میں بھی وہ شارٹ کٹ کا راستہ اختیار کرے تاکہ بڑھتی مہنگائی میں اپنے افراد و خاندان کے علاوہ خود بھی خود کفیل بن جائے اور زندگی کی معاشی گاڑی کو اپنے کندھوں سے کھینچ سکے۔ ایسے ہی رجحانات دیکھتے ہوئے مرکزی حکومت نے پورے ملک میں تقریباً 100 آدرش کمیونٹی کالج شروع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ جس کے ذریعہ نوجوان اپنے اپنے ہنر اور عملی تربیت کے بل بوتے پر ٹیکنیکل تعلیم حاصل کر کے خود کو بلند مرتبہ بنا سکیں گے۔

ساتھ ہی ملک کی ترقی بھی ہوگی۔ اسی طرح دہلی اسٹیٹ انڈسٹریل اینڈ انفراسٹرکچر ڈیولپمنٹ کارپوریشن (DSIIDC) نے بھی تقریباً 12 نئے پروفیشل کورسیز شروع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ تمام کورسیز جاب اورینٹڈ Job Oriented Courses ہیں جن سے ہزاروں نوجوان نہایت ہی قلیل مدت میں تربیت حاصل کر کے اپنے مستقبل کو روشن کر سکتے ہیں جو نوجوان بیرون ملک ملازمت کے خواہشمند ہیں وہ بھی ان کورسیز سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ DSIIDC ہر سال تقریباً 3000 لوگوں کو روزگار سے نسبت رکھنے والے تربیت دے گا۔ ان کورسیز میں ریفریجریشن، پلمبنگ، کال سینٹر ٹریننگ، شیئر مارکیٹ ٹریننگ، موبائل ریپیرنگ، ٹریول اینڈ ٹورزم، کیٹرنگ، بیسک کمپیوٹر ٹریننگ، کرین آپریٹر ٹریننگ، فیشن ڈیزائنگ اور ویب ڈیزائنگ وغیرہ کورسیز شامل ہیں۔ ان کی میعاد ایک ماہ سے ایک سال تک واجبی فیس کے ساتھ ہے اس تربیتی مرکز کے کئی مقامات پر بھی ضمنی مراکز قائم کیے گئے ہیں بلکہ انہیں کئی انڈسٹریز سے بھی منسلک کیا گیا ہے تاکہ تربیت یافتہ نوجوان فوراً روزگار حاصل کر سکیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ٹیلی ویژن کے ذریعے بھی ملک بھر میں اردو بیداری کی مہم شروع کی ہے۔ جس کی وجہ سے عوام اردو کی کئی ادبی وثقافتی سرگرمیوں سے روشناس ہو رہے ہیں اور ساتھ ہی کئی مختلف محاذ پر کیریئر

کے دروازے نوجوانوں کے لیے کشادہ ہو رہے ہیں۔ جس میں فوٹوگرافی، اسکرپٹ رائٹنگ، گرافکس جیسے جدید کورسیز میں دلچسپی رکھنے والے افراد اپنی مادری زبان کے ذریعہ اور اس کی خدمت کے لیے خود کو پیش کر سکتے ہیں۔

آج کل مختلف النوع ٹی وی چینلز لانچ ہو رہے ہیں۔ پرائیویٹ ریڈیو اسٹیشن قائم کیے جا رہے ہیں۔ ٹی وی پروگرامز تیار کرنے کے لیے کئی شعبوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن کو ماہرین کی سربراہی حاصل ہوتی ہے۔ ٹیلی ویژن کا ہر پروگرام کئی ماہرین کی محنت و کاوش کے بدلے ہی انجام پاتا ہے۔ ان تمام شعبوں میں کئی روزگار کے مواقع موجود ہوتے ہیں جیسے پروڈیوسر پروڈکشن، اسسٹنٹ، فلور فیچر اور اسکرپٹ رائیٹرس وغیرہ۔ ان تمام کو اردو زبان سے واقفیت ہونی بہت ضروری ہے۔ ذرائع ابلاغ میں ٹی وی کی مقبولیت جتنی ہے اتنی ہی اس کی ترقی کو بروئے کار لانے میں زبان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہندی کے نام پر اردو زبان کا ہی چلن عام ہے۔ اپنے پروگرامز کو بہتر سے بہتر بنانے اور اپنی TRP میں اضافہ کرنے کے لیے پروڈیوسر و ڈائرکٹرس عمدہ اور شیریں زبان کا استعمال بے خوف و بلا جھجک کرتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف عوام و خواص کے دلوں اور گھروں تک اپنے ٹیلی کاسٹ پہنچانا ہوتا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ اردو سے بہتر کوئی اور زبان شیریں ہو ہی نہیں سکتی۔ ایک ہندی شاعر نے خود کے لیے کیا خوب کہا ہے کہ:

جب سے اردو سے محبت ہوگئی
میری ہندی خوبصورت ہوگئی

ہزاروں دانشوران کا ماننا ہے کہ فلم انڈسٹری میں اردو کی مخفی خدمات اب منظر عام پر آ رہی ہیں۔ اردو ہندوستانی فلموں کی روح ہے۔ کیونکہ اردو زبان کی خاصیت یہی ہے کہ وہ عوام و خواص کے دلوں پر یکساں راج کرتی ہے۔ ملک بھر میں مختلف زبانوں میں ہزاروں فلمیں بنتی ہیں۔ لیکن اردو اور اردو والوں کی خدمات کا اعتراف صرف باکس آفس تک محدود نہیں بلکہ بین الاقوامی آسکر ایوارڈس تک نظر آتا ہے۔ یہ صرف اردو زبان کی دلکشی کا ہی کمال ہے کہ اس نے انسانی جذبات کی ترجمانی کا کام نہایت ہی عمدگی سے کیا ہے۔ اردو الفاظ سے مزین ہندوستانی فلمی گیتوں کی مقبولیت کا تو یہ عالم ہے کہ پوری دنیا کے نوجوان جن میں ملک عرب اور انگلستان بھی شامل ہے۔ تمام گیت سمجھے بغیر بھی یاد کر لیتے ہیں کیونکہ وہ الفاظ خود بڑی آسانی سے ان کے دلوں میں جگہ بنالیتے ہیں۔

اردو زبان میں اتنی قوت پوشیدہ ہے کہ وہ بذریعہ سماعت دلوں میں اتر کر روح میں جذب ہو جاتی ہے۔

اسکرپٹ رائٹنگ میں اردو داں طبقے کی بہت مانگ ہے۔ اس کے علاوہ ٹیکنیکل ماہرین سے متعلق شعبے بھی روزگار کے دروازے کھولتے ہیں۔ جیسے کیمرہ مین، لائٹنگ، ساؤنڈ ریکارڈنگ، سیٹ ڈیزائننگ، ویژن مکسنگ، میک اپ آرٹس، ڈریس ڈیزائننگ، گرافک آرٹسٹ، ایڈیٹنگ، ڈرامہ آرٹسٹ، پریزنٹرس اور میوزک کمپوزر وغیرہ۔

مرکزی پلاننگ کے تحت آج اردو کی اشاعت ہی ضروری نہیں بلکہ اس سے منسلک تہذیب و ثقافت کو فروغ دینا بھی ضروری ہے۔ اس ضمن میں حکومت نے ایک پروجیکٹ شروع کیا ہے جس کے تحت گجرات، مہاراشٹر اور جنوبی ہند میں پائی جانے والی اردو کے رنگ و روپ کی تفہیم اور تحقیق کو ترجیح دی جائے گی۔ ظاہری بات ہے کہ اتنے وسیع پروجیکٹ میں ملازمتوں کے مواقع اور ماہرین کو اپنی خدمات پیش کرنے کا سنہرا موقع مل سکتا ہے۔

بھوپال مدھیہ پردیش میں ماکھن لال چترویدی یونیورسٹی، جرنلزم اور الیکٹرانک میڈیا کے بہت سارے کورسیز چلا رہی ہے۔ دلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے MCRC میں مختلف ریگولر کورسیز کے علاوہ اسٹل فوٹوگرافی جیسے مضامین کی تدریس بھی جاری ہے۔ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی اگنو نے بھی اب فاصلاتی نظام کے ساتھ ساتھ ریگولر کورسیز بھی میڈیا کے ترقی پذیر میدان میں شروع کیے ہیں۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونکیشن (IIMC) میں جرنلزم سے متعلق کئی کورسیز ہیں۔ کروکشیتر میں کروکشیتر یونیورسٹی اور حسار، ہریانہ میں گرو جمبھیشور یونیورسٹی (GJU) میں ماس میڈیا سے متعلق بیچلرز اور ماسٹر کورسیز ریگولر اور فاصلاتی نظام کے تحت بھی کروائے جا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ راجستھان یونیورسٹی جے پور میں کوٹہ اوپن یونیورسٹی میں بھی ماس میڈیا کے کئی کورسیز ہیں۔ بابا صاحب امبیڈکر مرہٹواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد مہاراشٹر میں کئی پروفیشنل تربیتی کورسیز کی شروعات ہو چکی ہے۔ ان کے علاوہ کئی ایسے پرائیویٹ ادارے ہیں جو ماس میڈیا سے متعلق مضامین کی درس و تدریس کا کام بھی انجام دے رہے ہیں اور روزگار کے مواقع بھی فراہم کر رہے ہیں اور اردو ذریعہ تعلیم طلباء بھی ان سے خاطر خواہ استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔

اب تو پبلک سروس کمیشن امتحانات بھی اردو و فارسی زبان میں منعقد کیے جا رہے ہیں۔ فروغ انسانی وسائل اور ٹیلی مواصلات کے مرکزی وزیر جناب کپل سبل نے اپنی کئی تقاریر میں اس بات کا تیقن دیا کہ یو پی اے سرکار اردو کو روزگار سے جوڑنے کی تمام تر کوششیں کر رہی ہے اور اس ضمن میں سرکار کے متعلقہ ادارے سرگرم عمل ہیں جس کے بہتر نتائج بھی سامنے آ رہے ہیں۔ اب وقت کا تقاضا ہے کہ ہم ان حالات سے بھرپور استفادہ حاصل کریں اور صرف اردو کے فروغ و بقا کے مقصد و ملازمت کے حصول پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھیں۔ اردو کی جڑیں تو بھارت کی گنگا جمنی تہذیب میں پیوست ہیں، ہمیں اپنی وراثت کی حفاظت کا پورا عزم کرنا چاہیے اور اپنی ذہنی بیداری اور جذباتی شعور میں پختگی لانی چاہیے۔

ملک بھر میں لاکھوں بچے اردو ذریعہ تعلیم کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ان کو کسی بھی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایک بڑی طویل فہرست ہے جن میں ان افراد کا شمار ہے جنھیں اعلی عہدوں پر پہنچانے میں اردو زبان نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ آج انگریزی و چائنیز کے بعد سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان اردو ہے۔

اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق آج پوری دنیا میں 400 ملین لوگ اردو زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ٹوکیو جاپان یونیورسٹی میں 1909ء سے شعبۂ اردو قائم ہے اور کئی ہندوستانی وہاں برسر ملازمت ہیں۔ 2009 میں اس شعبہ کا صد سالہ جشن بڑی شان و شوکت کے ساتھ منایا گیا۔ جامعہ ازہر مصر یونیورسٹی میں بھی شعبہ اردو قائم ہے۔ ملک عمان میں اردو کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ اہل عرب تو اردو کے دیوانے ہیں ہی۔ یہ تو صرف چند مثالیں ہیں ایسی کئی مثالیں دنیا کے دیگر ممالک میں بھی ملیں گی۔

کرۂ ارض کی ترقی تو معاشیات پر منحصر ہے۔ ہر شخص سود و زیاں کے حصار میں قید ہے۔ جب انہیں اردو کی قدر، اردو کا استعمال اور اردو کی نسبتی اشیا کی ڈیمانڈ محسوس ہوگی تو یقیناً ان کی فیکٹریز کے راستے اردو والوں کے گھروں تک آ کر ختم ہوں گے اور اسی وقت صحیح معنوں میں اردو کی معاشیاتی ترقی ہوگی اور اسی ترقی سے اردو ذریعہ تعلیمی افراد کے لیے لاکھوں کروڑوں ملازمتوں کے روزگار کے مواقع بھی فراہم ہوں گے۔

■

Hajera Bano, Plot No. 93, Sector/A, CIDCO, N-13, Himayat Bagh, Aurangabad (M.S) 431001

ہمارا قومی پرچم

عظیم اقبال

ایک ریاست کے لیے، سیاسیاست کی زبان میں خطہ زمین، آبادی، حکومت اور خودمختاری، ضروری شرطیں ہیں۔ ریاست، ملک سے بڑی چیز ہے۔ ملک میں خودمختاری نہیں ہوسکتی، جب کہ ریاست کے لیے یہ ایک لازمی امر ہے۔ 15 اگست 1947 سے قبل ہندوستان ایک ملک تو تھا، لیکن خودمختار نہ ہونے کے سبب اسے ریاست کا درجہ حاصل نہ تھا۔ ہر ریاست کا قومی پرچم ہوتا ہے ہماری ریاست کا بھی ایک قومی پرچم ہے، جس کا ہم بڑا احترام کرتے ہیں۔

آج ہندوستانی پرچم آزادی اور ترقی کا اشاریہ ہے۔ ہمارا پرچم افق کے رنگ سے رنگا ہے۔ سب سے اوپر گہرا زعفرانی رنگ ہے، وسط میں سفید رنگ ہے، اور نیچے گہرا سبز رنگ ہے۔ سفید پٹی کے مرکز میں ایک چرخی ہے، جس کا رنگ نیلا ہے۔ یہ قانون کی چرخی کا اشارہ ہے۔ اسی طرح ہمارے قومی پرچم کا رنگ، روپ معنی خیز ہے۔ اسے سمجھنا ضروری ہے۔

اس قومی پرچم کی ایک تاریخ ہے۔ اس سے واقفیت لازمی ہے۔ پنگالی وینکیا (Pingali Venkyya) نے ہندوستان کے قومی پرچم کا نقشہ تیار کیا۔ ان کی پیدائش 2 اگست 1876 کو بھٹلا مرو، (Bhatla Penumarru) میں ہوئی تھی۔ یہ علاقہ مچھلی پٹنم کے قریب واقع ہے۔ مچھلی پٹنم میں ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد پنگالی کولمبو چلے گئے، تاکہ سینئر کیمبرج کی تکمیل کرسکیں۔ انھوں نے ریلوے گارڈ کے بطور کام کیا۔ پھر وہ بلاری (Bellary) میں سرکاری ملازم رہے۔ بعد ازاں لاہور چلے گئے۔ ارضیات میں انھیں دسترس حاصل تھی اور آندھرا پردیش میں نئی فصلیں اگانے کے لیے وہ کوشاں رہے۔ وہ ہیرے کی کانوں کے مقتدر بنے۔ اس سے انھیں لوگ ڈائمنڈ وینکیا سے موسوم کرنے لگے۔

آیئے، اپنے قومی پرچم کی مختصر تاریخ پر ایک نظر ڈالیں۔ کاکناڈا (Kakinada) میں انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجتماع کے دوران وینکیا نے تجویز رکھی کہ ہندوستان کا ایک پرچم ہونا چاہیے۔ اس تجویز کو گاندھی جی نے سراہا۔ انھوں نے کہا کہ وینکیا اس کا ایک نقشہ تیار کریں۔ وجے واڑہ میں اجتماع کے دوران 22 جولائی 1947 کو وینکیا نے تجویز رکھی کہ پرچم سہ رنگا ہو اور درمیان میں 'اشوک چکر' ہو۔ گاندھی جی نے پرچم کے لیے پسندیدگی دکھائی۔ بعد ازاں یہ نقشہ بطور ہندوستانی قومی پرچم کے منظور کرلیا گیا۔ یہی نقشہ آج بھی مستعمل ہے۔

کہتے ہیں کہ ہندوستان میں پارسی، بگان چوک، (گرین پارک)، کلکتہ میں 7 اگست 1906 کو پہلی دفعہ پرچم کشائی ہوئی۔ اس وقت ہمارے پرچم کی ہیئت قدرے مختلف تھی۔ پرچم میں تین آڑی پٹیاں تھیں، جو سرخ، زرد اور سبز رنگ کی تھیں۔

دوسری دفعہ مادام کاما (Cama) اور ان کے جلاوطن انقلاب احباب نے پیرس میں 1907 میں پرچم کشائی کی۔ یہ پرچم بھی پہلے پرچم کی طرح ہی تھا۔ لیکن اس میں فرق یہ تھا کہ پہلی پٹی میں ایک کمل (Lotus) اور سات ستارے تھے، جو 'ہپت رشی' کی علامت تھے۔ اسی پرچم کی نمائش برلن کے سوشلسٹ کانفرنس میں بھی ہوئی۔ محبّ وطن لوگ وقت بے وقت اور جا بجا پرچم کشائی کے وسیلے سے ملک میں آزادی کی تحریک کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ اس کے حق میں بین الاقوامی رائے عامہ تیار کررہے تھے۔

تیسرے پرچم کا نقشہ 1917 میں بنایا گیا۔ اس وقت ہماری سیاسی سرگرمیوں میں ایک متعین موڑ آ گیا تھا۔ ہوم رول تحریک (Home Qule, Movement) کے دوران ڈاکٹر اینی بینٹ اور لوک مانیہ تلک نے اس کی پرچم کشائی کی۔ اس پرچم میں 5 سرخ اور 4 سبز آڑی پٹیاں تھیں، جنھیں ایک کے بعد ایک سجایا گیا تھا۔ ان کے اوپر 7 ستاروں کا اجتماع، بہ معنی، ہپت رشی، نمایاں تھا۔ اوپر بائیں گوشے میں یونین جیک (حکومت برطانیہ کا قومی پرچم) تھا۔ ایک دیگر گوشے میں سفید ہلال اور ستارہ بنے تھے۔

پھر 1921 بیزواڑہ، (اب وجے واڑہ) میں کل ہند کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں آندھرا کے نوجوانوں نے ایک پرچم بنایا اور اسے گاندھی جی کے پاس لے گئے۔ یہ دو رنگوں، سرخ اور سبز سے مل کر بنا تھا۔ یہ دو رنگ، دو اکثریتی فرقوں، ہندو اور مسلمان کی نمائندگی کررہے تھے۔ گاندھی جی نے تجویز رکھی کہ اسی میں سفید رنگ کا اضافہ کردیا جائے، جو کہ دیگر طبقات کی نمائندگی کرے اور چرخہ بھی ہو، جو قوم کی ترقی کی علامت ہو۔ ایسے گاندھی جی کی منظوری مل گئی۔

پرچم کی تاریخ میں 1931 ایک نمایاں سال تھا۔ ترنگا (Tricolour) ایک تجویز کے ذریعے قومی پرچم کے

بطور منظور کرلیا گیا۔ اسی پرچم میں زعفرانی، سفید اور سبز رنگ تھے اور وسط میں ایک چرخہ تھا۔ کانگریس نے باضابطہ طور پر اسے منظور کرلیا۔ 22 جولائی 1947 کو مجلس آئین ساز (Constituent Assembly) نے آزاد ہندوستان کے پرچم کے بطور اس پر صاد کردیا۔ اس کے رنگ وہی رہے۔ اہمیت بھی وہی رہی، صرف چرخے کے بجائے 'اشوک کے دھرم چکر' کو جگہ ملی۔ یوں کانگریس پارٹی کا ترنگا آخر کار آزاد ہندوستان کا پرچم قرار دیا۔ اسی آخری قومی پرچم کا ڈیزائن پنگالی وینکیا کے ذریعے بنایا گیا تھا۔

ہمارا قومی پرچم ہمیں بے حد عزیز اور محترم ہے۔ اس کی آن بان، پر ہم سب فدا ہیں۔ اس سے ہماری آزادی، خودمختاری اور خوش حالی عبارت ہے۔ اس پر ہماری جان صدقے اس پر ہماری شان نچھاور، اسے ہمارا سب کچھ نذر!

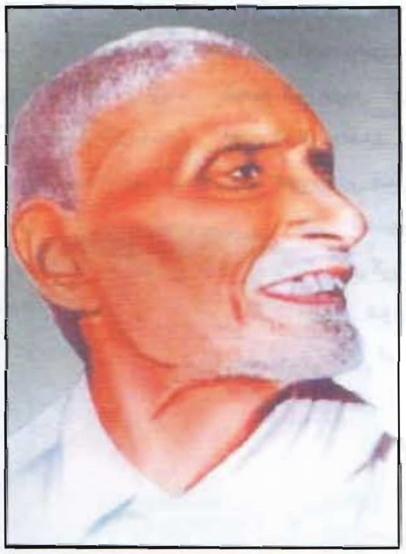

اپنے قومی پرچم کے سامنے ہم سرنگوں ہوتے ہیں۔ اس کی عظمت کے ہم پاسدار ہیں۔ اپنی جان دے دیں گے۔ لیکن اسے جھکنے نہ دیں گے۔ یہ جھکا تو ملک جھک جائے گا۔

ہم یاد دلا دیں کہ ملک کا قومی پرچم تو کانگریس (انڈین نیشنل) پارٹی کی دین ہے، لیکن اس کے قومی پرچم بننے کے ساتھ ہی کانگریس پارٹی کے اپنے پرچم کی شناخت الگ ہوگئی۔ ویسے دونوں میں اس فرق کے ساتھ مماثلت ہے کہ قومی پرچم کے وسطی حصے میں سفید پٹی پر اشوک چکر ثبت ہے۔ جب کہ کانگریس کے اپنے پرچم میں اس مقام پر چرخہ بنا ہوا ہے۔

ہر سال یوم آزادی (15 اگست) کے موقعے پر لال قلعہ کی فصیل سے وزیر اعظم بلند ترنگے کی پرچم کشائی کرتے ہیں اور ملک کے لوگوں سے خطاب کرکے قومی پالیسیوں کا اعلان کرتے ہیں۔ یوم جمہوری (26 جنوری) کو اسی لال قلعہ کی فصیل سے صدر جمہوریہ بلند ترنگے کی پرچم کشائی کرتے ہیں اور شاندار پریڈ کی سلامی لیتے ہیں۔ اس مناسبت سے ریاستوں میں یوم آزادی پر وزرائے اعلیٰ پرچم کشائی کرتے ہیں، جب کہ یوم جمہوریہ پر گورنرز پرچم کشائی کرتے ہیں۔

پرچم کشائی کے بعد غروب آفتاب کے قبل پرچم کو اتارنا ضروری ہے۔ اس کی خلاف ورزی قابل گرفت ہے اور جرمانہ کے ساتھ ساتھ قید و بند کی حامل بھی ہے۔

قومی یا بین الاقوامی سانحات کے وقت سرکاری عمارتوں پر قومی پرچم جھکا دیا جاتا ہے۔ قومی ہیروز کے جسدِ خاکی پر یہی پرچم محیط رہتا ہے۔

قومی پرچم کا غلط استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی بے حرمتی قابل گرفت جرم ہے۔ اس کے لیے جرمانہ ہوسکتا ہے اور جیل بھی ہوسکتی ہے۔

ملکی اور بین الاقوامی تقریبات کے موقع پر اس قومی پرچم کی موجودگی سے ہماری اہمیت اور شناخت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بین الاقوامی کھیل تقریبات میں ہندوستان شائقین قومی پرچم لہرا کر کھلاڑیوں کو جوش دلاتے ہیں۔

یوں یہ ہمارے لیے ایک محرک (Motnator) بھی ہے۔ فتح یاب کھلاڑیوں کی ملک میں جب واپس ہوتی ہے تو قومی پرچم کے ساتھ ان کا استقبال ہوتا ہے۔ ملکی مہمات کے وقت بھی قومی پرچم کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ شمالی اور جنوبی قطبین سے لے کر ایورسٹ کی چوٹی تک اس قومی پرچم کی موجودگی ایک حقیت ہے۔

ہمارا اگلا قدم چاند پر پڑنے والا ہے۔ وہاں بھی ترنگا کے جلد ہی لہرانے کا امکان ہے۔ یوں، یہ ایک استعارہ ہے، جس سے مراد ملک کی روح ہے۔ آبی اور زمینی خطے سے عبارت ہندوستان کی جان اس قومی پرچم میں نہاں ہے۔

ہمارا قومی پرچم ہماری سرفرازی اور سربلندی کا ضامن ہے۔ یہ ملک کے لوگوں کو ایک اٹوٹ بندھن میں رکھنے کا وسیلہ ہے۔ بہاری، بنگالی، مدراسی، گجراتی ہوتے کے باوجود ہم سب اوّل تا آخر ہندوستانی ہیں، اور یہی ہمارا قومی پرچم، ہمارے تمام تر اختلافات کے باوجود یہی ترنگا ہے، جسے ہم سلام کرتے ہیں اور جس کے تحفظ کا عہد کرتے ہیں۔

□

Azim Iqbal, Adbistan, Ganj No 1
Betiah : 845438

ڈاکٹر ہمایوں اشرف

آہ! وہاب اشرفی، ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے

آہ استادِ محترم وہاب اشرفی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ موت کی بے رحم درانتی نے ان کو بھی اپنی کھردری گرفت میں لے لیا۔ وہ پس دیوارِ حیات چلے گئے۔ اردو کے علمی، ادبی اور تہذیبی افق پر ہمہ وقت روشنی بکھیرنے والا ایک قطبی ستارہ غروب ہوگیا۔ ان کی رحلت علم وادب کا ایک ایسا خسارہ ہے جس کی تلافی مستقبل قریب میں ممکن نظر نہیں آتی۔ ہندوپاک میں انگلیوں پر گنے جانے والے چند افراد ہیں جنھیں بحیثیت نقاد وہ ادبی وقار، مقبولیت اور شہرت حاصل ہے۔ وہاب اشرفی ان ہی چند ممتاز اور منفرد نقادوں میں ایک تھے۔ ان کی متعدد حیثیتیں تھیں۔ ممتاز ومنفرد نقاد، محقق، افسانہ نگار، شاعر، صحافی، استاد، دانشور، اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور اور مطالعے کی وسعت اور شدت نیز نئی کتاب تک پہنچنے کی سعی ان کی سرشت بن چکی تھی۔ مشرقی ومغربی ادبی تصورات، خیالات اور شعریات کے سلسلے میں اَپ ٹو ڈیٹ رہنے کی جو لگن رکھتے تھے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ میں گزشتہ 25 برسوں سے ان کے انتہائی قریب تھا اور مسلسل ان کے علمی وادبی کاموں میں معاونت کرتا رہا ہوں۔ حیرت انگیز طریقے پر وہ جسمانی کمزوری کے باوجود گھنٹوں Dictation دینے پر قادر تھے۔ لکھتے لکھتے میں تھک جاتا لیکن وہ شکست ماننے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ کھانے کا وقت ہے بلکہ ٹیبل پر چیزیں لگا بھی دی گئی ہیں لیکن وہ بے نیازانہ املا کروانے میں مصروف ہیں۔ یہاں تک کہ گھر والے واقعتاً الجھن کا شکار ہوجاتے۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ دو سال پہلے انھیں Intestine کی ٹی بی ہوگئی تھی۔ پیٹ کی داہنی جانب ایک گولا سا بن گیا تھا۔ تشخیص محال ہو رہی تھی۔ اپولو اور ایمس کا چکر تھا۔ ڈاکٹر تذبذب میں تھے کہ کیا انھیں آنتوں کا کینسر ہے۔ اب بائیپسی ہونی تھی سو ہوئی۔ ابھی نتیجہ سامنے نہیں آیا تھا۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ گھر کے دوسرے لوگ بھی تھے۔ سب خاموش، متوقع نتیجے کی ہولناکی انھیں خاموش کیے ہوئے تھی۔ ٹیکسی کچھ دور آگے بڑھی تو انھوں نے سکوت یوں توڑا کہ کناٹ پلیس چلیے۔ میں نے بھی پوچھا، وہاں کیوں؟ ایک کتاب کی دکان بک ورم ہے، وہاں مجھے کچھ کتابیں دیکھنی ہیں۔ ہم لوگ ایک دوسرے کا منھ تکنے لگے۔ بہرحال موصوف بک ورم میں داخل ہوئے۔ اپنی تمام تر جسمانی کمزوریوں کے ساتھ ایک چھوٹے سے ٹیبل پر بیٹھ کر چار کتابیں منتخب کیں۔ سبھی باہر کی، ظاہر ہے کہ ان کی قیمتیں بہت تھیں۔ اسپتال کے صرفے سے بے نیاز وہ کتابوں کے حصول میں لگ گئے۔ کل اسپتال والے کیا رپورٹ دیں گے اس سے قطعی لاتعلق۔

دراصل وہاب اشرفی بنیادی طور پر Academician اور دانشور تھے۔ ان کی ادبی دلچسپیاں گوناگوں اور متنوع قسم کی تھیں۔ اور ان کا ادبی کینوس بھی بہت وسیع۔ انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ اس وادی میں بھی سیر کی جہاں کے تصور سے بھی بعضوں کے حوصلے پست ہوسکتے ہیں۔ جو کام اب تک اکیڈمیاں نہیں کرسکیں وہ اکیلے انھوں نے سرانجام دیا۔ قاموسی کتاب 'تاریخ ادبیات عالم' کی سات ضخیم جلدیں اور 'تاریخ ادب اردو' کی

تین ضخیم جلدیں اس کی بین مثالیں ہیں۔ ان کا قاموسی ذہن بنیادی نکات کی گرفت میں اتنا فعال تھا کہ حیرت ہوتی ہے۔ وہ اکثر لوگوں کے نام بھول جاتے تھے لیکن ان کے کام کو نہیں۔

مجھے اس کا تجربہ تو اکثر ہوا کہ کس کتاب میں کیا پڑھ رکھا تھا وہ ان کے ذہن کے نہاں خانوں میں ہمیشہ محفوظ رہا۔ مصنف سے زیادہ تصنیف اور اس کے Content انھیں یاد رہتے تھے۔ میں نے یہ باتیں اس لیے قلم بند کیں کہ ان کی کتابوں کی بوقلمونی اور ان کے کام کی وسعت کا ایک پس منظر سامنے آجائے۔

بہر حال اب تک ان کی پچاس سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری اور افسانہ نویسی سے کیا تھا۔ انھوں نے تقریباً 45 کہانیاں لکھیں۔ میں نے حال ہی میں مختلف رسائل میں بکھری ہوئی ان کی کہانیوں کو یکجا کر کے ایک بھرپور مقدمہ کے ساتھ 'کافر بھی ہوئے سجدہ بھی کیا' کے عنوان سے شائع کرادیا ہے۔ انھوں نے مختلف اوقات میں رسالہ 'صنم' (پٹنہ)، نئی قدریں (رانچی) اور 'مباحثہ' (پٹنہ) کی ادارت بھی کی۔ ماہنامہ 'صنم' کی پرانی فائلیں خصوصاً 'بہار نمبر' اور 'افسانہ نمبر' ان کی مدیرانہ صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔ ادھر گزشتہ بارہ سالوں سے ان کی ادارت میں 'مباحثہ' نکل رہا تھا۔ اس کا شمار سنجیدہ ادبی رسائل میں ہوتا ہے۔ خاکسار کی شمولیت 'مباحثہ' میں معاون مدیر کی حیثیت سے رہی ہے۔ آخری لمحے تک مرحوم یہ ہدایت دیتے رہے کہ 'مباحثہ' کو جاری رکھنا۔ اسے بند نہیں ہونے دینا۔ لہٰذا انشاءاللہ یہ جاری رہے گا۔

وہاب اشرفی کی موت کسی سانحۂ عظیم سے کم نہیں۔ اسی لیے ملک کے تمام حلقوں اور دانش گاہوں میں تعزیتی جلسوں کا سلسلہ جاری ہے۔ اخبارات و رسائل میں انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا جارہا ہے۔ ان کی علمی، ادبی، فکری، انتظامی اور تعلیمی خدمات کا ذکر بڑی شدت سے ہورہا ہے۔ وہاب اشرفی نے ایک سرگرم علمی اور ادبی زندگی بسر کی اور آخری لمحے تک علم و ادب سے رشتہ برقرار رکھا۔ پچھلے کئی مہینوں سے وہ بیمار چل رہے تھے۔ مظہر امام اور شہریار کی دفات سے وہ ٹوٹ چکے تھے۔ ادھر مختلف امراض نے انھیں گھیر رکھا تھا۔ حال ہی میں میدانتا اسپتال، گڑگاؤں میں انھیں پیس میکر لگا تھا۔ اسپتال سے چھٹی پاکر وہ گھر لوٹ آئے۔ کچھ دنوں بعد طبیعت پھر ڈانواڈول ہونے لگی تو انھیں اپولو، دہلی میں علاج کے لیے داخل کیا گیا۔ وہاں وہ ICU میں تھے۔ ان کی حالت غیر تھی لیکن وہ NCPUL کی ایک اہم میٹنگ میں شرکت کو جانے کے لیے بضد تھے۔ ڈاکٹر نے اس کی اجازت نہ دی تو وہ اپولو سے نام کٹوا کر میٹنگ میں شمولیت کو NCPUL پہنچ گئے۔ اور پھر تیسرے دن وطن واپس لوٹ آئے۔ دو دن بعد پھر حالت بگڑ گئی۔ اروند اسپتال، پٹنہ میں داخل کیا گیا۔ وہاں نہیں سنبھلے تو IGMS پٹنہ میں منتقل کیا گیا جہاں انھوں نے 14 جولائی کی شب 3 بجے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

ابدی نیند سونے تک وہ ذہنی طور پر بیدار رہے۔ مجھے اس روز تقریباً 12 بجے دن میں فون کیا اور فرمایا کہ مجھے آپ سے بہت ساری باتیں کرنی ہے۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ جلد پہنچیے۔ میں ہزاری باغ سے روانہ ہوکر رات ساڑھے دس بجے ان کے پاس پہنچا۔ اس عالم میں بھی وہ علم و ادب کی گفتگو کرتے رہے۔ نہایت نحیف آواز میں فرمایا کہ 'تاریخ ادب اردو' کی چوتھی جلد کا کام نوے فیصد کر چکا ہوں۔ اسے مکمل کر کے چھپوا لینا اور دیگر ادھورے پڑے کاموں کی تکمیل بھی تم ہی کر سکتے ہو۔ انگریزی مضامین والی کتب بھی چھپ سکتی ہے۔ اس لیے کہ میں نے اسی عالم میں مزید تین مضمون انگریزی میں لکھ کر افروز (ان کے دوسرے صاحب زادے افروز اشرفی) کے حوالے کر دیا ہے اس سے لے لینا اور سیمینار کے مقالات کا کیا ہوا؟ دراصل اسی سال ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں پٹنہ کے اے این سنہا انسٹی ٹیوٹ کے وسیع ہال میں ''جشن وہاب اشرفی'' منایا گیا تھا۔ اس میں پڑھے گئے مقالات کو کتابی شکل میں شائع کرانے کے لیے وہ ادھر پیہم اصرار کر رہے تھے۔ کتاب کی کمپوزنگ ہوچکی تھی اور وہ پروف ریڈنگ کے مرحلے میں تھی۔ جلد ہی اس کی اشاعت متوقع تھی۔ گزشتہ ماہ ان کی دو کتاب 'معنیٰ کا مسئلہ' اور 'نسائی ادب اور اس کا عالمی منظر نامہ' اور رسالہ 'مباحثہ' کا 39 واں شمارہ طباعت کے لیے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی کو بھیجی تھی۔ 'معنیٰ کا مسئلہ' کی چند جلدیں وہ اپنے ساتھ دہلی سے لائے۔ نسائیت والی کتاب اور 'مباحثہ' کا تازہ شمارہ ناشر نے دو دن قبل ڈاک سے روانہ کیا تھا جس کی دید کی حسرت لیے وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ وہاب اشرفی کا نام ہمہ جہت ادبی خدمات سے متصف ایک روشن نام ہے۔ افسانہ نگاری سے دشت کش ہوکر وہ تحقیق و تنقید کی جانب مائل ہوئے اور بہت جلد اس میدان میں اپنی جگہ بنالی۔ جیسے جیسے ان کا افق علم منور ہوتا چلا گیا، ان کی شخصیت کی شاخیں ثمردار ہوتی گئیں اور ان کی شخصیت کا شجر جھکتا چلا گیا۔ ان کے انکسار میں اضافہ ہوتا گیا۔

ان کی پہلی تصنیف 'قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ' ہے جس میں انھوں نے زبان اردو کے ایک کلاسک کی تفہیم جدید تنقیدی معیاروں پر کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش بارآور ہوئی۔ اس کے بعد 'سیر اردو'، 'قدیم ادبی تنقید'، 'شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری'، 'معنی کی تلاش'، 'کہانی کے روپ'، 'نقوش ادب'، 'مثنویات میر کا تنقیدی جائزہ'، 'مثنوی اور مثنویات'، 'کاشف الحقائق'، 'سہیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے'، 'پطرس اور ان کے مضامین'، 'راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری'، 'کاشف الحقائق - ایک مطالعہ'، 'تفہیم البلاغت'، 'بہار میں اردو افسانہ نگاری'، 'آگہی کا منظر نامہ'، 'تاریخ ادبیات عالم' (سات جلدیں)، 'مابعد جدیدیت- مضمرات و ممکنات'، 'مجروح سلطان پوری' (مونوگراف) 'معنی سے مصافحہ'، 'قصہ بے سمت زندگی کا' (خودنوشت) 'تاریخ ادب اردو' (تین جلدیں)، 'معنیٰ کی جبلت'، 'اردو فکشن اور تیسری آنکھ'، 'حرف حرف آشنا'، 'قاضی عبدالودود' (مونوگراف)، 'نئی سمت کی آواز'، 'تفہیم فکر و معنی'، 'در پس آئینہ'، 'مغربی و مشرقی شعریات'، 'مارکسی فلسفہ'، 'اشتراکیت اور اردو ادب'، 'معرکہ'، 'میرا مطالعۂ قرآن'، 'کافر بھی ہوئے سجدہ بھی کیا'، 'معنی کا مسئلہ'، 'نسائی ادب اور اس کا عالمی منظر نامہ' اور کلیم الدین احمد کا مونوگراف یکے بعد دیگرے منظر عام پر آئیں۔

وہاب اشرفی کی تمام نگارشات میرے مطالعے میں رہی ہیں۔ مجھے ان سے کئی سطحوں پر قربت بھی رہی ہے۔ ان کی تنقیدی و تحقیقی کتابوں نیز منتخب مقالات پر سیر حاصل گفتگو ہونی چاہیے۔ ان کے پھیلے ہوئے کام پر طائرانہ نگاہ ڈالنا دقت طلب بھی ہے اور کافی وقت بھی چاہتا ہے جو کہ فی الوقت ممکن نہیں۔ لیکن یہ کام مجھے ہی کرنا ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی کروں گا۔

وہاب اشرفی نے اردو ادب کے قدیم و جدید سرمائے کا باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ جہاں ایک طرف اردو کے قدیم و جدید ادب سے واقف تھے۔ وہیں دوسری طرف انگریزی، فارسی اور سنسکرت شعریات و ادب سے بھی آشنا تھے۔ ان کی وسعت مطالعہ نے ان کی تنقیدی فکر میں ایک وزن و وقار اور گہرائی اور گیرائی کی کیفیت پیدا کردی تھی۔ وہ کسی بھی فن پارے کا مطالعہ غیر مشروطیت کے ساتھ کرتے۔ وہ مختلف ادبی روایت اور ادب میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں و تغیرات سے خائف

نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کا استقبال کرتے تھے۔ اسی لیے وہ عالمی سطح پر ہونے والی فکری وتنقیدی تبدیلیوں سے باخبری پر زور دیتے رہے۔ ان کا تعلق کسی بھی دبستان فکر ونقد سے کبھی براہِ راست نہیں رہا۔ وہ ہرادبی روایت کواحترام کی نگاہ سے دیکھتے اوراپنی تنقیدیوں میں عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں سے استفادہ کرتے تھے۔ وہاب اشرفی ادب وفن کے تجزیہ وتنقید میں کسی مخصوص رجحان یا مکتبۂ فکر کی پابندی کو مستحسن نہیں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے خیالات کوکبھی کسی فارمولائی پروگرام کا اسیرنہیں بنایااور نہ ہی نئے نظریات وتجربات کورد کیا۔ بلکہ غور وفکر کے بعد اگرانھیں اس میں کوئی خوبی نظر آئی تو اس سے استفادہ بھی کیا۔ وہ ادب کو بدلتی ہوئی قدروں سے ہم کنار کرنے کے جو یا رہے کیونکہ اس سے ادب میں تازگی، جدت اور شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔

وہاب اشرفی ادب کی افہام وتفہیم عالمی معیار پر کرتے ہیں۔ وہ مشرقی اور مغربی دونوں سرچشموں سے فائدہ اٹھاتے اورفن پاروں کی تفہیم وسیع تناظر میں کرنے کے آرزومند رہتے اور اس کا رشتہ عالمی ادب سے قائم کرنے کی سعی بھی کرتے تھے۔ انھوں نے مابعد جدید فکر اوراس کی صورت حال پر باضابطہ ایک کتاب ہی لکھ ڈالی 'مابعد جدیدیت: مضمرات وممکنات'۔

'مغربی و مشرقی شعریات' پر وہاب اشرفی کی نظر

شمیم طارق

Poetry اور Poetics یعنی شاعری اور شعریات ایک دوسرے سے ہم رشتہ تو ضرور ہیں مگر اس ہم رشتگی کے باوجود ان کو ایک سمجھنا صحیح نہیں ہے، شعریات کا ایک مستقل دائرہ ہے جس کا تعلق مطالعۂ شاعری یعنی ان سوالوں سے ہے کہ شاعری کیا ہے اس کا شعور ووجدان سے کیا رشتہ ہے؟ لفظ ومعنی میں ہم رشتگی کی کیا حدود ہیں؟ اچھی یا بری شاعری کیا ہے؟ شاعری میں آہنگ، عروض اور موسیقی کی کیا اہمیت ہے؟ کیا شعر کہنے، سننے یا پڑھنے والے کے ذہن میں کسی شعر کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں؟......وغیرہ۔ قدیم وجدید اور مغرب و مشرق کے حوالے سے مطالعۂ شاعری کی حدود اتنی وسیع ہوچکی ہیں کہ اب شعریات کے مکمل مفہوم کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہماری زبان کے ایک اہم نقاد، پروفیسر وہاب اشرفی کو بھی اس حقیقت کا احساس تھا کہ ''شعریات کی نہ کوئی تعریف ممکن ہے اور نہ ہی اس کی ایسی حد بندی جس کے خطوط ہمیشہ کے لیے متعین ہوجائیں'' (ص17) اس کے باوجود انھوں نے نہ صرف یہ کہ شعریات کے وسیع تر مفہوم کی وضاحت وتفہیم کے لیے ایک مکمل کتاب لکھی ہے بلکہ شعریات میں بھی مغرب و مشرق کی شعریات پر الگ الگ بحث کی ہے۔

مغرب میں شعریات سے مراد وہ عمل ہے جو انسان سے سرزد ہوتا رہتا ہے۔ مصنفین کی نگارشات کا بھی اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور ان میں وہ نکات ابھارے جاتے ہیں جو بنیادی حیثیت واہمیت کے حامل ہوتے ہیں لیکن اس بحث میں اس کے ضمنی نکات نظرانداز نہیں کیے جاتے۔ شعریات کی بحث میں غیرذاتی تھیوری کی بھی شمولیت ہے اور عینی وعقلی ضابطوں کی بھی۔ کہیں کہیں اس نکتے کو بھی اجاگر کیا گیا ہے کہ شعریات سے ادبی ڈسکورس کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ مشرق میں شعریات کی بحث نہ صرف یہ کہ بہت قدیم ہے بلکہ متنوع بھی ہے۔ اس میں لفظ ومعنی کے رشتوں کی بحث کے ساتھ علم البلاغت کی صنعتوں اورطرز واسلوب کی بحث بھی شامل ہے۔

مغرب ومشرق یا مغرب ومشرق کی مختلف زبانوں کی شعریات پر گفتگو کے دوران کبھی اشتراک کا پہلو ابھرتا ہے اور کبھی اختلاف کا۔ اس پس منظر میں اس حقیقت کا ادراک مشکل نہیں ہے کہ مغربی ومشرقی شعریات کو موضوع بنا کر کوئی کتاب لکھنے اور اس کتاب میں یونانی، اطالوی، لاطینی، عبرانی، جرمن، فرانسیسی، اسکیڈ نیویائی، انگریزی، سنسکرت، عربی، فارسی، ترکی، چینی، جاپانی، روسی، مارکسی، مراٹھی، تلگو، تامل، ملیالم، کنڑ، اردو، بنگلہ، ہندی، تانیثی شعریات کی تفہیم ووضاحت کرنے کی ہمت وہی جٹا سکتا تھا، کوہ کنی جس کی صفت ہو۔

پروفیسر وہاب اشرفی نے جو اپنے وسیع مطالعے اور تنقیدی نگاہ کے لیے ادبی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں نہ صرف 'کوہکنی' کا مظاہرہ کیا بلکہ 'جوئے شیر' لانے میں بھی کامیاب ہوئے۔ انھوں نے شعریات کے مفاہیم کو تجزیاتی اور تقابلی مطالعہ کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ:

''یہ کتاب مشرق ومغرب کی شعریات کے کلیدی مباحث کا کسی حد تک احاطہ کرلیتی ہے۔ میں نے اپنے مباحث میں تجزیاتی سے زیادہ وضاحتی اصول سامنے رکھے ہیں۔ مختلف افکار وخیالات کی گونج اس کتاب میں سنائی دے گی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ متعلقہ زبانوں کی شعریات کی تفصیل اگر سامنے آسکے تو اس کے کلیدی پہلو واضح ہوجائیں اور جہاں کہیں مقابلے کی صورت ہو اسے بھی روشن کیا جائے۔ میں نے جہاں کہیں سے کوئی اقتباس اخذ کیا ہے تو اس کی تفصیل دے دی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کتابوں کی بھی جن سے میں نے استفادہ کیا۔ میری کوشش یہ رہی ہے کہ مخارج صحیح صورت میں پڑھنے والوں کے سامنے ہوں۔ بعض انگریزی کے اقتباسات دینا میرے لیے ناگزیر ٹھہرا، اس لیے کہ چند باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ترجمے سے گنجلک ہوسکتی ہیں۔ میرا مقصد بس یہ رہا ہے کہ جو نکات پیش کیے جائیں وہ واضح ہوں، گنجلک نہ رہیں، مبہم نہ رہیں۔'' (ص18-9)

اس کتاب کے غیر معمولی ہونے کا اعتراف ضروری ہے اس کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ اردو تو کیا انگریزی میں بھی کسی ایک کتاب کا نام لینا آسان نہیں ہے جس میں مغربی ومشرقی شعریات کے وسیع اور متنوع مباحث کے مختلف پہلوؤں کو اس انداز سے روشن کیا گیا ہو کہ پڑھنے والوں کی یہ تلاش ختم ہوجائے کہ شعریات کیا ہے؟ اور وقت کے ساتھ مشرق ومغرب میں اس کے مفہوم میں کس درجہ وسعت پیدا ہوتی رہی ہے۔ اس کتاب کے بعض لفظوں، جملوں اور نکات پر بحث کی گنجائش ہے مگر یہ گنجائش بھی اس کتاب کی کامیابی ہی کہی جائے گی کہ اس سے پڑھنے والے کے تجسس میں اضافے کے ساتھ شعریات کی تفہیم کے نئے دریچے کھلتے ہیں اور یہ اپنے پڑھنے والوں کو شعریات کے مباحث اور نکات پر ایک سے زائد زاویوں سے سوچنے کی تحریک دلاتی ہے۔

وہاب اشرفی کے بہت سے امتیازات میں ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے بعض ایسے موضوعات پر کتابیں لکھیں جن پر اردو میں پہلے کسی اور نے طبع آزمائی نہیں کی۔ مثال کے طور پر 'تاریخ ادبیات عالم' (سات جلدوں میں) 'مغربی ومشرقی شعریات'، 'مارکسی فلسفہ، اشتراکیت اور اردو ادب'، 'تاریخ ادب اردو'، وغیرہ۔ ان کی کوئی دوسری نظیر اردو میں یا ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نہیں ملتی۔

وہاب اشرفی نے مغرب ومشرق کی شعریات پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے اپنی کتاب 'مغربی ومشرقی شعریات' میں مغرب کی بیشتر زبانوں کے ساتھ ساتھ مشرق کی اہم زبانوں پر بھی الگ الگ تجزیاتی مطالعے پیش کیے ہیں۔ مغربی شعریات میں یونانی، اطالوی، لاطینی، عبرانی، جرمن، فرانسیسی، اسکینڈ نیویائی اور انگریزی ادبیات کی شعریات کے نقوش ابھارے گئے ہیں تو مشرق کی سنسکرت، عربی، فارسی، ترکی، چینی، روسی، جاپانی، مراٹھی، تیلگو، تامل، ملیالم، کنڑ، اردو، بنگلہ اور ہندی زبانوں کی شعریات سے بحث کی گئی ہے اور مختلف عالمی زبانوں میں موجود شعری ادب کا ایک تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

وہاب اشرفی نے مختلف کتابوں پر تبصرے اور تقاریظ بھی قلم بند کیے ہیں۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً اتنے قیمتی تبصرے اور مقدمے لکھے ہیں جو بلامبالغہ بعض طویل مقالوں پر بھی بھاری ہیں۔ ان میں ایسے نکات ہیں جنھیں پھیلایا جائے تو پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ میں نے ان کے بکھرے ہوئے تبصرے، تقاریظ اور تنقیدی شذرات کو 'نکتہ نکتہ تعارف' اور 'شناخت اور ادراک معنی' نامی دو کتاب میں یکجا کر کے اپنے وقیع مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔

وہاب اشرفی نے اپنی منور شخصیت کا اور اپنی ذات کی تابناکی کا ذکر نہ کبھی کیا اور نہ کسی کے سامنے خود تعلی آمیز انداز میں اس کا اظہار کیا۔ ان کی مجلس میں گفتگو ہمیشہ علمی وادبی ہوتی اور وہ مشکل مسائل کو اپنے مطالعے کی روشنی میں سلجھاتے چلے جاتے۔

وہاب اشرفی کی قدر شناسی بھی خوب ہوئی۔ مختلف یونیورسٹیوں میں ان کی شخصیت اور علمی وادبی خدمات کے تناظر میں پی ایچ ڈی اور ایم فل کے لیے تحقیقی مقالے لکھے گئے۔ متعدد کتابیں مثلاً 'وہاب اشرفی کا ادبی سفر' (سرور کریم) 'وہاب اشرفی - شخصیت اور فن' (ڈاکٹر مناظر حسن، ممبر پارلیامنٹ، بیگوسرائے) 'وہاب اشرفی: منفرد نقاد اور دانشور' (ہمایوں اشرف) 'وہاب اشرفی کی تنقید نگاری' (ڈاکٹر محمد نسیم احمد) 'مابعد جدیدیت اور وہاب اشرفی (ڈاکٹر شہناز خاتون) 'مابعد جدیدیت: مضمرات و ممکنات- ایک جائزہ (ڈاکٹر منصور عمر) 'منظوم جائزے' (ڈاکٹر عبدالمنان طرزی) ('وہاب اشرفی کے افسانے' (ڈاکٹر احمد حسین آزاد)، 'وہاب اشرفی کی افسانہ نگاری' (ڈاکٹر محمد امجد حیات برق) وغیرہ شائع ہوچکی ہیں۔ 'کتاب نما'، 'استعارہ'، 'روشنائی'، 'تحریک ادب'، 'تمثیل نو' جیسے مقبول رسالوں نے ان پر خصوصی نمبر اور گوشے نکالے۔ انھیں متعدد انعامات واعزازات سے بھی نوازا گیا۔ 2007 میں ساہتیہ اکادمی کا پروقار ایوارڈ ملا۔ بھارتیہ بھاشا پریشد کا ایوارڈ 1994 میں صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں ملا۔ 1996 میں حکومت بہار کے محکمۂ راجبھاشا کا پروقار حضرت یحییٰ منیری ایوارڈ بھی انھیں ملا۔ اس کے علاوہ وہ سجاد ظہیر ایوارڈ (1985)، 'میر تقی میر ایوارڈ'، 'کلیم الدین احمد ایوارڈ'، 'پروفیسر شاہدی ایوارڈ'، 'غالب انعام برائے اردو نثر'، مجلس فروغ ادب ایوارڈ، دوحہ قطر اور سائنس اور کائنات سوسائٹی آف انڈیا کی جانب سے Son of the Soil ایوارڈ سے بھی سرفراز کیے گئے۔ ہندوستان کی متعدد اردو اکادمیوں نے بھی انھیں اپنے اولین انعامات دیے۔

وہاب صاحب اب نہیں رہے۔ افسوس کہ اب ہم ان کی شفقتوں سے محروم ہوگئے۔ ان کی باتوں میں جو خلوص اور شیرینی تھی وہ اب ہم تک نہیں پہنچ پائے گی۔ لیکن ان کی تحریریں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان تحریروں کو لکھتے ہوئے آج میری آنکھیں نم ہیں۔ لیکن ان نم آنکھوں میں بھی وہاب اشرفی صاحب کا چہرہ اسی طرح جھلک رہا ہے جیسا کہ چند دل قبل تک دیکھا تھا۔ حساس بشاش اور نورانی چہرہ، آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر نیم مسکراہٹ لیے ہوئے۔ بہت ہی نرم لہجہ، جیسے سرگوشیاں کر رہے ہوں اور سرگوشیاں صرف اپنوں کے بیچ ہی ہوتی ہیں۔ وہ اپنوں کے بیچ سے اٹھ کر چلے گئے۔ لیکن یہ سرگوشیاں تو زندگی بھر تنہائی کے ہر لمحہ میں ساتھ رہیں گی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

■

Dr. Humayun Ashraf, Assist. Prof. PG. Dept of Urdu, Vinoba Bhave University, Hazaribagh- (Jharkhand)

پروفیسر وہاب اشرفی

نام: سید وہاب اشرفی

قلمی نام: وہاب اشرفی

تاریخ پیدائش: 2 جون 1936، (بہ اعتبار میٹرک سرٹیفکیٹ)

تاریخ وفات: 16 جولائی 2012

مقام پیدائش: موضع بی بی پور (کاکو)، ضلع جہان آباد، صوبہ بہار

تعلیم: ایم اے (انگریزی)، ایم اے (اردو)، ایم اے فارسی، بی ایل، پی ایچ ڈی (اردو)

ملازمت: 3 ستمبر 1969 کو ان کا تقرر مگدھ یونیورسٹی کے معروف کالج، گیا کالج، گیا میں اردو کے لیکچرار کے عہدے پر ہوا۔ بعد میں مگدھ یونیورسٹی کے پی.جی ڈپارٹمنٹ میں 20 جولائی 1976 تک برسر روزگار رہے۔

تخلیقی سفر: (1) پہلے شعر کی تخلیق: 1955، اشاعت روزنامہ 'اخوت'، کلکتہ (2) پہلی غزل کی تخلیق: 1955، (3) پہلی غزل کی اشاعت 1955، (4) پہلی نظم کی تخلیق 1955، اشاعت 'ہند' روزنامہ کلکتہ (5) پہلی نظم کی اشاعت: 1955، (6) پہلی نثری تخلیق (افسانہ) کی اشاعت: 1958، عنوان: اپنی اپنی راہ' مطبوعہ 'بیسویں صدی' دہلی (7) پہلی تنقیدی تحریر کی اشاعت: 1956، عنوان: تاباں القادری کی شاعری مشمولہ 'نقوش تاباں' (8) پہلی تصنیف کی اشاعت: 'قطب مشتری: ایک جائزہ' 1967،

ادبی صحافت/ادارت: • رانچی کے شعبہ اردو کا مجلّہ 'نئی قدریں • 1959 میں پٹنہ سے ماہنامہ 'صنم'

چند اہم کتابیں: قطب مشتری: ایک تنقیدی جائزہ (تحقیق وتنقید)، قدیم ادبی تنقید (تنقید)، معنی کی تلاش (مقالات کا مجموعہ)، مثنوی اور مثنویات (ترتیب مع متن اور مقدمہ)، کاشف الحقائق (ترتیب مع متن و مقدمہ)، سہیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے (تنقید و ترتیب)، راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری (تنقید)، کاشف الحقائق - ایک مطالعہ (تنقید)، تفہیم البلاغت، بہار میں اردو افسانہ نگاری (افسانے مع مقدمہ)، آگہی کا منظرنامہ (مقالات کا مجموعہ، تاریخ ادبیات عالم (جلد اوّل تا جلد ہفتم) اردو فکشن اور تیسری آنکھ (مقالات کا مجموعہ، حرف حرف آشنا (مقالات کا مجموعہ)، مابعد جدیدیت: ممکنات ومضمرات

بشکریہ: ہمایوں اشرف

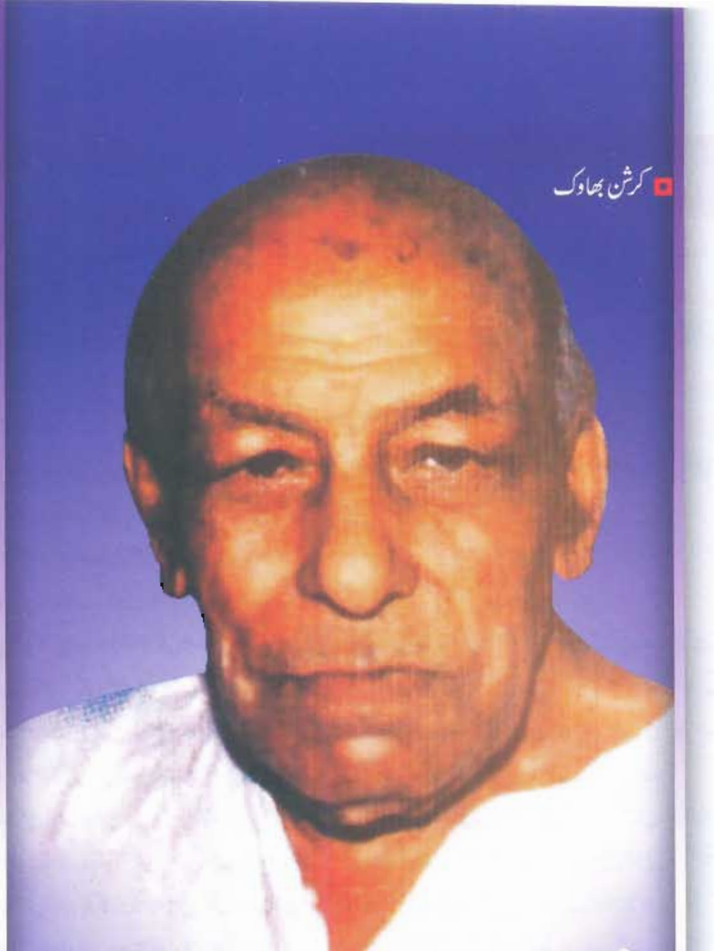

■ کرشن بھاوک

معین احسن جذبی کی یاد میں

12 اگست 1912 کے مبارک دن اس بلند واعلیٰ پایہ شاعر کی پیدائش قصبہ مبارک پور میں ہوئی تھی جو کہ یو پی کے ضلع اعظم گڑھ میں پڑتا ہے۔ ان کے ماجد والد احسن الغفور تھے، جو علی گڑھ سے بی اے کرنے کے بعد محڈن اسکولز کے سب ڈپٹی انسپکٹر کے عہدے پر بلیا میں تعینات کر دیے گئے تھے۔ وہاں سے ان کے عہدے میں ترقی کر کے انھیں ڈپٹی انسپکٹر بنا کر ان کا تبادلہ جھانسی شہر میں کر دیا گیا تھا۔ وہیں جذبی کا بچپن گزرا تھا۔ 1929 میں ہائی اسکول کرنے کے بعد ان کے والد نے ان کا داخلہ آگرہ کے سینٹ جانسن کالج میں کروا دیا تھا اور وہ اپنے ماموں میجر حبیب صاحب کے پاس بھوپال جا کر رہنے لگے تھے جو کہ ان دنوں نواب صاحب کے اے ڈی سی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انھیں کے رسوخ کی بدولت جذبی کا داخلہ دہلی کے اینگلو عربک Anglo Arabic کالج میں ہوگیا تھا۔ وہیں سے جذبی نے بی اے کی جماعت پاس کر لی تھی۔ اس کے بعد انھیں تلاشِ معاش کی فکر ہونے لگی۔ انھوں نے 1939 میں بمبئی، سکریٹریٹ میں ایک مترجم کی حیثیت سے اپنی پہلی نوکری شروع کی لیکن اس کے چار ماہ بعد ہی وہ بھوپال کے ایک ماڈل اسکول میں استاد مقرر ہوگئے تھے۔ وہاں بھی اپنی تلون آمیز فطرت کے موجب وہ زیادہ دیر نہ ٹک سکے اور نوکری چھوڑ آئے، لیکن دس ماہ بعد ہی انھیں لکھنؤ کی سکریٹریٹ میں دوسری ملازمت حاصل ہوگئی۔ یہ اور بات ہے کہ وہاں بھی وہ صرف دو تین ماہ ہی رہے۔

یہ وہ دن تھے، جب لکھنؤ سے اسرار الحق مجاز، علی سردار جعفری اور سید حسن 'نیا ادب' شائع کر رہے تھے۔ انھیں یاروں کی بدولت جذبی کا بھی رجحان ترقی پسند ادب کی جانب تیزی سے پروان چڑھتا چلا گیا تھا۔ 1941 میں علی گڑھ آ کر انھوں نے ایم اے کیا۔ اس کے بعد 1942 کے آخر میں وہ روزانہ اخبار 'آجکل' دہلی میں معاون مدیر کی حیثیت سے نوکری کرنے لگے۔ وہیں رہتے ہوئے اگست 1943 میں اخبار 'آجکل' کا جذبی نمبر بھی شائع ہوا تھا وہاں انھوں نے دو سال تک بڑے انہماک سے کام کیا تھا۔ اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انھوں نے 'حالی کا سیاسی شعور' موضوع پر مقالہ پیش کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری باعزت حاصل کر لی۔ 1945 سے ہی وہ اسی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بطور لیکچرر مقرر ہوئے اور 1974 میں بطور ریڈر اس عہدے سے سبک دوش ہوئے۔

ان کا نکاح بھوپال میں اپنی پھوپھی خاتون اکرم کی بیٹی سے ہوا تھا۔ 1875 کی بغاوت کے دنوں میں جذبی صاحب کے پردادا مولوی حمزہ علی داناپور (پٹنہ) چلے آئے تھے۔ وہاں آ کر وہ کچھ جائیداد خرید کر رہنے لگے تھے۔ ان کے فرزند ڈاکٹر عبدالغفور یعنی جذبی صاحب کے دادا ایک بلند پایہ شاعر تھے اور مطیر تخلص سے شاعری کیا کرتے تھے۔ ان کی لکھی مترادف الفاظ کی لغت عمدہ درجے کی ہونے پر بھی چند وجوہ سے شائع نہ ہو پائی تھی۔ جذبی کی مذکورہ پھوپھی خاتون اکرم بھی ایک نہایت ہی ذی علم و بلند پایہ ادبی ذوق والی تھی۔ ان کا نکاح دہلی کے مشہور و معروف ادیب راشد الخیری کے صاحب زادے رزاق الخیری سے ہوا تھا۔ یہ پھوپھی بذاتِ خود افسانے لکھا کرتی تھیں۔

مارکس سیاست پر مبنی تصنیف ہونے والے ادب کے بارے میں جذبی کا یہ متحکم خیال تھا کہ وہ مارکسی نظریے سے لکھے جانے والے ادب کی حمایت تو کرتے ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ حق پسندی پر مبنی غزلیں اور نظمیں لکھنے میں پورا یقین رکھتے ہیں۔ کیونکہ کسی بھی غزل یا نظم میں ہر ایک مسئلے کا حل پیش کرنا نہ تو لازمی ہوتا ہے اور نہ ہی ممکن۔ انھوں نے اپنی شاعری کے اول مجموعہ 'فروزاں' کے دیباچے 'چند باتیں' کے تحت مارکس کے فلسفے کے مطابق چلنے والی تحریک کی پیروی کرنے والے ادیبوں پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''وہ صرف جانتے ہیں کہ یہ ہماری جماعت کی پالیسی ہے اور اس لیے صحیح بھی ہے۔ اس رویے سے ایک قسم کا ادبی انتشار پیدا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر 1947 کا زمانہ لیجیے، جب ہندوستان آزاد ہوا تھا اس وقت بعض شاعروں نے اپنی جماعت کی پالیسی کے مطابق آزادی کی مدح میں نظمیں لکھیں۔ لیکن چند ماہ بعد جب ان کی جماعت کی پالیسی تبدیل ہوئی، تو یہی شاعر فریب آزادی کے عنوان سے نظمیں لکھنے لگے۔ یہ نظمیں پہلی نظموں کی طرح بے جان تو نہ تھیں، لیکن پڑھنے والے یقیناً اس چکر

معین احسن جذبی کے منتخب کلام

دل کو ہونا تھا جستجو میں خراب
پاس تھی ورنہ منزلِ مقصود
تیری رسوائی کا ہے ڈر ورنہ
دل کے جذبات تو نہیں محدود
دلِ ناکام تھک کے بیٹھ گیا
جب نظر آئی منزلِ مقصود
تیرے جلووں کی حد ملی تو کب
ہوگئی جب نظر بھی لامحدود

(1929)

زندگی اب زندگی کی داستانوں میں نہیں
بجلیوں کا سوز شاید آشیانوں میں نہیں
جس کو کہتے ہیں محبت جس کو کہتے ہیں خلوص
جھونپڑوں میں ہو تو ہو پختہ مکانوں میں نہیں
خونچکاں آنکھوں پہ دھوکا ہے خمارِ عشق کا
حیف اے ساقی کہ تو بھی رازدانوں میں نہیں
ٹھہر تو مطرب! وہ آئی اک صدائے دردناک
آہ مطرب! کچھ مزہ اب تیری تانوں میں نہیں
یوں بھی سنتا ہوں ترانے غم کے بزمِ اشک کے
جیسے کوئی بات ہی غم کے ترانوں میں نہیں
اب کہاں ہیں ڈھونڈنے جاؤں سکوں کو اے خدا
ان زمینوں میں نہیں ان آسمانوں میں نہیں
وہ غلامی کا لہو جو تھا رگِ اسلاف میں
شکر ہے جذبی کہ اب ہم نوجوانوں میں نہیں

(1939)

بیتے ہوئے دنوں کی حلاوت کہاں سے لائیں
اک میٹھے میٹھے درد کی راحت کہاں سے لائیں
ڈھونڈیں کہاں وہ نالۂ شب تاب کا جمال
آہ سحر گہی کی صباحت کہاں سے لائیں
سمجھائیں کیسے دل کی نزاکت کا ماجرا
خاموشی نظر کی خطابت کہاں سے لائیں
ترکِ تعلقات کا ہو جس سے احتمال
بیباکیوں میں اتنی صداقت کہاں سے لائیں
افسردگی ضبطِ الم آج بھی سہی
لیکن نشاطِ ضبطِ مسرت کہاں سے لائیں
ہر فتح کے غرور میں بے وجہ بے سبب
احساسِ انفعالِ ہزیمت کہاں سے لائیں
آسودگی لطف و عنایت کے ساتھ ساتھ
دل میں دبی دبی سی قیامت کہاں سے لائیں
وہ جوشِ اضطراب پہ کچھ سوچنے کے بعد
حیرت کہاں سے لائیں، ندامت کہاں سے لائیں
ہر لحظہ تازہ تازہ بلاؤں کا سامنا
نا آزمودہ کار کی جرأت کہاں سے لائیں
ہے آج بھی نگاہِ محبت کی آرزو
پر ایسی اک نگاہ کی قیمت کہاں سیلائیں
سب کچھ نصیب ہو بھی تو اے شورشِ حیات
تجھ سے نظر چرانے کی عادت کہاں سے لائیں

(1950)

میں پڑ گئے کہ پہلی بات درست ہے یا دوسری؟ میرا خیال ہے کہ اگر ابتدا ہی میں اپنے دل و دماغ سے کام لیتے اور اپنے ذاتی ردعمل پر بھروسہ کرتے، تو شاید یہ تضاد نہ پیدا ہوتا۔ سیاست میں مصلحت کو بہت کچھ دخل ہے، لیکن مصلحت پر شعر کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ مصلحت میں جزوی صداقت ہوتی ہے۔ شاعری کامل صداقت چاہتی ہے اور اس کامل صداقت ہی سے وہ جذبہ پیدا ہوتا ہے، جو شعر کی جان ہے۔ مصلحت کی بنا پر جب بھی کچھ کہا گیا ہے، اسے ادب کے بجائے صحافت کے دامن ہی میں جگہ ملی ہے۔ آج کچھ کہنا اور کل اس کی نفی کردینا صحافت میں تو ممکن ہے، شعر و ادب میں نہیں۔ شعر و ادب کے لیے ایک مربوط نظام فکر کی ضرورت ہے، ایسا نظام فکر جو عقیدہ بلکہ ایمان بن چکا ہو۔''

اس لمبے اقتباس سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ جذبی صاحب سیاسی کلابازیوں کی بہ نسبت اپنے کلام کو بیشتر شاعری کے فن تک ہی محدود رکھنے کے حق میں تھے۔ ساہتیہ اکادمی دہلی سے جذبی صاحب کا 'کلیاتِ جذبی' نام سے پہلا اڈیشن 2000 میں شائع ہوا تھا، اس میں اوّل مجموعہ 'فروزاں' جس کا پہلا اڈیشن 1943 میں اور دوسرا 1951 میں شائع ہوا تھا، اس کے علاوہ دوسرے مجموعہ 'سخن مختصر' کا پہلا ایڈیشن 1960 میں شائع ہوا تھا، ان دونوں مجموعوں کی غزلوں و نظموں کو بھی شامل کرتے ہوئے 1985 میں شائع ہونے والے تیسرے مجموعہ 'گدازِ شب' کے تمام کلام کو بھی سمیٹنے کی سعی فرمائی گئی ہے۔

شروع میں 'فروزاں' کے دوسرے ایڈیشن میں شامل پیش گفتار 'چند باتیں' کو ایک تو قارئین کی مصلحت کے زیرِ خیال دیا گیا ہے، دوسرے ایسا کرنے سے ہم وقت کے تناظر میں شاعر کے رشتے کو بھی ان کی شاعری کا تفصیل سے مطالعہ کرتے ہوئے اپنے ذہن میں رکھ کر اس سے مستفید ہوسکتے ہیں۔ جذبی کے ناقدین نے ان پر ہمیشہ مایوسی اور نفی آمیز خیالات کا ہی اظہار کرتے رہنے کا جو الزام لگایا ہے، اس کی صداقت گو بحث طلب ہوسکتی ہے، لیکن اس میں دو طرح کے تاثرات ہر چند نہیں ہوسکتے ہیں ان کی بیشتر شاعری میں ان کے صاف شفاف و مستحکم عقیدوں کے غماز اشعار کا فقدان قطعی نہیں رہا ہے۔

ڈاکٹر مسعود علی بیگ نے اپنے مضمون 'جذبی کا فن: ایک مختصر جائزہ' کے آغاز میں ہی بہت صحیح فرمایا ہے کہ ''کسی بھی فطری شاعر کا فن اس کے امتیازات، ترجیحات اور اس طریقِ کار سے نمو پاتا ہے۔ انہیں کے ذریعے ہم فنکار کے بنیادی کردار کو پہچان سکتے ہیں۔ تعینِ قدر کے عام رجحانات میں نام سازی، درجہ بندی تاریخی پس منظر اور زمانی حوالوں پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ فن کی حیثیت ضمنی ہوجاتی ہے۔

جذبی اور ان کے بعض اہم معاصرین کے سلسلے میں جو توضیحات اور تجربے سامنے آئے ہیں، ان میں بیشتر اسی نوع کی کوشش ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم کسی تخلیق میں فکری بالیدگی، لسانی حسن، نیز موضوعی سطح پر طرزِ احساس اور اقدار کی اس انوکھی تنظیم کو دیکھ سکیں، جس کے سبب فنکار ایک بڑے Spectrum کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اپنا انفرادی وجود رکھتا ہے یا کم از کم اسے خود اس کے شعری صور اور تجربے کے حوالے سے جانیں۔'' (معین احسن جذبی: شاعر اور دانشور، ص125)

جذبی صاحب کی شاعری میں ناامیدی و مایوسی کی انتہا دیکھ کر بعض نقاد زندگی میں ان کے فلسفہ قنوطیت ہی پروسنے اور ان کی شاعری میں نفی و انکار کے جذبوں کی افراط ہونے کا الزام لگا سکتے ہیں، لیکن اس کے عین برعکس ان کی شاعری امید پرستی اور رجائیت پسندی کی بھی گاہے بگاہے نظیریں پیش کرتی رہتی ہے۔ اسی خیال کی توثیق اور تائید میں بے شمار اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً چند نمونے آگے قابلِ غور ہیں:

1. فسردگی تو نہ تھی بے سبب مگر جذبی
ہم اپنے ڈوبتے دل کو ابھارتے ہی رہے
(کلیاتِ جذبی، ص159)

2. ہم اس امید پر نکلے ہیں ظلمتِ شب میں
چراغ کوئی سرِ رہگذار بھی ہوگا
(ایضاً، ص158)

3. کبھی تمازتِ خورشید بھی تو کم ہوگی
کہیں تو سایۂ ابرِ بہار بھی ہوگا
(ایضاً، ص157)

4. ہم گمرہانِ شوق کا عالم نہ پوچھیے
منزل سے دور بھی سرِ منزل رہے ہیں ہم
(ایضاً، ص143)

5. زندگی ہے تو بہرحال بسر بھی ہوگی
شام آئی ہے تو آئے کہ سحر بھی ہوگی
(ایضاً، ص142)

6. تاریک رات اور بھی تاریک ہوگئی
اب آمد آمدِ مہِ روشن قریب ہے
(ایضاً، ص124)

7. اسی سے غازۂ روئے جہاں بنے گا کبھی
رُخِ حیات پہ جو گرد ہے تباہی کی
(ایضاً، ص123)

8. 'شکست و فتح نصیبوں سے' اب نہیں جذبی
کہ آج ہے دلِ ہر ناتواں میں عزم و یقیں
(ایضاً، ص113)

9. گیسوئے شاہدِ گیتی میں پر و کر موتی
کوئی دیوانہ بہت دادِ جنوں پائے گا
(ایضاً، ص111)

10. اب زندہ رہنے کی پرزور تمنا ملاحظہ کیجیے:
خواہشِ مرگ مرے سینے میں ہونے لگی ذبح
ڈوبتے دل نے دعا مانگی کہ کچھ اور جیے
(ایضاً، ص109)

11. دل میں کچھ سوزِ تمنا کے نشاں ملتے ہیں
اِس اندھیرے میں اُجالے کے سماں ملتے ہیں
(ایضاً، ص104)

12. پہلے مجموعے 'فروزاں' کے اوّل ایڈیشن میں انتساب والے صفحہ پر درج یہ شعر بھی جذبی کی زندگی کی بابت اُن کی خود اعتمادی پر گویا ایک مضبوط مہر چسپاں کرتا ہے:
ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار
ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں
(ایضاً، ص106)

معین احسن جذبی کی منتخب نظمیں

چشمِ سوال

ہاں اے غریب لڑکی تو بھیک مانگتی ہے
چشمِ سوال تیری کچھ کہہ کے جھک گئی ہے
تو بھیک مانگتی ہے شرم و حیا کی ماری
اور سر سے لے کے پا تک ہے کپکپی سی طاری
آنکھوں میں ہے نمی سی، آئینہ سی جبیں ہے
تجھ کو گداگری کی عادت ابھی نہیں ہے
قسمت میں گیسوؤں کی آئینہ ہے نہ شانہ
شاید تری نظر میں تاریک ہے زمانہ
یہ تیرا جسمِ نازک بوسیدہ پیرہن میں
جیسے گلِ فسردہ اجڑے ہوئے چمن میں

—

جھک جائیں تیرے آگے شیطان کی نگاہیں
پرکھا رہے ہیں تجھ کو انسان کی نگاہیں
پاکیزگی پہ تیری سیتا کو پیار آئے
معصومیت پہ تجھ کو مریم گلے لگائے
حوریں لپک کے چومیں، پائیں قدم جو تیرے
ہر نقشِ پا پہ تیرے سجدے کریں فرشتے

—

اے کاش وہ بتائے ہے جس کی یہ خدائی
یہ چشمِ نرگسی ہے یا کاسۂ گدائی!
لب ہیں کہ پتھروں کے ٹکڑے جمے ہوئے ہیں!
رُخ ہیں کہ رہگذر کے بجھتے ہوئے دیے ہیں!

(1937)

خوابِ ہستی

وہ زمانے اور تھے جب تیرا غم سہتا تھا میں
جب ترے ہونٹوں کی رنگینی سے کچھ کہتا تھا میں
جب ترے بالوں سے گھنٹوں کھیلتا رہتا تھا میں
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

یک بیک بجلی سی چمکی اور نشیمن لٹ گیا
تو نے برسوں جس کو سینچا تھا وہ گلشن لٹ گیا
تو نے موتی جس میں ٹانکے تھے وہ دامن لٹ گیا
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا!

تجھ کو جس دل سے محبت تھی وہ اب دل ہی نہیں
رقص جس کا تجھ کو بھاتا تھا وہ بسمل ہی نہیں
رنگِ محفل تجھ سے کیا کہیے، وہ محفل ہی نہیں
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا!

اب نہ وہ شوقِ تصور، اب نہ وہ ذوقِ فغاں
مٹ رہے ہیں رفتہ رفتہ عہدِ رفتہ کے نشاں
دھندلی دھندلی سی نظر آتی ہیں کچھ پرچھائیاں
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا!

یہ جوانی یہ پریشانی یہ پیہم اضطراب
بارہا الجھن میں دوڑا ہوں سوئے جامِ شراب
بارہا گھبرا کے چھیڑا ہے گناہوں کا رباب
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا!

رنگِ صہبا اور ہے صہبا کی مستی اور ہے
ذکرِ پستی اور ہے احساسِ پستی اور ہے
خوابِ ہستی اور ہے تعبیرِ ہستی اور ہے
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا!

(1938)

منزل تک...

کتنے بے خواب حسینوں کی تسلی کے لیے
بند ہوتی ہوئی آنکھوں کے سلام آئیں گے
کتنے جلتے ہوئے گلرنگ لبوں کی خاطر
سرد ہوتے ہوئے ہونٹوں کے پیام آئیں گے
کتنے افسردہ ستاروں کو بنا کر خورشید
کتنے خورشید درخشاں لبِ بام آئیں گے
اپنے سینے میں چھپائے ہوئے لاکھوں ظلمات
ضوفگن کتنے ابھی ماہِ تمام آئیں گے
ہر قدم آگے بڑھانے کے لیے خون کی بھینٹ
ایسے بھی اے غمِ دل کتنے مقام آئیں گے
تشنگی پینے پہ مجبور کرے یا نہ کرے
زہر آلود ابھی سینکڑوں جام آئیں گے

(1945)

اپنی شاعری کی تمام جہتیں جاننے کی وجہ سے ہی جذبی نے نظموں کے بجائے غزلوں کی صنف کو ہی اپنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ زبیر رضوی کی اس رائے سے متفق ہوا جاسکتا ہے کہ 'فروزاں' میں 'دل' کو کلیدی لفظ اور کسی حد تک استعارے کی حیثیت حاصل تھی، لیکن 'گدازِ شب' تک آتے آتے جذبی کی غزل ایک دوسرے ہی لہجے سے آشنا ہوتی ہے، جو دیوار پر لگے پرانے پلستر کو ناخنوں سے کھرچتی ہوئی نظر آتی ہے۔ 1950 کے بعد جذبی کی غزل خلق کرنے کی ایسی حدوں میں قدم رکھتی ہے جہاں پہنچ کر ان کی غزلوں کے لیے مرجھانے کے مہ وسال نہیں آتے۔'' (معین احسن جذبی: شاعر اور دانشور، مضمون: جذبی چند تاثرات، ص107)

پروفیسر سالم قدوائی کے مضمون 'معین احسن جذبی' کے مطابق جذبی صاحب کے والد کا تبادلہ جھانسی ہوا، تو ان کا داخلہ انٹرمیڈیٹ کالج جھانسی میں کرایا گیا، یہ ساتویں درجے میں تھے جب کالج کے پرنسپل قاضی خورشید احمد صاحب نے، جو خود بڑے زبردست شاعر تھے، کالج میں ایک کلاس شاعری کی بھی رکھی، جس میں اردو پڑھنے والے طلبا کو شعر گوئی کی مشق کرائی جاتی تھی اور اس کے اصول وضوابط سمجھائے جاتے تھے۔ جذبی صاحب کو بھی اس کلاس میں رکھا گیا، جہاں ان کا شوق پروان چڑھا، انھوں نے ایک غزل کہی، جس کا مطلع تھا:

ہوگیا ہوں گدا میں اس در کا
یہ ہے چکر میرے مقدر کا

(معین احسن جذبی: شاعر اور دانشور، مضمون، ص110)

'کلیاتِ جذبی' میں یہ غزل شاید اس لیے درج نہیں ہے کیونکہ عین ممکن ہے کہ پست درجہ مان کر ہی شاعر نے بذاتِ خود اسے اپنی شاعری سے ہی خارج کردیا ہو۔ دیگر شاعر بھی ایسی حالت میں عموماً ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔

ابوسفیان اصلاحی نے ازخود جذبی صاحب سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر اپنے زیرِعنوان مضمون 'جذبی صاحب سے ایک ملاقات' کے تحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''جذبی صاحب نے 1929 میں جھانسی سے ہائی اسکول کرنے کے بعد آگرہ کے مشہور کالج سینٹ جانس میں داخلہ لیا۔ وہیں اسرارالحق مجاز سے ان کی ملاقات ہوئی۔ دونوں ہیلی بری ہاؤس ہاسٹل میں قیام پذیر تھے۔ یہ مجاز کی شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا، جس پر لکھنؤ کا رنگ غالب تھا، جو جذبی صاحب کو پسند نہ تھا۔ اس زمانہ میں جذبی صاحب کے بقول ''ہم دونوں ساتھ رہتے، ساتھ کھاتے، ساتھ فلمیں دیکھتے، ساتھ کلاس جاتے، ساتھ سوتے اور ساتھ اٹھتے۔ مختصر یہ ہے کہ شب وروز ساتھ ساتھ گزرتے۔ یہاں تک کہ سکنڈ ایئر میں ساتھ ہی ساتھ فیل ہوئے۔ ہم دونوں کو اس وقت شاعری کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا تھا۔ 1955 میں مجاز کے انتقال کی خبر سن کر مجھ پر کیا گزری، اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔'' (معین احسن جذبی: شاعر اور دانشور، مضمون 'جذبی صاحب سے ایک ملاقات' ص135-136)

جذبی کے اس بیان سے ان کے مجاز سے نزدیکی رشتے کا ہی ثبوت ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے اساتذہ میں رشید احمد صدیقی اور آل احمد سرور کے نام بڑی شفقت کے ساتھ لیے ہیں۔ آل احمد سرور سے متعلق تو ایک لمبی نظم بھی 'آل احمد سرور کی خدمت میں' کے عنوان سے لکھی ہے جو کہ 'کلیاتِ جذبی' میں صفحہ 118-116 پر درج ہے۔ اس میں بالخصوص ادب میں فن کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ

حیات نقد کی طالب تری نگاہوں سے
عروسِ فن کے تقاضے ہیں تیری بانہوں سے

(ص118)

اس طرح کی تخلیقوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اپنے ماحول و اس سے منسلک افراد سے جذبی بہت گہرائی سے جڑے ہوئے تھے۔ ان کی شاعری ان کے معاشرے کی ہی آئینہ دار کہی جاسکتی ہے۔ اس برس ان کی پیدائش کو ایک صدی مکمل ہورہی ہے اور اس جہان کے معمولی باشندوں کی حیثیت سے ہم اس بلند پایہ و مایۂ ناز شاعر کو تہہ دل، شفقت اور پورے احترام سے خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

□

Dr. Krishn BhaukHouse No:Lane No: 6,
Jughar Nagar, Patiyala - 147003 (Punjab)

انگلینڈ میں انیسویں صدی کے اوائل میں چھاپہ خانے کے بلاک پر نقش کی گئی کلکتہ کے فورٹ ولیم کی تصویر

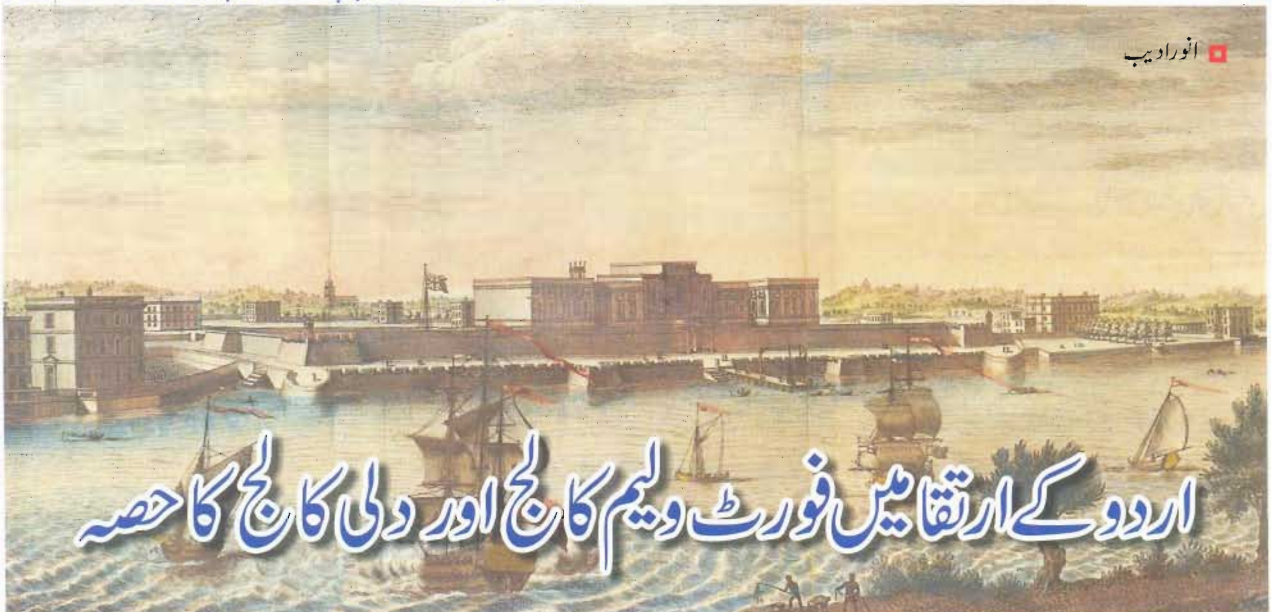

اردو کے ارتقا میں فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کا حصہ

■ انور ادیب

اردو زبان کو ترقی دینے اور اسے ادبی و علمی زبان کی حیثیت سے وسعت بخشنے میں جن اداروں نے نمایاں رول ادا کیا ان میں فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ گرچہ ان اداروں کے قیام کا مقصد سیاسی تھا لیکن ان اداروں کی ادبی اور علمی خدمات سے انکار ممکن نہیں۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد انگریزوں کو ہندوستانی زبان اور معاشرت سے آگاہ کرنا تھا تاکہ وہ مقامی مسائل کو باآسانی سمجھ سکیں۔ چنانچہ 1800 میں لارڈ ویلزلی کے حکم سے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا۔ اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات کے ذکر سے قبل اس کالج کے روح رواں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ گلکرسٹ 1783 میں ایک اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے ہندوستان آیا تھا۔ یہیں اسے اردو سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اپنی ذاتی کوشش سے اس نے اردو سیکھی۔ دوران مطالعہ اس نے اردو لغت اور قواعد کی کتابوں کی کمی شدت سے محسوس کی اور اس نے سخت محنت اور کوشش سے 1887 میں انگریزی اور ہندوستانی لغت ترتیب دی۔ دو سال بعد اس نے 'ہندوستانی زبان کی قواعد' شائع کی اور اس کے بعد ضمیمہ 'ہندوستانی لسانیات' شائع ہوا۔

گلکرسٹ کے ادبی اور لسانی رجحان کو دیکھتے ہوئے اسے زبان وادب کی تعلیم وتدریس کی خدمات سونپی گئیں اور فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اسے ہندوستانی زبان کے پروفیسر کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔ اس نے اردو زبان کی تدریس وتعلیم، نصابی کتب اور مدرسوں کے انتظام وغیرہ جیسے مسائل کی طرف سب سے پہلے خصوصی توجہ دی۔ فورٹ ولیم کالج کے وجود میں آنے سے پہلے ہندوستان میں کوئی پریس نہیں تھا۔ کتابوں کے صرف قلمی نسخے ہی دستیاب تھے اس وجہ سے گلکرسٹ نے قابل مصنفین کا تقرر کیا اور ان کی لکھی ہوئی کتابوں کو شائع کرنے کے لیے اردو پریس قائم کیا۔ طلبا کی ضرورت کے پیش نظر کئی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کی اردو زبان وادب کی دلچسپی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب کمپنی نے بعض مجبوریوں کی وجہ سے اشاعتی پروگرام کو بند کرنا چاہا تو اس نے کمپنی کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی اور چند کاروباری شرائط کے ساتھ اس کے مصارف خود برداشت کرنے کی پیش کش کی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد انگریز افسروں کو ایک تربیت گاہ فراہم کرنا تھا لہٰذا اس کالج میں مشرقی زبانوں خصوصاً اردو اور فارسی کی تعلیم پر زیادہ توجہ دی گئی۔ مغلیہ سلطنت میں سرکاری زبان فارسی تھی۔ مغلوں کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ فارسی زبان کے اثرات کم ہونے لگے تھے اور اس کی جگہ اردو نے لے لی تھی جو ہندوستانیوں کی عام بول چال کی زبان تھی۔ کالج کے قیام کے وقت اس زبان کے پاس نثری علمی سرمایہ بہت کم تھا۔ داستانوں اور مذہبی تحریروں کی شکل میں نثر کی کچھ کتابیں ضرور موجود تھیں جن پر فارسی کے مرصع اسلوب کا گہرا اثر تھا۔ لیکن ایسی کتابیں موجود نہیں تھیں جو تعلیمی ضرورتیں پوری کرسکتیں۔ اس مقصد کے لیے ملک کے مختلف حصوں سے ایسے ادیبوں کو جمع کیا گیا جو سادہ اور عام فہم زبان میں ایسی کتابیں لکھیں جن سے ہندوستان کے معاشرے کے مختلف اہم پہلو سامنے آسکیں۔

عوامی دلچسپی کے پیش نظر کالج نے داستانوی ادب کی طرف زیادہ توجہ دی۔ فارسی اور سنسکرت زبان کے مسحور کن قصوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا گیا۔ اس سے جہاں عوام کی دلچسپی کا سامان فراہم کیا گیا وہیں فن داستان گوئی کو بھی فروغ ہوا اور ہندوستانی تہذیب کے مختلف پہلو اجاگر ہوئے۔ داستانوی ادب کے علاوہ تاریخ وتذکرہ اور اردو زبان وقواعد سے متعلق بھی کتابیں اس ادارے سے شائع ہوئیں۔

اب اس کالج کی سرپرستی میں کام کرنے والے مصنفین اور ان کی تصانیف پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

■ میر امن دہلوی: انھیں سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ انھوں نے کالج کی تین سالہ ملازمت میں دو کتابیں لکھیں۔ 'باغ و بہار' اور 'گنج خوبی' (جو انوار سہیلی کا ترجمہ ہے) باغ و بہار کی وجہ سے انھیں زبردست شہرت حاصل ہوئی۔ باغ و بہار فارسی قصہ چہار درویش کا آزاد ترجمہ ہے۔ گلکرسٹ کی فرمائش پر انھوں نے قصہ چہار درویش کو سادہ اور سلیس اردو میں لکھا۔ یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی۔ میر امن کو بجا طور پر اس کارنامے پر فخر تھا۔

■ حیدر بخش حیدری: انھوں نے سب سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ ان طبع زاد اور تراجم پر مشتمل کتابوں میں 'طوطا کہانی' اور 'آرائش محفل' کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔ 'طوطا کہانی' قصوں کی کتاب ہے۔ اصل کتاب سنسکرت میں ہے جس کا فارسی میں ترجمہ ہوا تھا اور اس سے حیدری نے اردو میں ترجمہ کیا۔ حیدری کی دوسری مقبول کتاب آرائش محفل ہے۔ یہ حاتم طائی نامی فارسی کتاب کا آسان اردو ترجمہ ہے۔ اس میں حاتم طائی کے سات سفروں کی داستان بڑے دل آویز انداز میں پیش کی گئی ہے۔

■ میر شیر علی افسوس: انھوں نے شیخ سعدی کی مشہور

کتاب 'گلستان' کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا۔ انھوں نے سجان رائے کی فارسی تاریخ 'خلاصۃ التواریخ' کا اردو ترجمہ کیا۔ یہ کتاب بے حد اہمیت وافادیت کی حامل ہے۔

■ مرزا علی لطف :انھوں نے گلکرسٹ کی فرمائش پر اردو شاعروں کا ایک تذکرہ 'گلشن ہند' کے نام سے لکھا۔ یہ کتاب ابراہیم خان کی فارسی تصنیف 'گلزار ابراہیم' کی بنیاد پر لکھی گئی اس سے معاصر شعرا کے فکر وفن کا اندازہ ہوتا ہے۔

■ میر بہادر علی حسینی: انھوں نے میر حسن کی شہرۂ آفاق مثنوی سحرالبیان کو 'نثر بے نظیر' کی شکل میں منتقل کرکے داستانوی ادب میں اضافہ کیا۔ ان کی کتاب اخلاق ہندی کافی مقبول ہوئی۔ اس میں اخلاقی خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کی بنیاد سنسکرت کی اخلاق آموز کہانیوں پر ہے۔ حسینی نے انھیں فارسی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ ان کی ایک اور کتاب 'تاریخ آسام' ہے۔ یہ بھی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ حسینی نے گلکرسٹ کی قواعد کو مختصر کرکے سادہ و عام فہم زبان میں لکھا ہے۔

ان کے علاوہ مظہر علی ولا نے کئی کتابیں لکھیں جن میں 'مادھونل ور کام کنڈلا'، 'بیتال پچیسی' اور تاریخ شیر شاہی مشہور ہیں۔ مرزا کاظم علی جوان نے کالی داس کی شاہکار تخلیق 'شکنتلا' کو اردو میں منتقل کیا۔ نہال چند لاہوری نے گل بکاؤلی کی مشہور کہانی فارسی سے آسان زبان میں ترجمہ کرکے 'مذہب عشق' کے نام سے پیش کیا۔ ان کے علاوہ بینی نرائن جہاں نے 'چار گلشن' اور للو لال جی نے سنگھاسن بتیسی لکھی ان کے علاوہ امانت اللہ شیدا، اکرم علی، حفیظ الدین، خلیل علی رشک اور مرزا جان طپش نے بھی اس کالج کی سرپرستی میں کئی کتابیں لکھ کر اردو نثر کی ترقی میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اس طرح فورٹ ولیم کالج اردو نثر کے ارتقا میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کالج نے سادہ اور پراثر نثر کا رجحان عام کیا۔

دلی کالج کی خدمات بھی بے حد اہم رہی ہیں۔ یہ کالج 1825 میں قائم ہوا۔ یہ انگریزی علوم کی تربیت گاہ تھا۔ یہاں جدید علوم کی تعلیم کا نظم تھا جن کا مقصد ہندوستانی عوام کو جدید رجحانات سے متعارف کرانا تھا۔ یہاں ہر مضمون کی تعلیم اردو زبان میں دی جاتی تھی۔ اس کی تعلیمی سرگرمیوں کو عملی جامہ پہنانے میں مسٹر ٹیلر، ڈاکٹر اشپرنگر اور مسٹر کارگل جیسی غیر ملکی شخصیتوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ان میں ڈاکٹر اشپرنگر کی خدمات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اردو زبان میں علمی کتابوں کو منتقل کرنے کا قابل قدر کارنامہ انجام دیا۔ اردو زبان ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ اس کالج کے تحت 1842 میں ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس سوسائٹی کی خدمات بیش بہا ہیں۔ قانون، ریاضیات، سائنس اور تاریخ جیسے موضوعات پر 100 سے زائد کتابیں شائع ہوئیں۔ ان میں ماسٹر رام چندر کی ریاضی سے متعلق کتابیں، ولیم سیکناٹن کی قانون کی کتابیں۔ تاریخ ہند، تاریخ اسلام، تاریخ ایران، تاریخ یونان وروما، تاریخ خاندان مغلیہ، تاریخ کشمیر وغیرہ خاص

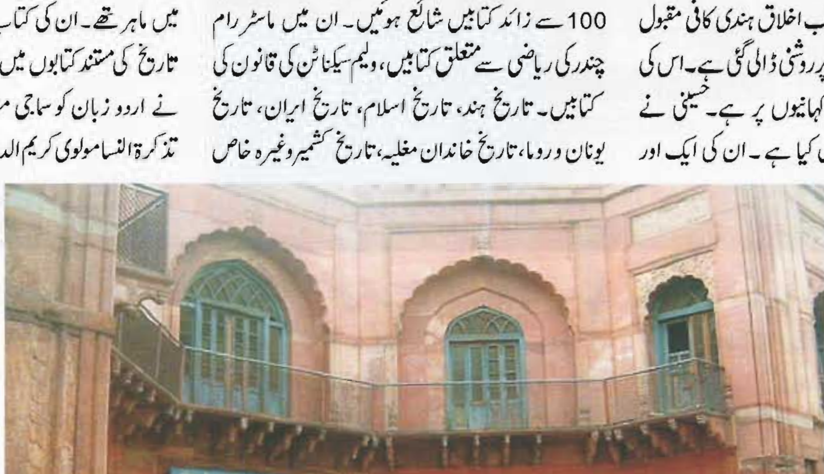

دہلی کالج کی قدیم عمارت

طور پر قابل ذکر ہیں۔ ادبی کتابوں میں کلیلہ و دمنہ، قصہ چہار درویش، تذکرہ شعرائے ہند، تذکرہ ہند شعرا بدر منیرا، شکنتلا، سودا، درد، میر، جرات کے دواوین اور انتخاب الف لیلہ وغیرہ شائع ہوئیں۔ اس طرح تھوڑے عرصے میں بے شمار موضوعات پر بیش بہا کتابیں شائع ہوئیں اور یہ کالج علم وفنون کا زبردست مرکز بن گیا۔ اس ادارے نے باصلاحیت افراد کی شخصیت سازی کی۔ مولوی نذیر احمد دہلوی، محمد حسین آزاد، ماسٹر رام چندر، مولوی ذکا اللہ ڈاکٹر ضیاالدین، پنڈت موتی لال دہلوی، میر ناصر علی اور مولوی کریم الدین اس کالج کے قابل ذکر طلبہ تھے۔ ان میں سے کچھ اپنے قابل قدر کارناموں کی وجہ سے تاریخ میں اپنا نقش چھوڑ گئے۔ ماسٹر رام چندر جی اس کالج میں سائنس کے استاد تھے اور انھیں ریاضی سے دلچسپی تھی۔ انھوں نے ریاضی کی متعدد کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا اور بہت سی علمی کتابیں لکھیں۔ ان میں عجائب روزگار اور تذکرۃ الکاظمین بہت مشہور ہوئیں۔ انھوں نے علمی سائنسی موضوعات پر مضامین لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ ان کے علاوہ مولوی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد اپنے بیش بہا ادبی کارناموں کی وجہ سے تاریخ ادب کا حصہ بن چکے ہیں۔ مولوی نذیر احمد نے ناول نگاری کی راہ ہموار کی اور محمد حسین آزاد نے تاریخ نگاری اور تنقید کے میدان میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔ مولوی ذکا اللہ فارسی، اردو، تاریخ اور ریاضی میں ماہر تھے۔ ان کی کتاب ہندوستان اور آئین قیصری کا تاریخ کی مستند کتابوں میں شمار ہوتا ہے۔ مسٹر پیارے لال نے اردو زبان کو سماجی موضوعات سے روشناس کرایا۔ تذکرۃ النسا مولوی کریم الدین کی قابل قدر تصنیف ہے۔

دلی کالج اپنی گراں قدر علمی خدمات سے اردو کو بام عروج پر پہنچانے میں منہمک تھا کہ اس تحریک کو 1857 کی تحریک جنگ آزادی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر قتل کر دیے گئے امام بخش صہبائی دارورسن کی نذر ہوگئے۔ اردو کالج کو آگ لگادی گئی کتب خانہ لوٹ لیا گیا۔ کالج تباہ ہو گیا اور 1888 میں ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ اس سے اردو کو ایک علمی اور سائنسی رجحان اور اسلوب دینے کی تحریک ختم ہوگئی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس تحریک کے اردو زبان و ادب پر دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ مولوی عبدالحق کے اس قول سے انکار ممکن نہیں کہ ''ہم اپنی زبان کو جس ترقی یافتہ صورت میں دیکھتے ہیں اس پر بلاواسطہ اور بالواسطہ اس تحریک کا بہت کچھ اثر ہے۔''

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دونوں کالجوں نے اردو کی ترقی و اشاعت میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ فورٹ ولیم کالج نے جہاں قصے، تاریخ اور مذہبی کتابوں کے ترجموں سے اردو زبان کو ترقی دی وہیں دلی کالج نے ریاضی، سائنس، نجوم اور فلسفے کی کتابوں کے ترجمے شائع کرکے اردو زبان کو علمی طور سے مالا مال کیا۔

□

Dr. Anwar Adeeb,Ibrahim Manzil, Mosaddi Mohalla,Railpar, Asansol - 713302 (W.B)

اُڑیسہ میں اردو

سعید رحمانی

اردو کی ہمہ گیری کا سبب اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے کہ نا مساعد حالات کے باوجود نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس کی اثر آفرینی میں روز افزوں اضافہ بھی ہوتا جارہا ہے۔ اردو کے تعلق سے یہی بات صوبہ اُڑیسہ میں بھی نظر آتی ہے جہاں کی سنگلاخ زمین میں اردو کا پودا پھل پھول رہا ہے اور اس کی گھنی چھاؤں سے ہر شخص کو بلاتخصیص مذہب وملت یکساں فیض رسانی ہورہی ہے۔

یہ بات مسلّم ہے کہ اڑیسہ میں اردو کی ابتدا مغلوں کی آمد سے ہوئی مگر اس سلسلے میں سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہاں اس کی سرپرستی مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں نے کی۔ اس ضمن میں سب سے پہلا نام لالہ ہردئے جی کا آتا ہے جو فارسی کے ایک جید عالم تھے اور جنھوں نے سترھویں صدی میں فارسی اور اردو کو فروغ دینے کا اولین فریضہ انجام دیا۔ پھر اٹھارہویں صدی میں فارسی اور اردو کے ایک دوسرے عالم شری جگموہن دیو کا ظہور ہوا جن کو کلاسیکی ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ نثری ادب کے علاوہ شعروشاعری کے میدان میں جو پہلا نام نظر آتا ہے وہ ہردئے رام جودت کا ہے جو اڑیسہ کے اولین شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اڑیسہ میں انھوں نے اردو شاعری کا جو چراغ روشن کیا تھا اس کی لو آج بھی اپنا نور بکھیر رہی ہے۔ پھر بالیسر کی مہادو یادیوی کا نام آتا ہے جو اگرچہ اڑیہ زبان کی ایک عظیم شاعرہ تھیں مگر اردو سے بھی انھیں گہرا شغف رہا۔ انھوں نے اردو ادب کے جوہر پاروں کو اڑیہ میں منتقل کرنے کی جانب پہلا قدم اٹھایا۔ غالب اور بہادر شاہ ظفر کی کئی غزلوں کو انھوں نے اڑیہ قالب عطا کیا۔ لیکن جس ہستی نے اردو ادب میں اپنے گہرے نقوش مرتب کیے اس کو لوگ پنڈت لکشمی نارائن مشرا کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ جنگِ آزادی کے ایک عظیم مجاہد تھے۔ تحریکِ آزادی میں حصہ لینے پر جب انگریزوں نے انھیں گرفتار کرکے بہارکیمپ جیل میں نظربند کیا تو ان کا واسطہ بہت سے اردو داں مجاہدینِ آزادی سے پڑا۔ ان کی رفاقت میں انھیں اردو سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ حالتِ قیدوبند میں انھوں نے اردو سیکھی اور جلد ہی اس میں خاصی دسترس حاصل کرلی۔ وہ اڑیہ کے بلند پایہ ادیب تھے ہی' اردو کی جانکاری نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور وہ اردو کے بھی ایک بلند پایہ ادیب بن گئے۔ ان کی شہرۂ آفاق تخلیق 'بھگوت گیتا اور قرآن' کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کتاب کا دیباچہ بابائے اردو مولانا عبدالحق نے لکھا جبکہ اشاعت انجمنِ ترقی اردو حیدرآباد نے کی۔

سرزمینِ اڑیسہ میں بعض ایسے عاشقانِ اردو کی مثال بھی ملتی ہے جن کی مادری زبان اگرچہ اردو نہ تھی مگر وہ اردو کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر تھے۔ ایسی شخصیتوں میں شری سنتوش سنگھ' شری بھوپندر سنگھ اور شری جھسکیتن ساہو کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح تلوک ناتھ انجم' چندر کانت ساحل اور رشمی کانت راہی بھی اردو شعروادب میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ خصوصاً رشمی کانت راہی نے اردو شاعری کو ایک نئی جہت عطا کی جس کا عرفان ان کے مجموعہ کلام 'حرفِ مسبب' سے ہوتا ہے۔ ان کے اس مجموعہ کی پذیرائی اردو حلقوں میں بڑی گرم جوشی سے ہوئی تھی۔

ان حقائق وشواہد کے تناظر میں ان حضرات کا دعویٰ ان کی کور بینی کا آئینہ دار لگتا ہے جو اردو کو غیر ملکی زبان ہونے کا طعنہ دیتے ہیں یا پھر اس کو مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں۔ بہرحال اڑیسہ جیسے دور افتادہ علاقے میں اردو کے فروغ کے لیے برادرانِ وطن کی کاوشیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی دین ہے اور اس کو غیر ملکی قرار دینے والے لسانی عصبیت کا شکار ہیں۔

اس بارے میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ آج اڑیسہ میں اردو زبان و ادب کا تخلیقی عمل بہر طور معیاری اور تشفی بخش ہے۔ یہاں کے بعض شعرا اور ادبا حضرات کا شمار کل

اڑیسہ میں اردو اکادمی بھی ہے جس کے 'اردو بھون' کا افتتاح 14اپریل 2005 کو ہوا تھا

درگاہ قدم رسول، کٹک، اڑیسہ

ہند سطح پر صفِ اول کے قلم کاروں میں کیا جاتا ہے۔ ان کے شعری تنقیدی اور افسانوی کارناموں کی حیثیت مسلّم ہے، ان صفِ اول کے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ ابھرتے ہوئے قلم کاروں کی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے ہے جن سے ہماری بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

اڑیسہ میں اردو آج جس بلندی پر پہنچ پائی ہے وہاں تک لے جانے میں نجم الشعرا امجد نجمی کی گرانقدر خدمات کو تاریخِ ادب کا ایک زرّیں باب کہا جاسکتا ہے۔ مشہور شعرا سید شکیل دسنوی اور اطہر عزیز کا تعلق بھی اڑیسہ سے ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آج اڑیسہ میں اردو کی پیش رفت میں مزید تیزی آئی ہے۔ خصوصاً شعر وادب اور صحافت کے میدان میں اردو کو کافی فروغ حاصل ہوا ہے۔ بہت سے شعرا صاحب مجموعہ ہوچکے ہیں اور ان کی تعداد بڑھتی ہی جارہی ہے۔ ماضی میں یوں تو متعدد رسائل ہفت روزہ اور روزنامے شائع ہوتے رہے ہیں مگر ان سب کی مدتِ حیات بہت قلیل رہی۔ سرِ دست رسائل میں 'ادبی محاذ' کو فوقیت حاصل ہے جو گزشتہ آٹھ برسوں سے پابندی کے ساتھ شائع ہورہا ہے اور ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہوچکا ہے۔ مجلّہ 'ترویج' بھی دس بارہ برسوں سے وقفے وقفے سے منظرِ عام پر آکر اپنی اہمیت کا احساس دلا رہا ہے۔ ماہنامے کی شکل میں 'صدائے اڑیسہ' کا پھر سے احیا ہوا ہے جو بڑی خوشی کی بات ہے۔ حالیہ دنوں میں 'اخبار نامہ' کے نام سے ایک روزنامہ بھوبنیشور سے شائع ہونے لگا ہے۔ اس کی اٹھان بڑی جاذب نظر ہے مگر معیار و مواد کے اعتبار سے بہتری لانے کی کافی گنجائشیں ہیں۔

جنوری 2012 میں جاری ہونے والے اڑیسہ کے پہلے اردو روزنامے اخبار نامہ کے مدیر حکیم خان جن کا گزشتہ ماہ کٹک میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا

ویسے تو اڑیسہ میں اردو کا مستقبل تابناک نظر آتا ہے مگر چند حقائق ایسے بھی ہیں جن سے دل میں ایک خلش پیدا ہوتی ہے کہ کہیں اردو کے بڑھتے قدم پیچھے کی طرف نہ پڑنے لگیں۔ زبان کی بقا خود اہلِ زبان کی سرپرستی پر منحصر ہے۔ اگر ہم اپنی زبان اور ثقافت سے بے توجہی برتنے لگیں تو پھر اس کا خدا حافظ ہے۔ یوپی کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں اردو پیدا ہوئی اور پروان چڑھی لیکن افسوس کی بات ہے کہ اردو وہاں تقریباً غائب ہوچکی ہے۔ کچھ ایسی ہی صورتحال ہمارے یہاں بھی در پیش ہے۔ ہماری نوجوان پیڑھی اردو سے بتدریج دور ہوتی جارہی ہے اور یہ بات اردو کی بقا کے لیے کسی خطرے سے کم نہیں۔ اکثر والدین اپنے بچوں کے روشن مستقبل کی خاطر یا تو انھیں انگریزی اسکولوں میں داخل کراتے ہیں یا پھر علاقائی زبان میں ذریعہ تعلیم کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل بیشتر اسکولوں اور کالجوں میں اردو کے درجات سونے پڑے رہتے ہیں۔ اردو کے تعلق سے جو خدشات ابھر رہے ہیں ان کا ازالہ بڑی کامیابی سے کیا جاسکتا ہے اگر ذیل کی تجاویز کو عملی شکل دینے میں خلوص دل سے کوشش کی جائے۔

چند تجاویز

1 بہت چاہنے پر بھی بیشتر کالجوں میں اردو کا اختیاری پرچہ نہیں مل پاتا ہے۔ اس لیے اکثر طلبا دوسرا پرچہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ محکمہ تعلیم سے رجوع کرکے اردو طلبا کو یہ رعایت دلائی جاسکتی ہے۔

2 پہلے کالجوں میں اردو کے لیے نشستیں محفوظ ہوتی تھیں مگر اب ایسا نہیں ہوتا۔ حکومت سے رابطہ کرکے محفوظ نشستوں کا سلسلہ شروع کرایا جاسکتا ہے۔

3 غیر اردو علاقے میں جو بچے ہندی ورنا کولر لیتے ہیں انھیں وظیفہ دیا جاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ بچے ہندی کی طرف راغب ہوں۔ اگر اردو طلبا کو بھی وظیفہ دینے کا اہتمام کیا جائے تو اس کا بڑا اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ اڑیسہ اردو اکادمی اور دیگر نجی ادارے ان وظیفوں کا انتظام کرسکتے ہیں۔

4 اڑیسہ میں اردو تعلیم کا سب سے مایوس کن پہلو یہ ہے کہ اردو نصاب کے تعلق سے ہم اب تک دوسرے صوبوں کے محتاج رہے ہیں۔ ورنا کولر کا کام تو کسی صورت چل جاتا ہے مگر ریاضی، سائنس، تاریخ اور جغرافیہ میں ایک بھی اردو کتاب ایسی نہیں جو اڑیسہ ایجوکیشن بورڈ کے نصاب سے میل کھاتی ہو۔ چنانچہ اردو نصاب کی تشکیل ہمارا اولین فریضہ ہے جس کی تکمیل میں اڑیسہ اردو اکادمی اہم رول ادا کرسکتی ہے۔

5 اردو والے ہمیشہ حکومت کے 'معاندانہ رویے' کا رونا روتے ہیں لیکن کبھی یہ نہیں سوچتے کہ اردو کا تحفظ خود ان کا اولین فریضہ ہے لیکن ان میں ایسی بے حسی پائی جاتی ہے کہ اردو کے نام پر ایک پائی بھی خرچ کرنے کے روادار نہیں۔ کم از کم ہر گھر میں اردو کا ایک اخبار یا رسالہ خرید کر پڑھا جائے تو اس سے زبان کی بقا میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

Sayeed Rahmani, Editor 'Adabi Mahad',
Deewan Bazar, Cuttak

غلام نبی خیال

لالہ رُخ
کشمیر کی 'الف لیلہ'

لالہ رخ سرزمینِ کشمیر کے پس منظر میں لکھی گئی مشرق کی ایک ایسی رومانی داستانِ حرم ہے جسے غالباً الف لیلہ کے بعد مشرق ومغرب میں بے حد مقبولیت کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔

لالہ رخ نام کی یہ منظوم منثور تصنیف آئرلینڈ کے شاعراوراديب ٹامس مور (1852-1777) کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے ۔جس نے اس افسانوی کہانی کو اس طرح قلمبند کرلیا کہ اس میں طلسماتی دنیا کی ساری رنگینیوں اور عجائبات کو مجتمع کیا۔ مور کی یہ تصنیف سب سے پہلے 1817 میں شائع ہوئی اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

لالہ رُخ قلم بند کرنے کا آغاز مور نے 1812 میں کیا اور 1814 میں جب یہ داستان مکمل ہوئی تو اسے لانگ مینس نام کے ناشروں نے تین ہزار پونڈ معاوضہ کے طور پر مصنف کو ادا کرکے اس کی اشاعت کے حقوق حاصل کیے اور اس طرح سے لالہ رخ مئی 1817 میں منظرعام پر آئی ۔اس کتاب کی مانگ اس حد تک بڑھ گئی کہ صرف تین دن کے اندر اندر ہی ناشر کو اس کا طبع ثانی شائع کرنا پڑا اور سال کے اختتام تک اس کے چھ ایڈیشن اشاعت پذیر ہو چکے تھے۔

لالہ رخ سے قبل ٹامس مور کے نغمات کا مجموعہ Irish Melodies کے نام سے 1807 میں شائع ہوا تھا جس نے اسے پہلے ہی شہرت بخشی تھی ۔ 1807 اور 1835 کے درمیان یہ نغمات دس جلدوں میں شائع ہوکر خاص وعام سے دادِ تحسین حاصل کر چکے تھے ۔

لالہ رخ کی انگریزی میں اشاعت کے ساتھ ہی اس کا ترجمہ کئی اورزبانوں میں شائع ہوا جن میں فرانسیسی، جرمن، پولش، فنش ،اطالوی، ہسپانوی، روسی اور فارسی بھی شامل ہیں۔ اُردو زبان میں لالہ رُخ کا ترجمہ لطیف احمد اکبرآبادی نے کیا جو پہلے نیاز فتح پوری کے مشہور رسالے نگار میں باقساط 1944 میں شائع ہوا اور بعد میں اسے نگار بک ایجنسی نے ہی ایک کتابی شکل میں شائع کیا۔

ٹامس مور انگریزی کے ممتاز شعرا لارڈ بایرن اور پی بی شیلے کا دوست تھا جس نے اپنی زندگی میں تخلیقی ادب کے مختلف شعبوں میں طبع آزمائی کی جن میں نغمات سے لے کر طنز، رومان، تاریخ اور سوانح بھی شامل ہیں۔

مور ڈبلن میں ایک پنساری کا بیٹا تھا۔ وہ ایک مفلوک الحال گھر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے ٹرنٹی کالج ڈبلن اور لندن میں تعلیم حاصل کی اور 1803 میں اسے برمیودا (Bermuda) میں ایک سول افسر مقرر کیا گیا جہاں وہ ایک سال تک مقیم رہا۔ پھر وہ امریکہ اور کینیڈا

کا دورہ کرنے کے بعد واپس انگلستان لوٹ آیا۔ 1810 میں بائرن اور سر والٹر سکاٹ نے مور کو ایک اہم ادیب کے طور پر تسلیم کرلیا۔

نو سال بعد بدقسمتی سے مور کو جیل جانا پڑا کیونکہ برمیودا میں اس کے ایک مددگار نے چھ ہزار پونڈ خرد برد کر لیے تھے جس کی سزا اسے بھگتنا پڑی۔ ٹامس مور نے 25 فروری 1852 کو ولٹ شایر Whiltshire کے شہر میں انتقال کیا۔ اسے آج تک آئرلینڈ کا قومی شاعر مانا جاتا ہے۔ مور نے اپنی زندگی میں نظم ونثر کی لگ بھگ تیس تصانیف تخلیق کیں۔

لالہ رخ کی کہانیوں کے دو کردار فرامرز اور لالہ رخ الف لیلہ کی شہر زاد اور شہریار کی یاد دلاتے ہیں جس میں شہرزاد بے وفا عورتوں سے دل برداشتہ اپنے شوہر شہریار کے ساتھ ایک ہزار ایک راتیں گزارنے کے دوران اسے اتنی ہی تعداد میں دلچسپ کہانیاں سناکر اپنا گرویدہ بنالیتی ہے۔

لالہ رخ کی دل نشیں داستان سلطنت دہلی کی شہزادی لالہ رخ اور بخارا کے ولی عہد کے عشق کی کہانی ہے جو ان دنوں کے دہلی سے کشمیر تک کے سفر کے دوران پروان چڑھتا ہے۔ سفر کا آغاز ہونے سے پہلے یہ طے پایا گیا تھا کہ دونوں کی منگنی کے بعد ان کی شادی کی رسم کشمیر کی وادی میں سرانجام دی جائیگی۔

دورانِ سفر لالہ رُخ کو ایک خوش الحان سخن گو اور داستان گو کی ہمراہی حاصل ہوتی ہے جس کا نام فرامرز ہے جو اس حسین وجمیل دوشیزہ کی سفر کی تکان دور کرنے کی غرض سے اسے دنیائے مشرق سے متعلق ایسی طلسماتی کہانیاں سناتا ہے جن سے لالہ رخ نہ صرف اپنے آپ کو ہر دم تازہ محسوس کرتی ہے بلکہ وہ دل ہی دل میں اس خوب رو، خوش بیان مگر نامانوس داستان گو کی محبت میں گرفتار ہوجاتی ہے جس کے بارے میں بعد میں اس پر یہ انکشاف ہوجاتا ہے کہ اصل میں یہی نوجوان اس کا منگیتر شہزادہ ولی عہد فرامرز ہے۔

لالہ رخ کو سنائی گئی ان چار داستانوں کا خلاصہ یوں ہے:

'خراسان کا نقاب پوش پیغمبر' ایک ایسے شیطان صفت اور کریہہ المنظر شخص کی داستان ہے جو دھوکہ دہی اور فریب کاری سے اپنے پیروکاروں کو اپنا چہرہ دکھانے سے یہ کہہ کر باز رکھتا ہے کہ اس کا چہرہ اتنا تابناک ہے کہ دوسرے اس پر نظر ڈالنے کی تاب نہیں لاسکتے۔ زلیخا جو ایک غلط فہمی کی بنا پر اس بات پر یقین کرلیتی ہے کہ اس کا عاشق عازم مرچکا ہے، اس شیطان کے حرم میں شامل ہوکر وہاں ایک مقدس فرض ادا کرنے میں مشغول ہے اور جب اسے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کا مالک نہایت بدشکل اور شیطانی کرتوتوں کا مالک ہے تو یہ شخص اپنا وہ سب کچھ چھپانے کی کوشش کرتا ہے جو کچھ زلیخا نے دیکھا ہے۔ زلیخا پر جب اس شخص کی غیر انسانی حرکات کا پول کھلتا ہے تو وہ اسے زہر دے کر ہلاک کردیتی ہے اور بعد میں خود بھی اپنے محبوب عازم کی آغوش میں اسی کی تلوار اپنے سینے میں گھونپ کر دم توڑ دیتی ہے۔

'پری اور جنت' ایک ایسے درماندہ فرشتے سے تعلق رکھتی ہے جسے صرف اسی صورت میں واپس جنت میں داخلہ مل سکتا ہے جب وہ عملی طور پر ایسی عملی مثالیں تلاش کرے جن میں حب الوطنی، بے لوث انسانی محبت اور عشق خدا شامل ہوں۔ ان مثالوں کے عملی پیکر اس فرشتے پر اس وقت آشکارا ہوجاتے ہیں جب وہ وطن کی حفاظت کرتے ہوئے ایک سپاہی کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ ایک ایسی عورت کی حقیقی کہانی کا بذاتِ خود مشاہدہ کرتا ہے جو اپنے عاشق کو چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے برعکس عشق یار میں اپنی جان کی بازی لگانے کو ترجیح دیتی ہے اور یہ فرشتہ ایک ایسے شخص کو دیکھتا ہے جو ایک بچے کو عبادت میں مشغول دیکھ کر اپنا کھویا ہوا مذہبی عقیدہ دوبارہ بحال کرلیتا ہے۔

'آتش پرستان' الف لیلہ میں بھی مختصر طور پر امجد اور اسد کے کرداروں کے نام سے شامل ہوچکی ہے۔ ان کا رہبر حافظ اور ہندہ جو امیر الحسن کی بیٹی ہے ایک دوسرے سے عشق کرتے ہیں۔ ہندہ کو یہ علم نہیں کہ الحسن ایک ایسے قبیلے کا فرد ہے جسے اس کے باپ نے صفحۂ ہستی سے مٹانے کا عہد کرلیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک زبردست سمندری لڑائی کے دوران ہندہ کو اس عاشق کے احباب بھگا کر لے جاتے ہیں۔ حافظ سامنے کی پہاڑی پہ آگ کے وہ شعلے دیکھتا ہے جو آتش پرستوں نے دہکائے تھے اور اپنے دشمن کے انتقام سے بچنے کی خاطر اسی جلتی آگ میں کود کر جان دے دیتا ہے۔ ہندہ جب یہ دیکھتی ہے تو وہ بھی اس کشتی سے چھلانگ لگا کر اپنی جان کی قربانی دیتی ہے جس میں اسے قید کرلیا گیا تھا۔

کتاب کی چوتھی اور آخری کہانی 'نورِ حرم' ہے جس میں نور محل سلیم کے ساتھ جھگڑا کرنے کے بعد ایک ایسے جادوئی کرتب کی بدولت اس کے ساتھ دوبارہ وصل پاتی ہے جسے ایک جادوگرنی نعمونہ نے عمل میں لایا تھا۔ یہی وہ داستان ہے جس کے بیان کے دوران مصنف نے سرزمین کشمیر کی دل کھول کر تعریفیں کی ہیں اور اسی کہانی کے اختتام کے ساتھ لالہ رخ اور فرامرز وارد کشمیر ہوتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے شریک حیات بن جاتے ہیں۔

کشمیر تک اس سفر کے خوشگوار اور حیات بخش انجام کے بارے میں لالہ رخ خود کہتی ہے:

یہ جنت ارضی بے رنگ ہوتی
اور اس میں کوئی خوشی موجود نہیں ہوتی
اگر یہاں پر مجھے
اپنے محبوب کا وصال نصیب نہیں ہوتا!

فرامرز کی بیان کردہ اس حکایت میں کشمیر کے قدرتی نظاروں اور حسن وخوبی کا اس شاعرانہ اسلوب اور طرز بیان میں تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔

'وادی کشمیر، اس کے عدیم المثال گلاب کے وسیع تختوں اور ان کی شادابی کا ذکر کس نے نہیں کیا؟ وہاں کے دلکش کنجوں اور شفاف چشموں کی لطافت کے فسانے کون نہیں جانتا، وہ چشمہ ہائے شفاف جو محبت کا مسکن بننے والی آنکھوں کی طرح ہر وقت منور نظر آتے ہیں کسے یاد نہیں آتے ہیں؟

اس وادی حسین کا منظر، جب آفتاب غروب ہورہا ہو صرف آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے کیونکہ اس کی سحر زائیاں الفاظ میں محدود نہیں ہوسکتیں۔ گرمیوں کی شام کو آفتاب اپنے حجلۂ عروسی میں جاتے ہوئے آئینہ پر ایک آخری نگاہ ڈالتا ہے اور کسی بات کا خیال اس کے چہرہ کو رنگِ انفعال سے رنگ دیتا ہے۔ برگ زاروں کے اندر نیم مستور سر بلند معابد کا اس فضا کے تقدس میں اضافہ کرنا، موذن کی مقدس موسیقی کا بلند ہوکر فضا پر محیط ہوجانا۔ مجوسی معابد سے بخور کا بلند ہوکر ہوا کو معطر کرنا اور مندروں کے سامنے رقص سے اپنے ماحول کو مرتعش رکھنا، یہ وہ غیر معمولی مناظر ہیں جن سے وہاں کی سرزمین ہر وقت معمور نظر آتی ہے۔

اس نزہت گاہ کا منظر لطیف، جب ماہتاب ایک سیل نور جاری کردیتا اور اپنی لطافت بار روشنی سے باغات ومعابد کو حسین تر بناتے ہوئے آبشاروں کے اندر شہابِ ثاقب پیدا کرتا ہے وہ حالت وکیفیت ہے کہ حواس انسانی تادیل کرنے سے عاجز ہوجاتے ہیں۔ غروب آفتاب اور نور ماہ کے علاوہ اس جلوہ گاہ فطرت کے مطالعہ کا وقت نمودِ صبح کی ساعت بھی ہے جب کہ اس کے تدریجی طلوع کے ساتھ دن کی روشنیاں ہر لمحہ ایک نیا جادو جگاتی ہیں اور

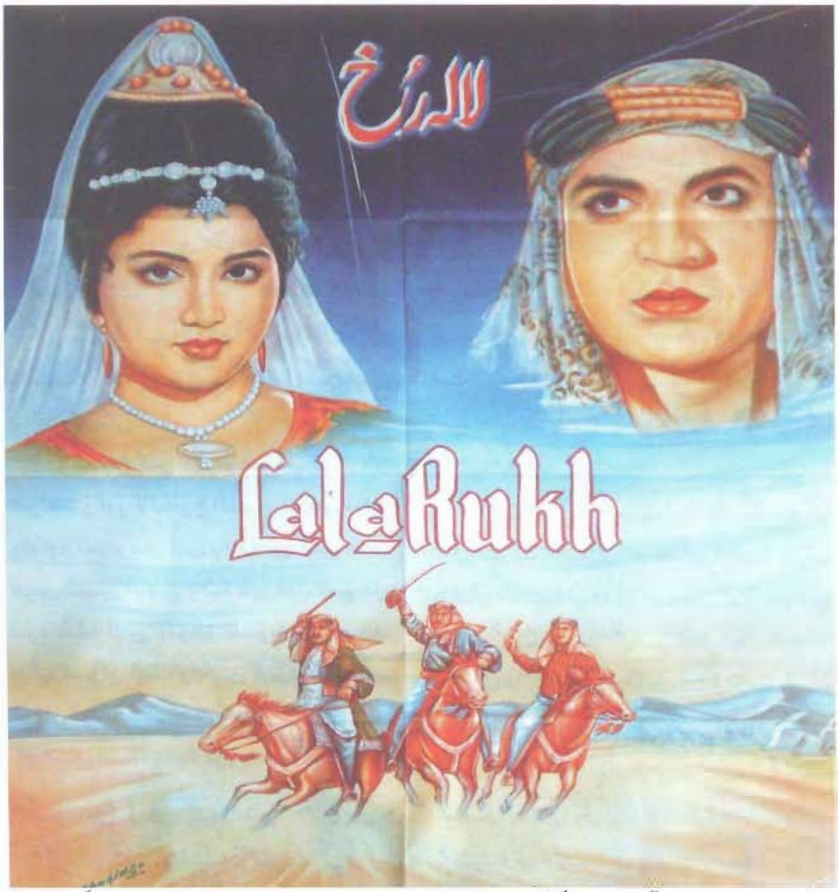

رنگین پہاڑیاں، سفید گنبد کے گوہر بار فوارے اور سیال چشمے غرض ہر شئے تاریکی کے غلاف سے اس طرح باہر نکل آتی ہے گویا وہ آفتاب کے اندر سے پیدا ہوئی ہے۔

جب نکہت صبح کے ساتھ ہی پھولوں کے اندر انگڑائیاں لیتی ہوئی نکلتی ہے اور مست تعطر نسیم رندانہ وضع کے ساتھ بید مجنوں کی شاخوں سے کھیلنے لگتی ہے یہاں تک کہ وہ سرتا پا لرزش بن جاتی ہے تو وہ عالم ہوتاہے جسے دیکھ کر جینا دشوار ہوجاتاہے لیکن آج تک برشگال کی شبنمی راتوں اور تابستان کی نورانی صبحوں نے اس وادی ارم پر ورکو لطافت ونزہت ، بھجت ومسرت سے اس قدر لبریز نہیں کیا تھا جتنی کہ وہ اس وقت ہے ۔

اس کی فضا یکسر معمور حسن اور تمام تر لبریز محبت ہے۔ وہ دن کے وقت خیال بندیٔ طلسم ہے اور رات میں سحر کاری خیال سے ہر پیشانی مسرور نظر آتی ہے اور ہر غنچۂ دل نسیم بہجت سے شگفتہ ہوتا جارہا ہے۔

غرض ہر سمت لذت وانبساط جلوہ گن ہے۔ اس لیے کہ کشمیر کی مخلوق آج 'جشنِ شگوفہ' منارہی ہے۔ یہ وہ تقریب عیش وطرب ہے جس کے طغیانِ ابتہاج اور طوفانِ لذات میں باشندگانِ کشمیر ڈوب جاتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جب بارہمولہ کے بلند وشاداب درختوں کی آڑ میں دن اپنی گرم شعاعوں کو تہہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ شام کی سکون پرور ساعتوں میں جھیل کا پانی ایک خنک لذت پیش کرنے لگتا ہے کشمیر کی دوشیزہ لڑکیاں ریشمی تکیوں سے فرقِ ناز کو جدا کر کے چاندنی کے اندر زعفران زاروں پر اپنے طرزِ خرام سے وہ جادو جگاتی پھرتی ہیں جو صرف حسن وفطرت سے متفق وہم آہنگ ہوجانے کے بعد ہی نظر آسکتا ہے۔

وادی کے ہر کنج میں صدہا مشعل متحرک ہیں۔ مناروں اور گنبد پر ہزارہا چراغ روشن ہیں اور دور ونزدیک پھولوں کے تختے اور باغوں کی روشیں کثرتِ چراغاں سے ایسا سماں پیدا کررہی ہیں گویا انفاس زمین نورانی شعاعوں کی موجیں ہیں جن کا پرتو ہر ذرّے کو ایک دنیائے نور بنا رہا ہے اور فضائے بسیط کا پیالہ نور اور روشنی سے لبریز کردیا گیا ہے۔ پھولوں کی پنکھڑیاں شاخوں سے جدا ہوکر گرتی اور روشنی کی موجیں بنتی جارہی ہیں۔ اس شام تماشا اور تقریب مسرت کے موقع پر نازنینانِ کشمیر اپنے نقابوں کو جدا کردیتی ہیں اور اپنے رنگین رخساروں کو دکھا کر ایک دفعہ بلبل کو بھی بے نیاز بنادیتی ہیں۔'' (یہ قدرے طویل اقتباس اہم اور برمحل ہے)

ٹامس مور کے بارے میں یہ بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ کیا وہ بذاتِ خود کشمیر آیا تھا یا نہیں لیکن جس طرح سے اس نے کشمیر کے باغات، زعفران زاروں، بارہمولہ کے بلند وبالا درختوں، قصبوں اور پھولوں کی تصویر کشی کی ہے اس سے یہ گمان اغلب ہے کہ اس نے ضرور کشمیر کی سیر کرلی ہوگی اگرچہ اس کے سوانح میں اس کے دورۂ کشمیر کا سرسری ذکر بھی نہیں ملتا۔

اُردو دنیا کے مقتدر نقاد اور صحافی نیاز فتح پوری نے لالہ رُخ کی حکایت کی مزید توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے ''لالہ رُخ بالکل فرضی داستان ہے اور اس داستان کو تاریخ سے مطلقاً کوئی لگاؤ نہیں لیکن جس وقت کشمیر کی ایک عمیق وساکن جھیل کے کنارے ایک سنسان باغ اور اس کے ویران کھنڈر سے نکل کر ایک خستہ حال درویش ہم کو یہ بتاتا ہے کہ اس کو لالہ رخ کا باغ کہتے ہیں تو ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ فرامرز کے نغمے شاید اب بھی یہاں گونج رہے ہیں اور لالہ رخ نقاب ڈالے ہوئے یہیں کسی گوشے میں ان نغموں کو سن سن کر بے تاب ہوئی جارہی ہے۔

لالہ رخ کی رشک آور مقبولیت کی وجوہات مختصراً بیان کرتے ہوئے نیاز صاحب کا ہی کہنا ہے ''اس مثنوی کی مقبولیت کے دو سبب تھے۔ ایک تو یہ کہ فسانہ کا پس منظر ایشیا کی وہ سرزمین ہے جو اہل مغرب کی کشش کے لیے اپنے اندر بہت کچھ عجائب وغرائب رکھتی ہے اور دوسرے یہ کہ مور نے اس میں جس تخئیل سے کام لیا ہے وہ اپنی اچھوتی، اس قدر نازک اور اور اس درجہ حیرت میں ڈال دینے والی ہے کہ مغرب اس کا تصور بھی نہ کرسکتا تھا۔ پھر ساتھ ہی ساتھ چونکہ اس کے پلاٹ میں فسانہ، رومان اور طلسم سب ہی کچھ شامل ہے اس لیے ان تمام باتوں نے مل کر اس کے اندر ایک شاعرانہ کیفیت پیدا کردی ہے اور اس کے پڑھنے کے بعد انسان ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ حسن ومحبت کی تمثالی دنیا میں پہنچ گیا ہے جس سے قطع نظر کرنے کے بعد عشق وشباب کے کوئی صحیح مفہوم تعین نہیں کرسکتا''۔

□

Ghulam Nabi Khayal, 15- Rawalpora Housing Colony, Srinagar - 190005 Kashmir

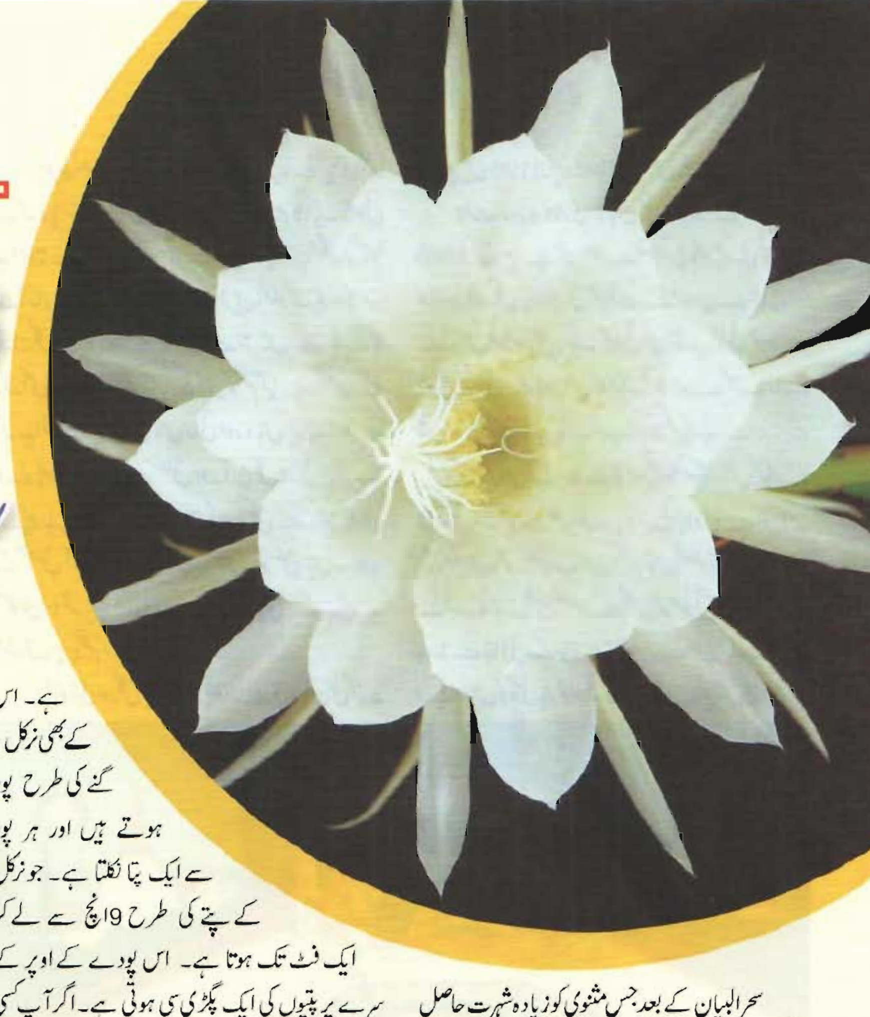

قصہ گل بکاؤلی کا تحقیقی مطالعہ

ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی

سحرالبیان کے بعد جس مثنوی کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی وہ دیا شنکر نسیم کی 'گلزار نسیم' ہے۔ یہ مثنوی نہال چند لاہوری کے نثری قصے 'مذہب عشق' کا منظوم ترجمہ ہے۔ لیکن نسیم نے اس بے جان قصے کو اپنے فکر و فن کی بے پناہ صلاحیتوں کی مدد سے اس طرح زندہ جاوید بنا دیا ہے کہ مذہب عشق کی طرف ذہن بھی نہیں جاتا۔ اس مثنوی میں لکھنوی شاعری کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ صنائع و بدائع، بندشوں کی چستی اور تشبیہات و استعارات کی وجہ سے معمولی قصے میں بھی جان پڑ گئی ہے۔ منظر نگاری کے بھی عمدہ نمونے ملتے ہیں، لیکن سحرالبیان کے مقابلے میں اکثر کمتر درجے کے ہیں۔ بعض مقامات پر تکلف اور تصنع کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن طبیعت پر زیادہ بار نہیں گزرتا۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ سحرالبیان کی خوبیوں کی چمک دمک کے سامنے گلزار نسیم کی خوبیاں دھندلا سی گئی ہیں لیکن اس کی فنی عظمت سے انکار کوئی نقاد نہیں کر سکتا ہے۔

گل بکاؤلی ایک حقیقی پھول ہے جو سائز میں موگرے کے پھول کے برابر ہے اس کی پتیاں کول ہیں لیکن بیچ بیچ میں چند نوکیلی پتیاں بھی ہیں۔ سب پتیاں موگرے کے پھول کی پتیوں سے باریک ہیں۔ پھول سفید ہے لیکن بیچ میں ذرا سا زعفرانی پن بھی ہے۔ اس کا پودا نرکل کی طرح ہوتا ہے اور اس کی جھنڈ میں پایا جاتا ہے۔ اس کے بھی نرکل یا گنے کی طرح پور ہوتے ہیں اور ہر پور سے ایک پتا نکلتا ہے۔ جو نرکل کے پتے کی طرح 9 انچ سے لے کر ایک فٹ تک ہوتا ہے۔ اس پودے کے اوپر کے سرے پر پتیوں کی ایک پگڑی سی ہوتی ہے۔ اگر آپ کسی گنے کے اوپر کے پتوں کو اس کے ڈنڈے سے چند انچ اوپر سے کاٹ دیں تو پتے جس طرح ڈنڈے کے گرد لپٹے ہوئے نظر آئیں گے۔ اسی طرح بکاؤلی کے پھول کا اوپر کا سرا ہوتا ہے۔ اس کی پگڑی نما چوٹی کے بیچوں سے کلیاں نکلتی ہیں اور ان سے پھول برآمد ہوتا ہے پودے کے سرے سے چار پانچ پھول نکل آتے ہیں۔ پھول کی مہک بڑی خوشگوار ہوتی ہے۔

گل بکاؤلی کی کہانی میں یہ پھول اپنی شہرت پر کہ وہ آنکھ کی روشنی کے لیے مفید ہے، قصے کی بنیاد بنا ہے۔ آج کل اس کا خشک پھول دو دو روپے میں فروخت ہوتا ہے اور مقامی دوا ساز ایک پھول لے کر اس میں گائے کا گھی اور کافور اور جانے کیا کیا ملا کر دوا بناتے ہیں جس کی چھ ماشے کی شیشی گیارہ روپے میں فروخت ہوتی ہے۔ شیوراتری کے موقع پر اس وادی میں میلہ لگتا ہے جس میں دو سے تین لاکھ کے قریب مسافر آجاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اس دن یہ شیشیاں پندرہ سے بیس ہزار فروخت ہو جاتی ہیں۔ اتنی شہرت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس پھول کے خواص کی باتیں صدیوں سے ہر طرف پھیلتی رہی ہیں۔ گل بکاؤلی اتنا پیدا ہی نہیں ہوتا ہے کہ اس سے پندرہ بیس ہزار شیشیاں تیار کی جاسکیں۔ اب جانے دوا ساز کیا کرتے ہیں۔ یہ پودا بے حد نازک ہوتا ہے صرف اس جگہ زندہ رہتا ہے جہاں بہت سی شرطیں پائی جائیں۔ سردی اور گرمی دونوں خاص حدوں کے اندر پائی جائیں اور اس کی جڑوں کو بارہ مہینے نمی ملتی رہے لیکن پانی نہ رکے اور بہتا ہی رہے۔ یہ پودا ایسے درخت کے سایے میں رہے کہ دھوپ خاص مقدار میں ملے نہ کم ہو اور نہ زیادہ۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس طرح جیسے پیراسائٹ بیلیں درختوں پر ہوتی ہیں اور ان کی حاصل کردہ غذا کو چرا لیتی ہیں اسی طرح یہ پودا بھی چور ہے لیکن پورا نہیں ادھورا ہے۔

گل بکاؤلی ایسے درخت کے سایے میں نشو و نما پاتا ہے جس کی جڑیں ایسی ہوں کہ بکاؤلی کے پودے کی جڑیں زمین کے نیچے جا کر ان سے غذا چرا سکتی ہوں ایسی سخت شرطوں کی وجہ سے اس وادی میں بھی صرف چند مقاموں پر بکاؤلی کے جھنڈ پائے جاتے ہیں چونکہ یہ پودا دوا کے لیے درکار ہوتا ہے اس لیے محکمہ جنگلات نے اس کو جگہ جگہ اگانے کی کوشش کی لیکن ان کا کہنا ہے کہ ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی لیکن مستقبل میں ہو سکتی ہے۔ یہ پودا جہاں تک معلوم ہوا ہے ابھی تک صرف امرکنٹک کی وادی میں پایا جاتا ہے۔ یہ وادی ایک پلیٹو پر واقع ہے جس کی بلند ترین سطح 35000 فٹ تک جاتی ہے۔ اس کے وسط میں تین سوتے ہیں جو برابر جاری رہتے ہیں۔ جس میں سے ایک سوتا بہتا ہوا مغرب کی جانب جاتا ہے اور دریائے نرمدا کہلاتا ہے۔ باقی دو سوتے بھدر اور سون کہلاتے ہیں جو چند گز جا کر مل جاتے ہیں اور پھر مشرق کی طرف جا کر دریائے سون بن جاتے ہیں۔ ان دونوں کے پاس مندر ہیں جن میں سے چند تو ایسے ہیں جن کی بناوٹ اور خستہ حالت بتاتی ہے کہ وہ تقریباً 1500 سال پرانے ہیں لیکن وہ اب استعمال نہیں ہوتے ہیں۔ کیونکہ سوتوں

نے جگہ بدل لی ہے اب ان ستونوں کی جگہ نئے مندر بن گئے ہیں اور مسافر دیکھنے جاتے ہیں۔ امرکنٹک جنوبی ہندوستان کے پلیٹو پر واقع ہے۔ کٹنی اور رائے پور کے درمیان ایک اسٹیشن پنڈرہ پڑتا ہے، وہاں سے ایک سڑک جاتی ہے جس پر 45 کلومیٹر طے کرنے کے بعد امرکنٹک آجاتی ہے جیسے ہی اسٹیشن سے آگے بڑھو بے حد گھنے جنگل ملتے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک سال کے درخت ہیں جو 30 فٹ سے زائد اونچے ہیں۔ ان کے نیچے گھنے پودے اور کہیں کہیں اوپر بیلیں بھی ہیں۔ یہ جنگل مسلسل چلا جاتا ہے۔ جنگل میں جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی بستیاں واقع ہیں جہاں چھتیس گڑھی آدواسی رہتے ہیں۔

ایک روایت ہے کہ شیوجی جب سمندر سے نکلا ہوا سبھی زہر پی گئے تو ان کے کنٹھ سے پسینے کے قطرے گرے۔ ان سے نرمدا اور سون بھدر ندیاں پیدا ہوگئیں۔ اس صورت میں اس مقام کا اصلی نام 'امر کنٹھ' تک ہوگیا۔ اسی وجہ سے یہ مقام پوتر استھان سمجھا جاتا ہے۔ دوچار یاتری وہاں روز آتے رہتے ہیں مگر شیوراتری کے موقع پر کئی لاکھ کا مجمع ہوجاتا ہے۔ یہ بات مشہور ہے کہ امرکنٹک ہی گل بکاؤلی کی کہانی کا محل وقوع ہے اس سلسلے میں ایک کتابچہ بھی لکھا گیا ہے اس کے چند اقتباسات دیکھیے مگر پہلے دو مراسلات پر غور کیجیے۔

'بحوالہ ہماری زبان'، یکم مارچ 1960 زمانہ قدیم میں ریواں ریاست علاقہ بندیل کھنڈ میں بکاؤلی نام کی ایک رانی ہوئی ہے۔ وہاں شہر سے دور بانسوں کے گھنے جنگل میں اس کا ایک باغ ہے اور اسی سے منسلک ایک بارہ دری بھی ہے۔ جو اب تک اسی سے منسوب چلے آتے ہیں۔ باغ کے چاروں طرف وسیع اور گہرا دلدل ہے جس کی وجہ سے انسان کی رسائی باغ تک ممکن نہیں ہوتی۔ اونچی دیواروں کے اندر وہاں کیا ہے؟ اس کا انسان کو کوئی علم نہیں۔ ریاست نے دلدل کے بھروانے کی بھی بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ واقف لکھنوی نے اپنے ایک عزیز کے حوالے سے اس واقعہ کو ادیب اردو لکھنؤ صفحہ 10 ماہ جون 1921 میں قلم بند کیا ہے۔ یہ عزیز محکمہ پولیس میں افسر تھے۔ ڈاکوؤں کے تعاقب میں ایک مرتبہ متذکرہ بالا جنگل میں جا نکلے۔ وہاں انھیں ایک چہار دیواری نظر آئی جس کے وسط بیرونی میں ایک بارہ دری سنگ سرخ وسنگ مرمر کی بنی ہوئی تھی۔ اس کے چاروں طرف دلدل تھا۔ شہر میں آکر مزید معلومات بہم پہنچائیں۔ تاریخ ریواں دیکھی تو معلوم ہوا کہ وہاں بکاؤلی نام کی کوئی رانی ہے اور وہ بارہ دری اسی کی بنوائی ہوئی ہے۔

مزید بحوالہ 'پیسہ اخبار' واقف صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ریاست ریواں میں کہیں بکاؤلی نام کا ایک پھول پیدا ہوتا ہے جو امراض چشم کے لیے مفید ہے 'گلزار نسیم' کے آغاز میں پورب میں سلطان زین الملوک کا ہونا اور افسانہ گل بکاؤلی کو اگلے لوگوں سے نثر میں سنے جانے کا مذکور بھی ہے۔ دیا شنکر نسیم نے اسی کو نظم کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ افسانہ ریواں کی اس رانی اور وہاں پر پیدا ہونے والے پھول بکاؤلی سے متعلق ہو۔ آج کل ہوائی جہاز کے ذریعے باغ کی تحقیقات کماحقہ کی جاسکتی ہے۔ نیز پھول کے متعلق بھی معلومات ذریعہ تحقیق ہو سکتی ہیں۔ بنا بر آگاہی ناظرین ہماری زبان کی دلچسپی کے لیے یہ انکشاف سپرد قلم کررہا ہوں۔

''بکاؤلی اور گل بکاؤلی'' (بحوالہ ہماری زبان علی گڑھ یکم اپریل 196 از پروفیسر مسعود حسن رضوی:

ہفت روزہ ہماری زبان علی گڑھ کے یکم مارچ 1960 کے پرچے میں حضرت معراج دھولپوری کا ایک مراسلہ قصہ گل بکاؤلی کی حقیقت کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس موضوع پر ایک چھوٹی سی کتاب کافی عرصہ ہوا شائع ہوچکی ہے اور اس کا ایک نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ کتاب اب بہت کم یاب ہے اور بہت کم لوگوں کو اس کے مطالعے کا موقع ملا ہوگا۔ اس کتاب کا نام 'گلدستہ حیرت معروف بہ تواریخ بکاؤلی' ہے اور اس کے مصنف محمد یعقوب ابن اکبر خاں لکھنوی ہیں جنھوں نے قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ کے رئیس محمد عبدالسمیع ولد شیخ رحیم باسط سے بکاؤلی کے حالات معلوم کرکے اس کتاب میں لکھ دیے اور اس کو پہلی بار خواجہ محمد وزیر نے اپنے پریس گلزار محمدی

قصہ گل بکاؤلی پر مبنی شہزادی کے محل کی ایک خیالی تصویر

لکھنو سے 1293 ھ کی ابتدا میں شائع کیا۔ اس کتاب میں شائع بکاؤلی کے قصے کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

ملک دکن میں کونجوت نامی ایک بہت بڑا راجہ تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے شاستر جوگ اور راج بھوج۔ اس نے اپنی وسیع مملکت میں سے ایک ایک حصہ دونوں بیٹوں کو دے کر الگ کر دیا۔ چھوٹے بیٹے راج بھوج کے حصے میں ایک بہت بڑا جنگل اور اس جنگل میں ایک بہت بڑا اور بہت گہرا تالاب تھا۔ اس نے ریاضی دانوں، حکیموں اور ساحروں کی مدد سے اس تالاب کے بیچ میں ایک قلعہ بنوایا وہاں تک اس میں رہنے والوں کے سوا کوئی اور نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے مکان اور باغ تیار کروائے۔ راجہ بھوج کی اولاد زندہ نہ رہتی تھی۔ آخر میں ایک حسین وجمیل لڑکی پیدا ہوئی جو بعد کو بکاؤلی کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس کو خوشبو اور پھولوں کا بہت شوق تھا۔ راجہ نے اس کے لیے کئی باغ اور حوض بنوا دیے۔ ایک دن سوہن پھورا نامی ایک کامل درویش اپنے کمال کے زور سے بکاؤلی کے باغ میں آ گیا اور اس کے حسن پر فریفتہ ہو کر بولا کہ جس طرح حسن میں تیرا کوئی مثل نہیں اسی طرح تیرا باغ بھی بے مثل ہونا چاہیے۔ ایک جزیرے میں ایک بہت بڑے ساحر کے باغ میں ایک درخت ہے جس کے پھول خوب صورتی اور خوشبو میں بے نظیر ہیں۔ اس باغ میں کوئی جا نہیں سکتا مگر میں وہ درخت لا سکتا ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تو شادی نہ کرنا بکاؤلی نے جواب دیا کہ میں اپنی خوشی سے شادی نہ کروں گی لیکن ماں باپ کے ہوتے میرا کیا اختیار ہے۔ درویش بولا کہ اپنے قول سے مکر نہ جانا ورنہ تو کسی کے ہاتھ نہ لگے گی اور میرا تیرا حال ایک سا ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور چند روز کے بعد اس نے وہ درخت لا کر بکاؤلی کے باغ میں لگا دیا۔ صبح کو جب بکاؤلی سو کر اٹھی تو اس درخت کے پھولوں کی خوشبو سے اس کا دماغ معطر ہو گیا وہ بہت خوش ہوئی اور درویش سے کہا کہ اب آپ اسی باغ میں رہا کریں۔ اس دن سے اس پھول کے نام پر اس کا بھی بکاؤلی نام پڑ گیا۔

جب بکاؤلی جوان ہو گئی تو اس کی شادی کے پیغام آنے لگے۔ آخر اس کے باپ نے ایک نسبت منظور کر لی۔ بڑی دھوم دھام سے برات آئی۔ درویش کو خبر ہوئی وہ اس وقت ایک حوض کے کنارے بیٹھا ہوا تھا اور بکاؤلی ایک دوسرے حوض پر غسل کے لیے لائی گئی تھی۔ درویش نے بددعا کی اور بکاؤلی اور درویش دونوں پانی ہو کر بہہ گئے۔ بکاؤلی کا قلعہ اور باغ مدتوں قائم رہا۔ ان کی کیفیت جو اس کتاب میں لکھی گئی ہے وہ بہت اختصار کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔

تاریخی اعتبار سے اس پر قصہ اس طرح ہے:

ناگپور کمشنری کے ضلع منڈلا کی تحصیل رام گڑھ میں امر کنٹک نام کا ایک جنگل کئی میل تک چلا گیا ہے جنگل کے ایک بہت بڑے رقبے میں ایک دلدل ہے اور دلدل کے بیچ میں ایک قلعہ ہے جو بارہ کوس کے فاصلے سے دکھائی دیتا ہے۔ دن رات وہاں سے دھواں اٹھا کرتا ہے اور رات کو بہت روشنی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بکاؤلی کا قلعہ ہے۔ اس جنگل میں ایک جگہ بہت سے عجیب قسم کے درخت ہیں جن کے پھولوں میں ایک نئی طرح کی بہت اچھی خوشبو ہے یہ جگہ بکاؤلی کا باغ اور یہ پھول بکاؤلی کے پھول کہلاتے ہیں۔ ان پھولوں کا عرق آنکھوں کے درد کو دور کرتا ہے۔ لیکن بکاؤلی کا باغ بھی دلدل سے گھرا ہے اس لیے یہ پھول مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ بکاؤلی کے باغ تک پہنچنا ممکن ہے مگر قلعہ تک رسائی محال ہے۔

1266 ھ میں ناگپور کے چیف کمشنر ٹیمپل صاحب کوئی سوا سو مسلح انگریزوں اور بہت سے دیسی لوگوں کو ساتھ لے کر 80-70 ہاتھیوں پر سوار ہو کر جن میں کچھ شکاری ہاتھی پر بھی تھے بکاؤلی کا باغ اور قلعہ دیکھنے کے لیے چلے۔ خشکی کا راستہ طے کر کے ہاتھی بہت مشکل سے تین چار کوس دلدل میں چلے گئے لیکن دلدل کی گہرائی بڑھتی گئی یہاں تک کہ جب قلعہ 9 کوس کے فاصلے پر رہ گیا تو آگے بڑھنا ممکن نہ رہا۔ قلعہ وہاں سے دکھائی دیتا تھا اور دور تک دھواں اور روشنی نظر آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہیں بہت دور آگ لگی ہوئی ہے۔ محکمۂ جنگلات کے داروغہ میر قدرت علی نے اگست 1872 میں امر کنٹک کے جنگل کا نقشہ کھینچا تھا جس میں بکاؤلی کے باغ، حوض، قلعے اور دوسری عمارتوں اور باغوں وغیرہ کی جائے وقوع دکھائی گئی ہے۔ اس نقشے کی نقل

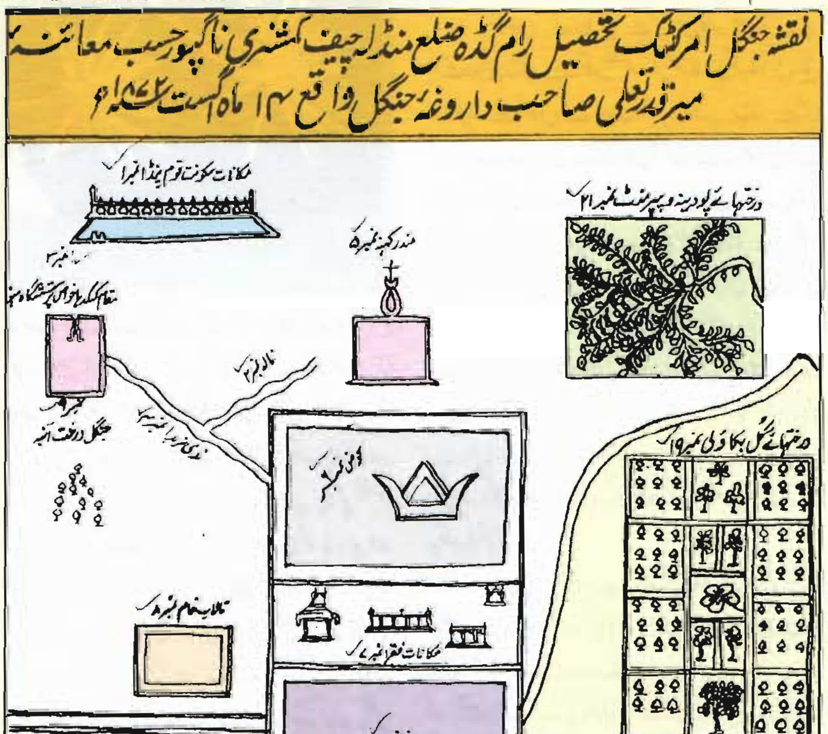

بھی اس کتاب میں شامل ہے (مراسلہ تمام)

اس کتاب کی شاید اب صرف ایک کاپی پائی جاتی ہے جو مسعود حسن رضوی مرحوم کے کتب خانے سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ نادر ہونے کی وجہ سے اس کے ٹائٹل کا بھی فوٹو مضمون کے ساتھ دیا جا رہا ہے۔ کتاب کا ابتدائی حصہ جس کا خلاصہ مسعود صاحب کے مراسلے میں موجود ہے وہ تو ایک طرح کا دیو مالا ہے اس لیے اس کو ترک کر کے باقی حصہ مع نقشے کے نقل کیا جا رہا ہے۔

نقشہ اور اس کی جو تفصیل کتاب میں دی گئی ہے وہ پیش خدمت ہے پہلے نقشہ دیکھیے اور پھر نمبر وار اس کی تفصیل:

نمبر 1 مکانات پختہ ہوئے ہیں اور ان مکانات میں قوم پنڈارہا کرتی ہیں۔

نمبر 2 یہ نالا نربدا سے نکل کر شمال جانب چلا گیا ہے۔

نمبر 3 یہ مقام حوض سے قریب نصف میل کے ہے اور نام اس کا کیل دھار وخاص پرستش ہنود کی ہے۔ اور یہ مقام برجائے کیفیت اور بہت بلندی پر ہے۔ پانی اس مقام پر قریب 200 ہاتھ کی بلندی سے گرتا ہے۔ اور پانی کی چادر قریب 80-70 ہاتھ کے چوڑی ہے۔

نمبر 4 یہ ندی نرمدا نمبر 6 سے نکلتی ہے۔ اس جگہ تانبے کی ٹونٹی جس طرح چھوٹے لوٹے کی ہوتی ہے۔ لگا دی گئی ہے۔ اس سوراخ سے حوض کا پانی نکلتا رہتا ہے اور کسی دریا سے نکل کر سیدھے سمندر سے جا ملا ہے۔

نمبر 5 یہ مندر خاص بکاؤلی کی پرستش کا ہے۔ اس زمانہ میں اس کو مندر نہیں کہتے تھے۔ اس کا کچھ اور نام تھا مگر اب اس کو مندر بکاؤلی کہتے ہیں۔

نمبر 6 7,13۔ یہ حوض ایک تھا۔ مگر درمیان میں مٹی کا پشتہ بن گیا ہے۔ 4,5 سو سال عرصہ سے دو حوض ہو گئے ہیں۔ پشتہ پر فقرا کے مکانات بنا دیے گئے ہیں جس سے، یہاں پر فقرا سیاح آکر قیام کرتے ہیں۔

نمبر 8 یہ تالاب خام مگر پختہ سے زیادہ مضبوط ہے اور اس سے متصل جنگل ابنہ کوسوں چلا گیا ہے اور اس ابنہ کا رس شیریں اور پتلا ہے اور اس کا تخم چھوٹا بوزن ایک چھٹانک کے برابر ہوتا ہے۔ قوم بگاد، گورز و جاموز وغیرہ کھاتے ہیں۔

نمبر 9 اس مقام پر ابنہ کا جنگل ہے۔

نمبر 10 یہ راستہ مندر سے امرکنٹک کو گیا ہے کہ جہاں حوض بکاؤلی ہے۔

نمبر 11 یہ پختہ چبوترا ہے جو نام نہاد بیر بکاؤلی مشہور ہے یعنی ہر ہفتہ میں بکاؤلی اس مقام پر آکر مع اپنی سہیلیوں کے سیر کیا کرتی تھی۔

نمبر 12 یہ مندر کہنہ گرد حوض کے بنے ہوئے ہیں۔

نمبر 13 یہ حوض نمبر 6 سے دو ٹکڑے کر دیا گیا ہے۔

نمبر 14 اس جگہ املی و جامن اور کیلے کے درخت منزلوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔

نمبر 15 اس مقام پر قوم گونڈ آباد تھی۔

نمبر 16 یہ ندی سوہن بھدر حوض نمبر 13 سے نکل کر اثنا راہ کلکتہ شہر کتانی میں جا کر مل گئی ہے۔

نمبر 17 یہ قلعہ خاص سکونت بکاؤلی ہے اور حوض سے 12 کوس کے فاصلہ پر واقع ہے اور اس کا راستہ حمالہ کے مکان کے نیچے ہو کر ہے۔ اس مقام پر دلدل کی کثرت ہے۔ 10 سے 12 کوس سے یہ قلعہ دکھلائی دیتا ہے اور شب و روز ایک دھواں اٹھا کرتا ہے اور رات کو بہت روشنی معلوم ہوتی ہے۔ کہ جیسے کہیں آگ لگی ہوئی ہے۔ چنانچہ چیف کمشنر

بکاؤلی کا پھول

صاحب بہادر ملک ناگپور نے قوم ننگا و گووند وغیرہ کو سکونت ان ہی جنگلوں میں رکھتے ہیں۔ ان کو طلب کیا اور کہا کہ ہم قلعہ بکاؤلی دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا باغ بکاؤلی تک تو پہنچ سکتے ہیں مگر قلعہ بکاؤلی اور حمالہ کی گڑھی تک کوئی نہیں جا سکتا ہے۔ چنانچہ محتشم صاحب الیہ نے صاحبان انگریز گرد و نواح کو بذریعہ خط اطلاع دی کہ ہم بکاؤلی کا باغ دیکھنے جاتے ہیں۔ جس کا دل چاہے وہ فلاں تاریخ کو اس مقام پر پہنچ جائے چنانچہ قریب سوسوا سو انگریز جمع ہوئے اور تجویز ہوئی کہ ہاتھیوں پر سوار ہو کر چلنا چاہیے۔ چنانچہ ہر ایک جگہ سے ہاتھی طلب کروائے اور کچھ ہاتھی شکاری بھی تھی۔ تقریباً 80-70 ہاتھی کے غول کے ساتھ جمع ہوئے اور فی ہاتھی دو دو انگریز ہتھیار بند اور دو دو قوم بیگا سوار کر کے اور کچھ ولایتی ڈاکٹر بھی مسلح سوار ہو کر بکاؤلی کے قلعہ کی جانب روانہ ہوئے۔ مگر تین چار کوس تک ہاتھی بہ مشکل تمام اس دلدل میں چل سکے۔ سانپ، جونک اور بچھو وہاں بکثرت تھے جو ہاتھی کے ہودے کے برابر پہنچتے تھے۔ جب دلدل ہودے کے قریب پہنچ گیا اور ہاتھی ڈوبنے کے قریب ہو گئے۔ اس وقت ہاتھی اور صاحبان ہاتھی بہت گھبرائے، جونکیں وغیرہ ہودے کے اندر آنے لگیں۔ اس وقت گڑھی حمالہ اور قلعہ بکاؤلی صرف 3 اور 9 کوس کے فاصلہ پر رہ گیا تھا۔ وہ بخوبی نظر آتا تھا۔ اس وقت حمالہ کے مکان سے بکاؤلی کا قلعہ ایک روشنی اور دھواں نظر آتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہیں دور آگ لگی ہے اور گرمی بھی معلوم ہوتی تھی باوجود کہ سردی کا موسم تھا۔ اس راستے میں ایسی تکلیف اور کیفیت تھی جیسے جادو کی ہوتی ہے۔ بجز دیکھنے کے میں کچھ اور لکھ نہیں سکتا ہوں اور خوشبو کی یہ کثرت تھی کہ سر درد ہونے لگا۔ ہر چند ہاتھیوں کو ہانکا مگر دلدل کے سبب نہ جا سکے۔ سب بیگار گونڈ جو ہمراہ تھے انھوں نے کہا کہ ہماری عمر قریب سو سو برس کے ہوئی ہے۔ آج تک اس مقام پر نہیں آئے اور نہ انسان کی مجال ہے کہ سوائے اس کیفیت کے کہ اگر ہاتھی سواری کے نہ ہوتے اور اس قدر اجتماع نہ ہوتا تو کسی نوع سے آنا نہ ہوتا۔

بزرگوں سے سنا گیا ہے کہ اس قلعہ میں آگ ہر وقت روشن رہتی ہے۔ قلعہ طلسم و سحر قسم کا ہے مگر ڈاکٹر ویتی جو ہمراہ تھے انھوں نے چیف کمشنر صاحب بہادر سے کہا کہ یہ سب غلط بیان ہے نہ وہاں آگ ہے نہ دھواں سب دلدل کی گرمی اور بخارات اور اس کا دھواں ہے۔ چونکہ قلعہ محض جنگل میں ہے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جگنو وہاں بکثرت ہیں جن کی روشنی رات کو نظر آتی ہے۔ اس جگہ دلدل بہت ہے اور کوئی آدمی وہاں جا نہیں سکتا اس وجہ سے مفصل حال معلوم نہیں ہوتا۔ دراصل یہ مقام بہت بڑے انجینئر کا بنایا ہوا ہے اور کچھ جادو کے قسم کا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا مکان ایسے مقام پر تیار کرنا بہت بڑے ریاضی داں اور انجینئر کا کام ہے۔ نہ معلوم کہ کس علم کے زور سے یہ قلعہ قائم کیا ہے۔

اور کس چیز پر قائم ہے۔ کچھ عقل کام نہیں کرتی ہے۔ یہ طلسمات دیکھ کر قصہ بکاؤلی بہت صحیح معلوم ہوتا ہے۔ چیف کمشنر صاحب بہادر نے کہا کہ یہ سب درست ہے مگر قصہ لکھنے والے نے یہ کچھ عجائبات نہیں لکھے ہیں اور نہ کچھ تعریف انجینئر کی لکھی ہے۔ بلکہ اس کے قصہ سے زیادہ طلسمات دکھائی دیتے ہیں۔ نہ معلوم کہ قلعہ اور گڑھی حمالہ میں کیا کیفیت ہوگی۔ آخر میں چیف کمشنر بہادر بے نیل و مرام واپس آئے۔

نمبر 18 یہ گڑھی حمالہ کی مشہور ہے اور حوض سے 6 کوس پر ہے اس جگہ بہترین خوبصورت منظر ہیں جو دلوں کو اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں۔

◘

Dr. Abdussalam, N 139-B, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi 110025

حبیب احمد

مولانا آزاد کی صحافت نیرنگِ عالم سے الہلال تک

علم و ادب کی دنیا میں دو ہستیاں ایسی بھی گزری ہیں جو یکتائے روزگار ہونے کے ساتھ ساتھ جامع صفات بھی ہیں ان میں سے ایک مولانا عبدالماجد دریابادی کی ذات گرامی ہے اور دوسری مولانا ابوالکلام آزاد۔ جہاں مولانا دریابادی صف اوّل کے عالم مفسر قرآن، صاحب طرز انشا پرداز اور سحر طراز صحافی تھے۔ وہیں مولانا آزاد مذکورہ صفات کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے خطیب، مدبر، بہترین سیاست داں ماہر تعلیم اور خوش فکر شاعر بھی تھے۔

اسے اتفاق ہی کہیے کہ ہر دو شخصیات نے تشکیک کے مختلف مراحل سے گزر کر مذہب کی طرف مراجعت کی، مولانا دریابادی کے ذہن پر چھائی ہوئی فلسفے کی دھند نے مذہب کو ان کی نظر سے اوجھل کر دیا تھا تو مولانا آزاد بقول خود ''سرسید کے عقائد و افکار سے متاثر ہو کر اعراض و انکار کی راہ نکل آئے''۔ ہر دو اصحاب کے اخبار انگریزوں کی دست درازی کے طفیل پریس ایکٹ کا نشانہ بنے۔ مولانا دریابادی کا ہفت وار سچ۔ سچ سے صدق اور صدق سے صدق جدید ہوا تو مولانا آزاد کو الہلال کا نام بدل کر ابلاغ اور ابلاغ سے پھر الہلال رکھنا پڑا۔

جیسا کہ ہم سب واقف ہیں مولانا آزاد مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے اور والدین کے ساتھ کلکتہ میں آبسے، جہاں ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ بسر ہوا (یعنی 45) سال۔ انھوں نے اپنی تعلیم و تربیت کی تمام منزلیں اسی شہر دلفریب میں طے کیں اور یہیں سے ان کی شخصیت کی تشکیل کا آغاز ہوا۔ سن شعور کو پہنچتے ہی انھوں نے اپنا پہلا قدم ادب کی دنیا وادیٔ شعر و سخن میں رکھا اور پھر شاعری کی راہ سے ہوتے ہوئے وہ صحافت کی شاہراہ اور سیاست کے میدان میں پہنچے۔ مولانا کی ذہنی تربیت و تشکیل جن عناصر سے ہوئی تھی ان میں درونِ خانہ کا ماحول اور شعر و ادب سے معمور فضا بھی شامل تھی۔ یہی ماحول مولانا کی شاعری کا محرک بنا۔ مولانا نے اوائل عمر میں ایک طرحی مصرع 'پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی' پر گیارہ اشعار پر مشتمل ایک غزل کہی جو گلدستہ 'ارمغانِ فرخ' (بمبئی) میں شائع ہوئی۔ یہ مولانا کی پہلی ادبی کاوش تھی جو صفحۂ قرطاس پر نمایاں ہوئی، فطری طور پر انھیں اپنا نام چھپا ہوا دیکھ کر ایک گونہ مسرت کا احساس ہوا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ 'ل' آج بھی جب 36 برس گزر چکے ہیں میں اپنی وہ خوشی پوری طرح محسوس کر رہا ہوں جو مجھے اس وقت محسوس ہوئی تھی جب ارمغان فرخ میں یہ غزل چھپ کر آئی تھی اور زندگی میں پہلی بار اپنا نام رسالے میں چھپا ہوا دیکھا (آزادی کی کہانی) غزل کی اشاعت سے مولانا کے دل و دماغ میں شمع سخن روشن ہوگئی اور انھوں نے شاعری سے اپنا رشتہ باقاعدہ استوار کر لیا۔ ان کا کلام مختلف گلدستوں پیغام، انتخاب اور خدنگ نظر میں چھپنے لگا۔ اسی دوران انھیں گلدستہ شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا کہ ان کے نزدیک شاعری کی تکمیل کے لیے اس منزل کا طے کرنا بھی ضروری ہے۔ نہ صرف شاعری کی تکمیل کے لیے اس منزل کا طے کرنا بھی ضروری تھا بلکہ مولانا آزاد کے خیال میں سب سے بلند مقام جو کسی انسان کے لیے ہوسکتا تھا وہ یہ تھا کہ مضامین لکھے جائیں اور اپنے ہی نام سے شائع ہوں اور اس کے بعد اس سے بلند تر مقام یہ تھا کہ کسی اخبار یا رسالے کے ایڈیٹر ہوں۔''

(ابوالکلام آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی)

مولانا بالآخر انسان ہی تھے ان کی اس خواہش کو مولانا ابوالکلام آزاد سے جوڑ کر دیکھتے ہیں تو یقین نہیں ہوتا لیکن انھوں نے جب یہ خواہش ظاہر کی تھی تو وہ صرف محی الدین اور ان کی عمر گیارہ سال تھی۔ چنانچہ ہریسن روڈ پر واقع ہادی پریس سے ماہنامہ 'نیرنگ' عالم 1890-1899 کے درمیان جاری کیا۔ جو چند ماہ جاری رہنے کے بعد بند ہوگیا۔ اردو صحافت کی تاریخ میں غالباً پہلی اور آخری مثال ہے کہ گیارہ سال کی عمر میں کسی نے باقاعدہ ادارت کے فرائض انجام دیے ہوں۔

دستیاب ذخیرے کی رو سے مولانا نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کی، اردو میں صرف دو غزلیں، تین رباعیاں، چند متفرق اشعار کے علاوہ فارسی میں ایک غزل، پانچ رباعیاں ایک تضمین اور ایک قطع تاریخ ان کی یادگار میں سے ہیں۔

مولانا کا شاعری سے شغف ایک ابر بہار کی طرح تھا جو برسا اور برس کر رہ گیا۔

1900 کے اواخر میں مولانا آزاد نے مصر سے شائع ہونے والے اخبار 'مصباح الشرق' کی طرز پر ایک ہفتہ وار اخبار 'المصباح' جاری کیا بقول مولانا آزاد یہ دراصل پہلا اخبار ہے جو میں نے ایڈٹ کیا۔ یہ ٹھیک 1900 کے اواخر کی بات ہے۔''

صحیح معنوں میں 'المصباح' سے مولانا آزاد کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔ 'المصباح' کا پہلا شمارہ عیدالفطر کے موقع پر منظر عام پر آیا تھا۔ اس میں مولانا نے ایک مضمون 'عید' کے عنوان سے لکھا اس مضمون کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی۔ معاصر اخباروں نے اپنے کالموں میں اس پر تبصرے شائع کیے۔

مولانا آزاد نے نیرنگ عالم میں صرف شاعری کو جگہ دی تھی لیکن المصباح میں نظم کے ساتھ نثری حصہ بھی رکھا۔ نیز مختلف موضوعات کے لیے صفحات مقرر کیے۔ مثلاً ایک صفحہ علمی مضامین کے لیے، ایک صفحہ تاریخ اور سوانح عمری کے لیے ایک صفحہ سائنسی مضامین کے لیے وغیرہ۔

حالانکہ مولانا نے مضمون نویسی کی ابتدا اوائل عمر ہی

میں کردی تھی۔ لیکن ان کے نزدیک مشق سے زیادہ نہ تھی شاید اسی لیے وہ نیرنگ عالم میں چھپنے، چھپانے سے گریز کرتے رہے لیکن المصباح کی ادارت سنبھالنے تک ان کے قلم میں اعتماد اور تحریروں میں پختگی آچکی تھی لہٰذا ان کا اشہب قلم دوڑنے لگا اور ان کے تحریر کردہ مضامین دیگر موقر اخبارات ورسائل میں بھی نقل کیے جانے لگے۔

'المصباح' تین چار ماہ جاری رہ کر بند ہوگیا۔ اسی اثنا میں کلکتہ سے مولوی احمد حسین کی ادارت میں 'احسن الاخبار' جاری ہو چکا تھا۔ اسے پختہ کار مضمون نگاروں کا قلمی تعاون حاصل تھا مولانا نے اس اخبار میں مختلف النوع موضوعات پر لکھنے کے ساتھ ساتھ عمر خیام، حافظ شیرازی پر بھی مضامین لکھے مولانا کی پہلی تصنیف اعلان الحق یہیں سے شائع ہوئی۔ انھوں نے بیرون ممالک سے تبادلہ میں آنے والے اخبارات و رسائل سے بھرپور استفادہ کیا جن کے مطالعہ سے مولانا کو عالم اسلام کے مسائل سے آگاہی حاصل ہوئی۔

احسن الاخبار کی اشاعت کے زمانے میں مولانا نے ماہ محرم کے دوران مسلمانوں کے عقائد و رسوم کو لے کر ایک مضمون اسلام اور محرم لکھا۔ مضمون کے شائع ہوتے ہی اہل تشیع بالخصوص ایرانیوں کا مولانا کے خلاف سخت ردعمل سامنے آیا اور مولانا کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور ان کے تعاقب کے لیے کچھ افراد کو پابند کا گیا لیکن مولانا کے والد کی مداخلت کے بعد مقدمہ کی ابتدائی کارروائیاں واپس لے لی گئیں اور کسی طرح اس فتنے کا خاتمہ ہوا۔

اسی دوران مولوی احمد حسین نے تحفہ احمدیہ کو دوبارہ کلکتہ سے جاری کرنے کا ارادہ کیا یہ اخبار پہلے کانپور سے نکلا کرتا تھا اور اس کا کام عیسائی عقائد و افکار کی تردید تھا۔ انھوں نے مولانا آزاد سے اپنا عندیہ ظاہر کیا تو مولانا نے اس شرط پر اسے سنبھالنے کی رضامندی دی کہ اس رسالے کو عام علمی و مذہبی شکل میں نکالا جائے گا۔

اس مرحلہ تک آتے آتے مولانا ایک ذمے دار صحافی کے مرتبے پر فائز ہو چکے تھے۔

تحفہ احمدیہ کی ترتیب کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد لکھنؤ سے نکلنے والے گلدستہ خدنگ نظر میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھا رہے تھے ان کی تحریروں سے متاثر ہو کر اس کے مالک منشی نوبت رائے نظر نے حصہ نثر کی ادارت کی ذمے داری مولانا کے سپرد کردی اور انھوں نے یہ فریضہ بھی بہ احسن طریق انجام دیا۔

نیرنگ عالم سے خدنگ نظر کے مدیر بننے تک کا یہ سفر مولانا کی صحافتی زندگی کا دور اوّل کہا جاسکتا ہے۔

احسن الاخبار کی اشاعت بند ہو جانے پر تبادلے میں آنے والے اخبارات و رسائل بھی بند ہونے لگے، مولانا کو اب تک لوگوں کے ذوقِ مطالعہ کا اندازہ ہوگیا تھا، چنانچہ انھوں نے اس خلا کو پر کرنے کی غرض سے مولوی محمد یوسف جعفری کے سامنے تجویز رکھی کہ ''اخبارات کے حصول کی یہی ایک راہ نظر آتی ہے کہ ایک چھوٹا ماہوار پندرہ روزہ رسالہ نکالا جائے'' انھیں مولانا کی تجویز پسند آئی اور 20 نومبر 1903 کو پندرہ روزہ لسان الصدق کے نام سے یہ رسالہ جاری ہوگیا اس سے تبادلے میں اخبارات و رسائل پھر آنے لگے۔ یہ رسالہ فل اسکیپ تقطیع پر ایک جز پر مشتمل تھا اس رسالے کی اشاعت کے مقاصد میں ادب کا دائرہ وسیع کرنا، تنقید و تبصرے کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح بھی پیش نظر تھے۔

اس رسالے کے صرف 13 شمارے منظر عام پر آئے آخری شمارہ 5 مئی 1905 کو شائع ہوا۔

لسان الصدق کو ہر مکتبہ فکر کے درمیان مقبولیت حاصل ہوئی، یہاں تک کہ اس کے قارئین کی تعداد بڑھتے بڑھتے ہزاروں تک پہنچ گئی۔ اسے معاصر اخبار نے داد و تحسین سے نوازا۔

لسان الصدق کے ان 13 شماروں نے بقول ابوسلمان شاہجہاں پوری ''مولانا کے قلم کی پختگی، اسلوب کی شگفتگی اور فکر کی نکتہ آفرینی، انشا کی دلربائی پر تحسین کے پھول برسائے۔'' مولانا آزاد کی فکر و قلم سے متاثر ہونے والوں میں علامہ شبلی جیسی بلند مرتبہ شخصیت بھی شامل تھی، انھوں نے مولانا کو الندوہ کی ادارت کی پیش کش کی۔ جو مولانا آزاد نے خوشی سے قبول کر لی۔ لیکن چند ماہ بعد ہی مولانا آزاد نے بہ وجہ اس ذمے داری سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ بقول عبدالقوی دسنوی وہ ماہ اکتوبر 1905 سے مارچ 1906 تک الندوہ کی ادارت میں شامل رہے۔

اپریل 1906 میں مولانا نے سہ روزہ وکیل کی ادارت سنبھالی، لیکن بھائی ابوالنصر یٰسین آہ کا انتقال ہو جانے کے سبب نومبر 1906 کو اس کا آخری شمارہ ترتیب دے کر کلکتہ واپس آگئے۔ یہاں آکر انھوں نے 1907 سے ہفت وار 'دارالسلطنت' کے ادارتی فرائض انجام دینا شروع کردیے، ابھی مشکل سے سات آٹھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ اگست 1907 میں 'دارالسلطنت' سے دست بردار ہو کر انھوں نے پھر سے وکیل کی ادارت سنبھال لی لیکن مختلف اسباب کی بنا پر یہاں بھی وہ زیادہ دنوں ٹھہر نہیں سکے۔

اس مرحلے پر آکر مولانا آزاد کی صحافتی زندگی کا یہ دوسرا دور اختتام کو پہنچتا ہے۔ اس مدت میں مولانا صحافت کے جملہ اصول و آداب، طور طریق اور رموز و نکات سے خوب خوب آگاہی حاصل کر چکے تھے، گویا مولانا کے تیسرے اور آخری سنہری دور میں داخل ہونے کے لیے راہ پوری طرح ہموار ہو چکی تھی۔

1905 میں بنگال کی سیاست کروٹ لے رہی تھی چونکہ لارڈ کرزن نے ''انگریزوں کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' پالیسی کے تحت بنگال کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مولانا آزاد سیاسی صورتِ حال سے بیگانہ نہ رہ سکتے تھے۔ انھوں نے بنگال کے سیاسی قائدین سے رابطہ بڑھانا شروع کیا۔ ان دنوں اربندگھوش کلکتہ میں مقیم تھے مولانا کی ان سے ملاقاتیں رہیں اس دوران مولانا کا شری شیام سندر چکرورتی سے بھی تعلق پیدا ہوا۔ چنانچہ مولانا آزاد 'ہماری آزادی' میں رقمطراز ہیں:

''چکرورتی اس وقت انقلابی کارکنوں میں ایک نمایاں مرتبے کے حامل تھے۔ ان کے واسطے میں دوسرے انقلابیوں سے ملا'' نتیجہ یہ ہوا کہ میں انقلابی سیاست کی طرف مائل ہوا اور اس کے گروپ میں شامل ہوگیا۔''

یہ مولانا کی عملی سیاست کی طرف جانے انجانے میں پیش قدمی تھی۔

1908 میں مولانا آزاد ترکی، شام، عراق، مصر اور فرانس کے سفر پر نکلے۔ انھوں نے ان ممالک میں رائج تعلیمی نظام کا بغور جائزہ لیا انھیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہاں بھی فرسودہ نظام رائج ہے۔ انھوں نے عرب اور ترک عمائدین اور انقلاب پسندوں سے ملاقاتیں کیں اور ان سے ہندوستان کے سیاسی حالت پر تبادلۂ خیال کیا۔ دوران سفر ان ملاقاتوں نے مولانا کی سیاسی فکر کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ اس سفر سے واپس آنے کے بعد مولانا کو محسوس ہوا کہ مسلمانوں میں سیاسی شعور کی بیداری کے لیے ایک اخبار کی شدید ضرورت ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس خیال کو عملی شکل دینے کے لیے کلکتہ سے ایک ہفت روزہ 'الہلال' جاری کیا، اس کا پہلا شمارہ 13 جولائی 1912 کو شائع ہوا۔

الہلال کی اشاعت نے مسلمانوں کے فکری زاویوں کو بدل دیا انھیں نئے پیمانے عطا کیے، جس نے ذہنی انقلاب کی فضا پیدا کردی۔ مولانا نے الہلال کے صفحات صرف ہندوستان کے مسلمانوں کو سیاسی طور پر منظم و متحد کرنے کے لیے ہی وقف نہیں کر رکھے تھے بلکہ اس میں طرابلس اور بلقان کے درمیان جاری جنگ کی

رپورٹیں بھی اہتمام سے شائع کیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو مذہب کی وساطت سے آزادی کے لیے منظم کرنے کی غرض سے 1913 میں ایک خفیہ سیاسی تنظیم 'حزب اللہ' کے نام سے قائم کی' اس کی رکنیت کے لیے الہلال میں اپیل بھی جاری کی۔

مولانا کی سیاسی سرگرمیوں سے ارباب حکومت بے خبر نہ تھے لیکن کوئی ٹھوس ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے ان کے خلاف تادیبی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم موقع کے متلاشی تھے یہ موقع پائینر اخبار میں مولانا کے خلاف شائع ایک مضمون نے فراہم کر دیا جس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ ان کی باغیانہ تحریروں پر گرفت کی جائے۔ چنانچہ 18 ستمبر 1913 کو پریس ایکٹ کے تحت دو ہزار روپے زرضمانت طلب کی گئی جو وقت پر پانچ دن کے اندر اندر جمع کر دی گئی۔ ابھی چودہ ماہ ہی گزرے تھے کہ نومبر 1914 کو دوبارہ دس ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی جو ادا نہیں کی گئی بالآخر اخبار بند ہو گیا۔ اس طرح الہلال کی اشاعت کے دور اوّل میں 13 جولائی 1912 سے نومبر 1912 تک کل 111 شمارے نکلے۔

الہلال نے اس مدت میں ہندو مسلمانوں کے درمیان اتحاد و یگانگت پیدا کر دی تھی۔ اس سے پہلے وہ برادران وطن کی سیاسی سرگرمیوں سے خود کو علیحدہ کیے ہوئے تھے، انھیں حکومت وقت نے اس غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا تھا کہ اگر ہندوستان آزاد ہو گیا تو ہندوؤں کی اکثریت کی بنیاد پر یہاں ہندو حکومت قائم ہو جائے گی۔ اس دوران مولانا کی سرگرمیاں برقرار رہیں، انھوں نے پھر ایک نئے عزم کے ساتھ 12 نومبر 1915 کو البلاغ جاری کیا جسے الہلال کا دور ثانی کہہ سکتے ہیں۔ البلاغ کی اشاعت کو ابھی پانچ ماہ بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ 28 مارچ 1916 کو حکومت بنگال نے مولانا آزاد کو ڈیفینس ایکٹ کی دفعہ 3 کے تحت چار دن کے اندر اندر بنگال چھوڑنے کا حکم صادر کر دیا۔ مولانا نے مہلت پوری ہونے سے پہلے ہی 31 مارچ 1916 کو البلاغ کا آخری شمارہ شائع کر کے رانچی کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ اس مدت 12 نومبر 1915 سے 31 مارچ 1914 تک کل گیارہ شمارے نکلے۔

مضمون کی ابتدا میں عرض کیا گیا ہے کہ الہلال کا نام بدل کر البلاغ کر دیا گیا تھا۔ آخر میں البلاغ پھر اپنے بنیادی نام الہلال سے جاری ہوا، اسے الہلال کے تیسرے اور آخری دور سے تعبیر کر سکتے ہیں، الہلال کے اس تیسرے اور آخری دور کا پہلا شمارہ 10 جون 1927 کو شائع ہوا۔ جو چھ ماہ جاری رہنے کے بعد 9 دسمبر 1927 کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ تیسرے اور آخری دور میں 24 شمارے شائع ہوئے۔ اس طرح الہلال کی مجموعی مدت اشاعت یعنی 13 جولائی 1912 سے 9 دسمبر 1927 تک پندرہ سال پر محیط رہی۔ اس کل مدت میں 146 شمارے منظر عام پر آئے۔

اس موقعے پر الہلال کے ظاہری پہلوؤں پر چند باتیں عرض کرنا بے محل نہ ہوگا۔

اس پرچے کی قیمت فی شمارہ ساڑھے تین آنے، ششماہی کے چار روپے بارہ آنے اور سالانہ آٹھ روپے تھی۔ مطبع کا نام الیکٹریکل پرنٹنگ ورکس اور ناشر مظہر الحق تھے جو میکلوڈ اسٹریٹ پر کلکتہ میں واقع تھا۔ یہ اس زمانے کا واحد اخبار تھا جس کا مواد کتابت کے بجائے اردو ٹائپ میں چھپتا تھا۔ پہلے شمارے کی تعداد دو ہزار تھی بعد میں یہ تعداد بڑھ کر چھبیس ہزار ہو گئی تھی۔

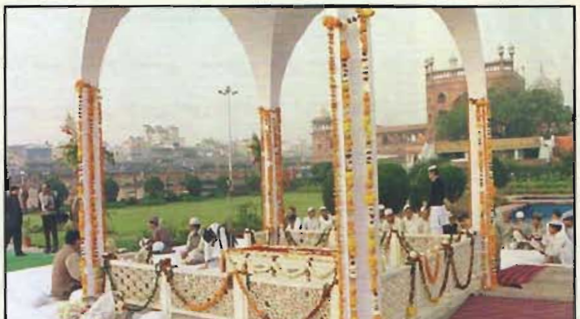

دہلی میں جامع مسجد کے نزدیک مولانا آزاد کے مزار کی ایک تصویر

مولانا کو اردو ٹائپ کی تحریک سرسید کی تصانیف کے مطالعے کے دوران ہوئی تھی کہ وہ بھی عام طور پر اردو ٹائپ میں ہوا کرتی تھی۔ مولانا کو اردو ٹائپ سے ایک گونہ لگاؤ تھا اس کو فروغ دینے کے لیے مالی خسارہ بھی برداشت کر سکتے تھے۔

مولانا تصنیفی مصروفیات کے باوجود اخبار سے متعلق جزئیات پر بھی نظر رکھتے تھے۔ رسم الخط اور املا کے معاملے میں حساس واقع ہوئے تھے ان کی تحریروں میں انگریزی الفاظ کا استعمال شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ فی زمانہ اردو میں کثرت سے انگریزی الفاظ کا استعمال کیا جا رہا ہے جب کہ ان الفاظ کے متبادل اردو میں موجود ہیں۔ مثلاً جماعت کے بجائے پارٹی، سیاسی جماعتیں کی جگہ سیاسی پارٹیاں، انتخابات کی جگہ الیکشن، رجحان کی جگہ ٹرینڈ، رائے دہندگان کی جگہ ووٹرس وغیرہ وغیرہ۔ انگریزی الفاظ کے استعمال کرنے کا جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اردو لفظیات میں اضافہ مقصود ہے۔ موجودہ الفاظ کو ترک کر کے دوسری زبان کے الفاظ کو اختیار کرنا کہاں تک معقول ہے۔

اسی ذیل میں مولانا آزاد، مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ترجمہ و کتابت میں چند امور کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ (1) بلا ضرورت انگریزی اسما و مصطلحات استعمال نہ کیجیے۔ مثلاً رپورٹ، کانفرنس، پارلیمنٹ، ایڈیٹر وغیرہ ان کے لیے روداد، بیان، موتمر، مجلس یا مجلسِ حکومت وغیرہ الفاظ کے استعمال کیے جائیں۔

اسی خط میں آگے رقمطراز ہیں ہائے مخلوط و غیر مخلوط میں فرق کیجیے۔ کھانا، انھیں وغیرہ کو دو چشمی سے، مگر نہیں، کہیں کو دو چشمی سے نہ لکھا جائے۔ آج دو چشمی کا استعمال تقریباً ختم سا ہو گیا ہے۔ یا ترک کیا جا رہا ہے۔

اسی طرح کاما اور عطف کے بارے میں لکھتے ہیں اگر تین لفظ مسلسل آجائیں اور دو میں کاما اور تیسرے میں عطف ہو جیسے ہندوستان کاما، مصر کاما، اور سوڈان تو اس صورت میں آخری عطف کے ساتھ بھی کاما ہونا چاہیے۔

الہلال جس کی ایک عالم میں دھوم تھی، کے سلسلے میں ایک دلچسپ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ادارتی عملہ صرف دو ہی افراد پر مشتمل تھا ایک خود مولانا آزاد دوسرے مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی، لیکن مولوی عبدالرزاق کا نام اخبار میں نہیں دیا جاتا تھا۔ یوں تو الہلال میں سینکڑوں مضامین شائع ہوئے اور ان کو شہرت بھی ملی ان ہی مضامین میں ایک مضمون 'عالم انسانیت- موت کے دروازہ پر' کو بھی زبردست شہرت حاصل ہوئی۔ اس مضمون کو مولانا آزاد کی فکر کا نتیجہ سمجھ کر علیحدہ سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ حقیقت میں یہ مضمون مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی کے ہی فکر و قلم کا نتیجہ تھا۔ اس سلسلے میں مولوی ملیح آبادی نے اپنی تصنیف ذکر آزاد میں مولانا آزاد کے نام کی تردید کرتے ہوئے اس مضمون کو اپنے نام سے منسوب کیا ہے نیز اسی کتاب میں آخری صفحات پر درج مولانا 'ملیح آبادی کی دیگر تصنیف و تالیفات' اشتہار میں اس کتاب کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

□

Habib Ahmed, Hanifa Manzil 74, Ashok Colony, Noor Mahel Road, Bhopal -1 (MP)

فیروز بخت احمد

ادارۂ شمع

اردو کی قندیل جو وقت سے پہلے بجھ گئی

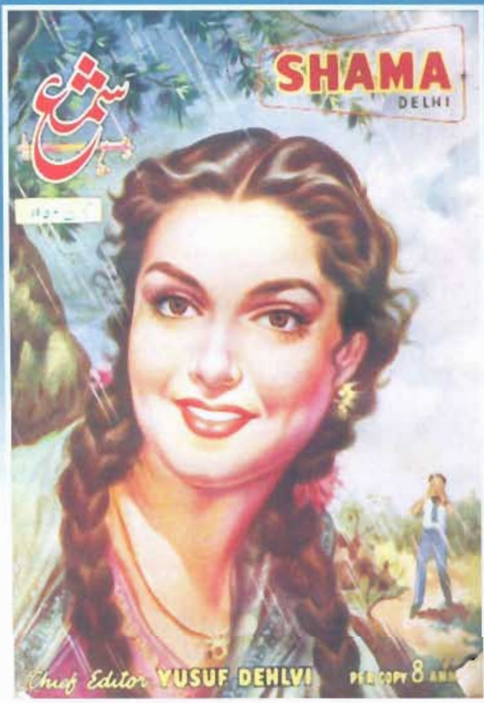

تقسیم وطن کے بعد اردو زبان و ادب کا رشتہ اردو کے عام قاری تک جوڑے رکھنے میں جن اداروں کا ہاتھ رہا ہے ان میں ادارۂ شمع سر فہرست ہے جس کی اب صرف یادیں باقی رہ گئی ہیں۔ اس ادارے سے شائع ہونے والے ماہانہ رسالوں، شمع، کھلونا، بانو، شبستاں ڈائجسٹ، جاسوسی ماہنامہ مجرم ،ان رسائل سے وابستہ اشاعت گھروں اور شمع ادبی معموں کے زمانے کو اردو کا ایک سنہرا دور کہا جاسکتا ہے جب اس اردو ادارے کی بدولت کافی ہاؤسوں اور چائے خانوں میں بھی اردو کی محفلیں دیر رات تک جمی رہتی تھیں۔اس شاندار ادارے کے اکابرین میں سے بیشتر اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ معروف صحافی جناب فیروز بخت احمد نے ادارے کی ایک اہم شخصیت جناب یونس دہلوی سے ملاقات کر کے 'اردو دنیا' کے لیے یہ مضمون تیار کیا ہے جو اردو اور اردو عوام کے اس عہد زرّیں کی یادوں کو روشن کرتا ہے۔ ادارہ

ادارۂ شمع اور خاندانِ دہلوی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اِس خاندان اور اردو زبان وادب کی عوامی ترسیل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خاص طور پر ادبِ اطفال کو جس طرح اس ادارے نے فروغ دیا اس کی دوسری مثال ڈھونڈنا مشکل ہے۔ اِس خاندان کا سایہ جب تک اُردو کے ادبِ اطفال پر تھا، نئی نسل تک اُردو زبان وادب کی ترسیل کے معاملے میں اردو والے خاصے مطمئن نظر آتے تھے۔

ماہنامہ 'شمع' اس ادارے کا فلیگ شپ تھا، اور اسی کے نام سے یہ ادارہ آج تک یاد کیا جاتا ہے۔ شروع میں یہ صرف ادب اور مذہبی علوم تک محدود تھا۔ تب اس کے مدیر حافظ یوسف دہلوی تھے۔ بعد میں 'شمع' فلمی دُنیا سے بھی جڑ گیا تھا کیونکہ وہ وقت کا سب سے مقبول میڈیم تھا۔ یہاں سے 'شمع' نے وہ مقبولیت حاصل کی جس کی دوسری نظیر اردو میں نہیں ملتی۔ دہلوی برادران نے ایک وقت ایسا بھی دیکھا ہے کہ جب بلندو بالا فلمی اِسٹار اور ہیروئنیں، جیسے دلیپ کمار، اشوک کمار، دیو آنند، راج کپور، ششی کپور، سائرہ بانو، راج کمار، وجینتی مالا، محمود، مدھو بالا وغیرہ خود ان سے ملنے کے مشتاق رہا کرتے تھے۔ ماہنامہ 'شمع' میں اِن حضرات کی تصاویر ان کی کامیابی کی نشانی ہوا کرتی تھیں۔

ماہنامہ 'کھلونا' کے معاصر رسائل، غنچہ (بجنور) پھول (لاہور) بچوں کا باغ (دہلی) پھلواری (لکھنؤ) وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ 'کھلونا' کے تعلق سے ایک دلچسپ قصہ یہ ہے کہ ماہنامہ 'بچوں کا باغ' کی مدیر رضیہ سلطانہ چمن صاحبہ کے بھائی و سر پرست اعلیٰ کو ماہنامہ 'کھلونا' کے اجرا سے متعلق حقائق کا علم ہوا تو اُنھیں پتہ چلا کہ یونس صاحب کو مذکورہ رسالہ نکالنے کے لیے اُن کے والد نے 5000 روپے دیے ہیں۔ اُنھوں نے یونس صاحب سے کہا، ''میاں، تم تو پہلے ہی پرچے میں نبٹ رہے ہو۔ آتش بازی کی لڑی کی طرح اِسے آہستہ آہستہ چھوڑو۔'' اس کے بعد 'آٹھ سے اسّی سال تک کے بچوں' کے اس رسالے نے نئی نسل کی تربیت میں جو زبردست کردار اپنی مقبولیت کی بدولت ادا کیا وہ اردو کی تاریخ کا حصہ ہے۔

خاندانِ دہلوی کے تصور کے ساتھ ہی ذہن میں ماہنامہ شمع، کھلونا، بانو، شبستاں، مجرم، کھلونا بک ڈپو اور شمع بک ڈپو کے نام اپنے آپ پردۂ ذہن پر ابھر آتے ہیں۔ ان کی کہانیاں اور دلچسپ لطائف کی شبیہ اُبھر جاتی ہے۔ راقم نے اُردو اِن ہی رسائل وکتب سے سیکھی ہے۔ اُردو کے ان ہر دلعزیز رسائل کا آج تک کوئی بدل پیدا نہیں ہوا۔ افسوس کا مقام ہے کہ یہ تمام جرائد و رسائل اب بند ہو چکے ہیں۔

مذکورہ پبلی کیشنز کو دہلوی برادران یعنی یونس دہلوی، اِدریس دہلوی اور اِلیاس دہلوی اپنے والد ماجد حافظ یوسف دہلوی کی سرپرستی میں نکالا کرتے تھے۔ اُردو کی اِجمالی طباعت کی تاریخ میں کسی بھی اِدارے نے آج تک اِس اِدارہ سے بہتر طباعت و اشاعت کا کام نہیں کیا۔

اِس اِدارے کی بنیاد 1930 کی دہائی میں پڑی جب حافظ محمد یوسف دہلوی نے، جن کا تعلق شمسی برادری سے تھا اور چمڑے کا کاروبار تھا، سوچا کہ اگر اِس دور میں اُردو ادب کا ایک معیاری رسالہ نکالا جائے تو ادب سے رغبت رکھنے والوں کی پیاس بجھے گی۔ للہٰذا، اُنھوں نے

یونس دہلوی شمع کے دفتر میں

ماہنامہ 'شمع' کے نام سے ایک ایسا رسالہ شروع کیا کہ جس نے اُردو میں ایک نئی تاریخ رقم کی۔ یہ جرائد چہار دانگ عالم میں بذریعہ ہوائی ڈاک جایا کرتے تھے۔

راقم کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اُسے دہلوی خاندان کے قابل قدر رکن جناب یونس دہلوی سے ملاقات کا فیض حاصل ہوا۔ راقم کو یاد ہے کہ اِس سے قبل اُس نے یونس صاحب کو اُن کی نوعمری میں اُن کے آصف علی روڈ، نئی دہلی والے دفتر میں 1972 میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اُس وقت میں بچہ تھا اور اپنی والدہ کے ساتھ ماہنامہ کھلونا کی سالانہ فیس جو کہ اُس دور میں تقریباً 12-10 روپیہ ہوا کرتی تھی، ادا کرنے گیا تھا۔ اُس وقت وہ خوبرو، بارعب اور باوقار انسان دِکھائی دیتے تھے اور ابھی ایسے ہی لگتے ہیں۔

یونس صاحب 84 برس کو تجاوز کر چکے ہیں اور آج بھی اُن کے چہرے کی رونق دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی فرشتہ زمین پر اُتر آیا ہو۔ سر پر ہمیشہ نماز کی ٹوپی، باریش چہرہ، ہاتھ میں تسبیح اور سامنے موبائل، کمرے کے کونے میں جائے نماز، نہایت ہی ہلکا پھلکا کھانا پینا، میانہ قد، کرتا پاجامہ وغیرہ اُن کی سادگی کے آئینہ دار ہیں۔

گرمیوں کی ایک شام کو ماہِ مئی میں اُن کے دولت کدہ واقع گڑگاؤں میں جو کہ دہلی کے قرب وجوار میں ہے، اُن سے ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا۔ گھر پر سوائے ایک ملازم کے اور کوئی نظر نہ آیا۔ اُن کا پوتا علی احمد دہلوی بھی تھوڑی دیر بعد آ پہنچا۔ ملازم نے پنّے سے ضیافت کی۔ یہ ایک خاص شربت ہے جو دراصل آم کو انگیٹھی میں قدرے جوش دے کر مدھم آنچ میں اُبالا جاتا ہے۔ اُس کے بعد اُس میں گڑ اور کالی مرچ، زیرہ، چھوٹی اِلائچی وغیرہ کے عرق کے ساتھ ملاتے ہیں اور یوں اُسے مشروب کی روایتی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جو اپنے آپ میں بے حد فرحت بخش ہوتا ہے۔

میرے لبوں پر پہلا سوال یہی تھا کہ آخر آپ حضرات کے رہتے ہوئے ایسا کیسے ہوا کہ اُردو ادب کا یہ زرین دور یاد بن کر رہ گیا۔ کس طرح سے یہ تمام مطبوعات ختم ہوئیں۔ راقم اِس سوال کا جواب اِس لیے چاہتا تھا کہ آج تک وہ اِس بات کو تسلیم نہیں کر پایا ہے کہ اُس کے بچپن کا پیارا ماہنامہ 'کھلونا' بند ہو چکا ہے۔ آج بھی یہ رسالہ کہیں سے بھی مل جاتا ہے تو جی چاہتا ہے ہزاروں کی قیمت دے کر اسے خرید لیا جائے۔ آج کی نسل کو شاید اس پبلی کیشن کی مقبولیت کا اندازہ کبھی نہ ہو پائے کیوں کہ اُس جیسے رسائل وجرائد تو آج شائع ہی نہیں ہو رہے ہیں۔ اگر اِس رسالے میں راقم کا کوئی لطیفہ 'بتاؤ تو بھلا پہیلی' کا جواب یا آشی بھیا سے سوال کا جواب شائع ہو جایا کرتا تھا تو مسرت کی اِنتہا نہ رہتی اور ایسا محسوس ہوتا کہ گویا تمام دُنیا کی افضل چیز نصیب ہوگئی ہے۔ ماہنامہ کھلونا کی کہانیاں، نظمیں، ڈرامے، تصویری کہانیاں جیسے 'میاں فولادی' اور 'نسطو رُتو' جو تھیں وہ تھیں ہی، رسالے کی تصویریں اس قدر پُرکشش اور دِلنشین ہوتی تھیں کہ انھیں فریم میں لگا کر دیوار یا الماری میں سجا لینے کو جی چاہتا۔

لیکن یونس صاحب نے جواب میں ایک اداس مسکراہٹ کے سوا کچھ نہیں دیا۔ گفتگو آگے بڑھنے پر انھوں نے اپنی تعلیم کے بارے میں بتایا کہ اُن کی واُن کی دونوں بہنوں یعنی احمد النسا و رفیق النسا کی تعلیم کوئین میری اِسکول میں ہوئی تھی۔ اِس کے بعد یونس صاحب کا داخلہ اینگلو عربک اِسکول میں ہوگیا تھا۔ اینگلو عربک میں کچھ عرصہ پڑھنے کے بعد وہ فتح پوری مسلم اِسکول میں چلے گئے جہاں سے اُنھوں نے ہائی اِسکول کیا۔ پھر اُن کی تعلیم ایک سال ہندو کالج اور پھر باقی سینٹ اِسٹیفین کالج میں ہوئی جہاں اُنھوں نے فلاسفی آنرز کیا۔ ہندو کالج سے اُنھوں نے ایک سال 'ٹرانزیشن پیریڈ' میں تعلیم حاصل کی۔

یونس صاحب اپنی والدہ کی شفقت بھی نہیں بھول پائے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اُن کی والدہ خلیق النسا صاحبہ کی طبیعت اکثر خراب رہتی تھی کیوں کہ وہ ٹی بی کی مریضہ تھیں۔ اُن دنوں دہلوی خاندان کی رہائش دہلی کے مہرولی علاقہ میں ہوا کرتی تھی۔ قطب کا علاقہ دلّی والوں کا برسات کا گڑھ ہوتا تھا۔ اُن دنوں پنجابی برادری میں ایک بڑے نامی گرامی طبیب حکیم عبدالرزّاق کپڑے والے ہوا کرتے تھے۔ اُن کے علاج سے اُن کی والدہ کا عارضہ جاتا رہا۔ حکمت عبدالرزّاق کپڑے والوں کا شغل تھی۔

جب یونس صاحب سے پوچھا گیا کہ شمسی برادری یا قوم پنجابیان کا شجرہ کہاں سے ملتا ہے تو اُنھوں نے بتایا: ''یہ بڑا دلچسپ واقعہ ہے۔ یہ اُس دور کی بات ہے کہ شمس تبریز نام کے بزرگ پانی پت کے اطراف رہا کرتے تھے۔ اُس وقت ملتان کپڑوں کی تجارت کا بہت بڑا گڑھ تھا۔ وہاں کے کچھ غیر مسلم تاجر گنگا اشنان کو جا رہے تھے تو راستے میں کسی نے اُن سے کہا کہ ارے بھائی اگر صحیح معنوں میں تمھیں اپنے گناہوں سے چھٹکارا پانا ہے تو تمہارا گنگا اشنان تو یہیں ہو جائے گا لہٰذا، اُن کی ملاقات بزرگ شمس تبریز صاحب سے کرائی گئی جن کی ذات سے یہ تاجر اِتنے متاثر ہوئے کہ سبھی مسلمان ہوگئے۔ اب نہ وہ ملتان واپس جا سکے اور نہ ہی گنگا اشنان کو جا سکے۔ تو پھر یہ لوگ لاہوری دروازہ دہلی کے پاس حافظ بنا کی سرائے، شیشہ والوں کی سرائے وغیرہ علاقے میں بس گئے۔ اُس دور میں بھی شمسی برادری کے پاس دلّی کے صدر بازار کی ہول سیل مارکیٹ تھی۔ جب تقسیم ہند ہوئی تو زیادہ تر شمسی حضرات کراچی کوچ کر گئے۔ دلّی کے پنجابی زیادہ تر شاہجہاں آباد میں بس گئے۔ یونس صاحب نے بتایا کہ اُن کے بزرگوں کی زبان سرائیکی ہوا کرتی تھی۔ اِتفاق سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مادری زبان بھی سرائیکی ہی ہے۔

جہاں تک ماہنامہ 'کھلونا' نکالنے کا تعلق ہے، یونس صاحب بتاتے ہیں کہ 1945 میں ایک دن اُنھوں نے والد حافظ یوسف دہلوی سے کہا کہ وہ ایک بچوں کا رسالہ نکالنا چاہتے ہیں جس کے لیے پہلے تو والد صاحب نے اُن کی حوصلہ شکنی کی کہ بھائی کچھ نہیں کر پاؤ گے اور پیسہ برباد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ بات سن کر اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اب تو کسی بھی حالت میں بچوں

کے اِس رسالے کو نکال کر ہی دکھائیں گے۔ لہٰذا، زیادہ ضد کرنے پر والد صاحب نے اُنھیں 5,000 روپیہ دیا اور کہا کہ وہ اُنھیں ایک چپراسی بھی دے دیں گے۔ وہ وقت تھا اور اُس کے بعد کے 40 سال کہ یونس صاحب نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

جب 'کھلونا' کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو حافظ یوسف صاحب پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن پر یہ دیکھنے گئے کہ صبح جو اُنھوں نے پرچے اے ایچ وہیلرز کے بک اسٹال پر رکھے تھے اُن کی کیا پوزیشن ہے۔ یوسف صاحب اکثر و بیشتر اسٹیشن پر جاتے اور کچھ دیر کھڑے ہوکر مارکیٹ ریسرچ کرتے کہ لوگ کس طرح کے رسائل و کتب خریدنا پسند کرتے ہیں۔

ماہنامہ 'کھلونا' نے بچوں کے علاوہ اہلِ ادب میں بھی اپنی خوب جگہ جمالی تھی مگر افسوس 1947 کے ہیجان انگیز حالات میں اُن کا پریس لٹ گیا۔ ماہنامہ 'کھلونا' کا کاغذ کا کوٹہ بند ہوا تو اُسے کتابی شکل میں شائع کیا جانے لگا کیوں کہ کتاب کے لیے کاغذ کی ممانعت نہیں تھی۔ دوسری بات یہ کہ یونس صاحب کو پرچہ نکالنے کا ماہانہ خرچہ محض 500 روپیہ دیا جاتا تھا۔ وہ مورچے پر ڈٹے رہے اور اُسی طرح سے 'کھلونا' دلوں میں جگہ بناتا رہا۔

کسی نے رائے دی کہ وہ ماہنامہ 'شمع' نکالیں۔ اِس میں بھی وہ پیچھے نہ رہے اور اُنھوں نے شمع کو بھی محض 500 روپیہ ماہانہ کے بجٹ سے جاری کیا۔ رسالے کے لیے اشتہارات کی کوشش کی گئی۔ شمسی برادری تو تجارت پیشہ تھی ہی، اِشتہار بھی ملے مگر کہیں کسی برادری والے نے یوسف صاحب سے یہ کہہ دیا کہ اِشتہار اُن پرچوں کو دیے جاتے ہیں کہ جو لوگوں کے ہاتھوں میں جاتے ہیں اور جن کی سرکولیشن زیادہ ہے۔ یہ بات اُن کو چبھ گئی۔ یوسف صاحب نے اِس رسالے پر ایسی محنت کی اور ایسا کام کیا کہ 1950 میں یہ دہلی/ہندوستان سے نکلنے والا پہلا ایسا کوئی بھی رسالہ یا اخبار تھا کہ جس کی سرکولیشن 1 لاکھ سے زیادہ تھی۔

انگریزوں کے زمانے سے ہندوستان میں اِشتہارات کی سب سے بڑی کمپنی 'والٹر تھامسن کمپنی' ہوا کرتی تھی۔ مسٹر فیلڈنگ اُس کا ایجنٹ ہوا کرتا تھا۔ اِشتہارات سے متعلق ایک دیگر بڑی اِشتہاری کمپنی، 'فرگوسن ایڈورٹائزنگ کمپنی' بھی تھی جس کے ڈائریکٹر کی اخبارات و رسائل کے سرپرستوں کے لیے ہدایات ہوتیں کہ سرکولیشن ایسی چاہیے جیسی کہ 'شمع' کی ہے۔

اِنڈین نیوز پیپر ایسوسی ایشن کے صدر کا کہنا تھا کہ جس وقت 'شمع' میں معمہ نکلا کرتا تھا، اُس وقت اُس کی تعدادِ اشاعت 'ٹائمز آف انڈیا'، 'اِلسٹریٹیڈ ویکلی' سے زیادہ ہوا کرتی تھی۔ 'شمع' کا ادبی معمہ حل کرنے والے لاکھوں لوگوں نے اب بیشمار کتابیں پڑھنی شروع کر دی تھیں کیونکہ اُس کے اِشارے اِن کتابوں میں ہی ہوا کرتے تھے۔ اُس سے کتابوں کی فروخت بڑھنے لگی۔ 'شمع' کے ادبی معمے 'السٹریٹیڈ ویکلی' کے 'کراس ورڈ پزل' سے کہیں زیادہ دلچسپ اور انعام والے ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح سے 'اِنڈین ایکسپریس' کے معمے بھی چلا کرتے تھے مگر 'شمع' سے کم۔ 'شمع' کے معموں سے گھبرا کر 'ٹائمز آف انڈیا' والوں نے اُن پر مقدمہ دائر کر دیا جس میں معموں کو بند کرنے کی بات کہی گئی تھی۔ مقدمہ باضابطہ طور سے لڑا گیا اور جیت یونس صاحب کی ہوئی۔

یونس دہلوی ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے

اپنے رسالوں کا حلقہ بڑھانے کے لیے یوسف صاحب کا اُصول تھا کہ وہ ریلوے کا اسپیشل پاس لے کر شہر در شہر جاتے اور اِشتہار لاتے۔ تقسیم ہند سے قبل لاہور اُردو کا سب سے بڑا گڑھ تھا۔ جب یوسف صاحب پہلی مرتبہ ماہنامہ 'کھلونا' کو لاہور میں فروخت کرنے گئے تو رسالہ رکھنے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔

اُس کے بعد اُنھوں نے کراچی کا رُخ کیا۔ وہاں پر رسالہ ایسا جما کہ سب سے زیادہ آرڈر وہیں سے آنے لگے۔ پھر 'شمع' تو پہلے سے ہی ایک جما ہوا ماہنامہ تھا۔ ساتھ میں 'کھلونا' بھی آ گیا۔ پی آئی اے کی فلائٹس میں سب سے زیادہ لوڈ کراچی کا ہوا کرتا تھا اور اُس کے بعد دیگر شہروں کا۔ لاہور میں یہ رسالے کراچی سے گھوم کر جایا کرتے تھے۔ پاکستان میں اِن رسالوں کی اتنی مقبولیت ہوئی کہ یوسف دہلوی صاحب کو سال میں 48 مرتبہ پاکستان جانا پڑتا تھا۔ اُنھیں حکومت ہند اور حکومت پاکستان دونوں نے مل کر ایک خاص بزنس ویزا کی اجازت دے رکھی تھی جو ہند-پاک کی تاریخ میں بہت کم لوگوں کا مقدر رہی۔

دورانِ گفتگو میں نے یونس صاحب سے پھر وہی سوال کیا کہ آخر دہلوی خاندان کے تمام رسائل کیوں بند ہوگئے۔ تو وہ دلبرداشتہ سے ہوگئے اور بات کو ایک بار پھر دائیں بائیں گھما دیا مگر چوں کہ راقم یہ جاننا چاہتا تھا کہ اُس کا پسندیدہ رسالہ آخر کیسے بند ہوا اُسے تو یہ معلومات ہر حالت میں درکار تھیں۔ میں نے ذرا بات کو گھما کر سوال کا جواب لینے کی کوشش کی اور کہا کہ کہیں آپس میں بھائیوں کے بیچ نا چاقی کی وجہ سے تو یہ رسالے بند نہیں ہوئے۔ اُنھوں نے سر کو ہلکی سی مثبت جنبش دی۔ پھر اُس کے بعد اُنھوں نے دیگر وجوہات بیان کیں۔ جن میں طاقتور مزدور قانون، کام کی بہ نسبت عملہ کا زیادہ ہونا، 30 سالہ نوکری سے سبکدوشی کے بعد بھی مزدوروں کو تاحیات 15-30 دنوں کی تنخواہ دیے جانے کا اصول اور مالکانِ عمارت کی جانب سے اُسے خالی کیے جانے کا پریشر وغیرہ کچھ ایسی باتیں تھیں جن کی وجہ سے اُردو کا یہ زبردست ادارہ بند ہوگیا۔

دوسری بات یہ کہ حافظ یوسف دہلوی سبھی کو بڑھا کر تنخواہ دینے کے حق میں تھے اور جب کبھی بھی کسی ملازم کو ایک لمبی پیشگی رقم کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ بھی دی جاتی تھی۔ اِس کے علاوہ اُردو کے قارئین کی تعداد بھی روبہ زوال تھی۔ حالانکہ یوسف صاحب کے فرزند اِس بات کے خلاف تھے کہ معذور مزدوروں کو جو کہ بالکل کام نہیں کر سکتے، بیٹھا کر تنخواہ دی جائے مگر حافظ صاحب ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ کیا خبر اُسی کی قسمت سے عظمت کا یہ مقام حاصل ہوا ہو۔ ایک ڈرائیور تھا جو کسی حادثہ کا شکار ہوگیا تھا اور معذور ہوگیا تھا۔ کمپنی کی اپنی پالیسی کے مطابق، حاجی صاحب اُسے تاحیات تنخواہ دیتے رہے۔ یونس صاحب والد صاحب کو بسا اوقات سمجھایا کرتے تھے کہ تھوڑا سمجھ کر خرچہ کیا کریں۔ بہرحال یہ رسالہ نامساعد حالات کی بنا پر تاریخ کا حصہ بن کر رہ گیا۔

میں شمع اور کھلونا کی حسین مگر غمگین یادوں کے ساتھ یونس صاحب کے دولت کدے سے واپس آ گیا!

□

Feeroz Bakht Ahmad, A-202, Adeeba Market, Near Rahmani Masjid, Main Road, Zakir Nagar, New Delhi - 110025

ادارہ

ن م راشد

ن م راشد کا پورا نام چودھری نذر محمد اور تخلص راشد تھا۔ ن م راشد کی پیدائش یکم اگست 1910 کو گوجرانوالہ، پاکستان پنجاب کے قصبے اکال گڑھ میں ہوئی تھی۔ نذر محمد راشد کا تعلق جنجوعہ خاندان سے تھا۔ ان کے آبا و اجداد ریاست گڑھ کھیالیہ ضلع جہلم کے زمیندار تھے۔ ان کے دادا معالج تھے اور والد ایجوکیشن انسپکٹر تھے۔ نذر محمد نے 1924 میں میٹرک اکال گڑھ گورنمنٹ ہائی اسکول سے پاس کیا اور لائلپور کالج سے 1926 میں انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد لاہور سے 1928 میں بی اے اور 1930 میں ایم اے (اقتصادیات) کیا۔ اس وقت کے اہم رسالے شاہکار کے مدیر کی بھی خدمات انجام دیں۔ بعد میں انھوں نے کمشنر شان کے یہاں بھی ملازمت کی تھی۔

ن م راشد کو شاعری کا بچپن سے ہی شوق تھا۔ پہلی نظم ایک سکھ انسپکٹر کی ہجو کے طور پر لکھی۔ یہ نظم انھوں نے آٹھویں جماعت میں رہتے ہوئے لکھی تھی۔ جب وہ گریجویشن کر رہے تھے تب ان کی شاعری میں مزید نکھار آیا۔ کچھ ان کی نظموں پر اختر شیرانی، روش صدیقی اور عابد علی عابد کے اثرات نمایاں رہے لیکن بعد میں راشد نے اپنی الگ راہ نکالی۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے روایتی طرز کی شاعری کی اور عشق و رومان کو بھی موضوع بنایا لیکن بعد میں ان کی شاعری نے الگ موڑ لے لیا اور جدید شاعری کے مجتہد کہلائے۔

راشد کی زندگی کچھ عجیب گزری۔ ایک غریب گھر میں پیدائش اور بچپن کا احساس محرومی انھیں دوہری شخصیت میں تقسیم کرگیا۔ ان کی نظم شاعر درماندہ اسی زمانے کی یادگار ہے۔ انھوں نے 1939 سے 1941 تک آل انڈیا ریڈیو میں کام کیا۔ 1943 تک وہ وہاں کام کرتے رہے۔ بعد میں ان کا انتخاب پاکستان فارن سروس میں ہوگیا اور انھوں نے مختلف ممالک میں اپنے فرائض منصبی انجام دیے۔ 1954 میں انھوں نے امریکہ کے اردو پروگراموں کے لیے بھی خدمات انجام دیں۔ اقوام متحدہ کے مشیر اطلاعات بھی رہے۔ بعد میں انھیں ملازمت کے لیے لندن جانا پڑا اور وہاں 1923 میں ریٹائرمنٹ لی۔ 9 اکتوبر کو لندن میں ان کا انتقال ہوا اور ان کی وصیت کے مطابق ان کی لاش کو نذر آتش کیا گیا۔

راشد کو جدید اردو شاعری میں سرفہرست رکھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے قدیم روایات سے انحراف کیا۔ اردو نظم کو روایتی بندشوں سے آزاد کیا اور ایک نیا اسلوب اور نیا رنگ عطا کیا۔ انھوں نے مختلف الفاظ اور فارسی اصطلاحوں کو مختلف معنی میں استعمال کیے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کبھی کبھی مشکل بن جاتی ہے۔ فارسی اسلوب نے ان کی شاعری کو مزید گنجلک بنادیا۔ انھوں نے تشبیہات و استعارات کو منفرد انداز میں استعمال کیا اور فروغ دینے میں اہم کردار نبھایا۔ ان کی نظموں کے تین مجموعے ہیں۔ ماورا، ایران میں اجنبی، لا=انسان۔ ان کی موت کے بعد جنوری 1977 میں گماں کا ممکن شائع ہوا۔ ان کی وفات کے بعد کلیات ن م راشد اور مقالات ن م راشد بھی شائع ہوا، اور ان کے خطوط کا مجموعہ بھی شائع ہوا۔ راشد کو روایت سے بغاوت کرنے والے شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

ان کی نظم زندگی سے ڈرتے ہو کو بالی وڈ کی مشہور فلم 'پیپلی لائیو' میں استعمال کیا گیا۔ راشد سے قبل اردو میں ڈاکٹر تصدق حسین خالد نے آزاد نظم کا آغاز کیا تھا لیکن راشد نے اسے اردو شاعری میں بطور صنف برتا اور کم عرصے میں انھوں نے آزاد نظم کو بے حد مقبول بنادیا۔

انھیں باغی شاعر بھی کہا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ راشد کے لیے باغی کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے روایت سے انحراف کیا لیکن اسے بغاوت سے تو تعبیر نہیں کرسکتے۔ باغی کے بجائے انھیں جدت پسند شاعر کہنا مناسب ہوگا۔ راشد کی نظموں میں فن اور فکر کی سطح پر کچھ نئی باتیں ضرور ہیں لیکن ان کی نظموں کے انداز و اطوار پرانے ہیں۔ بلکہ ان کی نظموں میں ترنم اور غنائیت کہیں اس قدر ہے کہ راشد سے قبل پابند نظموں میں نظر نہیں آتی ہے۔ حنیف کیفی نے بھی راشد کی نظموں میں ان عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے روایت کی پاسداری بھی کی اور اپنے اسلوب کی انفرادیت کو بھی قائم رکھا۔ ان کی پہلی آزاد نظم جرأت پرواز کے کچھ بند ملاحظہ کریں:

بجھ گئی شمع ضیا پوش جوانی میری
آج تک کی ہے کئی بار محبت میں نے
اشکوں اور آہوں سے لبریز ہیں ارماں مرے
ہوگئی ختم کہانی میری
مٹ گئے میری تمناؤں کے پروانے بھی
خوف ناکامی و رسوائی سے
حسن کی شیوۂ خود آرائی سے
دل بے چارہ کی مجبوری و تنہائی سے
میرے سینے میں پیچاں رہیں آہیں میری
کرسکیں روح کو عریاں نہ نگاہیں میری
ایک بار اور محبت کرلوں
سعی ناکام سہی

راشد نے غزلیں، پابند نظمیں اور سانیٹ بھی لکھے۔ مگر انھیں شہرت آزاد نظم سے حاصل ہوئی۔ ان کی نظموں کی بحریں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لفظ و معنی کے کس قدر نباض تھے۔ پرانے لفظوں کو نئے مفہوم کا جامہ پہنانا انھیں خوب آتا تھا۔ راشد کی شاعری میں تصور مرگ، تاریخ کا ظلم و ستم، غلامی، ماضی سے فرار، مستقبل سے ناامیدی، احساس بے گانگی وغیرہ موضوعات تواتر سے مل جاتے ہیں۔

ماخذ: 'فن شخصیت' کوائف نمبر 1994

ن م راشد

انتخاب کلام ن م راشد

انسان

(سانیٹ)

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں، جاہلوں، مردوں کی، بیماروں کی دنیا ہے
یہ دنیا بے کسوں کی اور لا چاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں!

ہماری زندگی اک داستاں ہے ناتوانی کی
بنالی اے خدا اپنے لیے تقدیر بھی تو نے
اور انسانوں سے لے لی جرأت تدبیر بھی تو نے
یہ داد اچھی ملی ہے ہم کو اپنی بے زبانی کی!

اسی غور و تجسس میں کئی راتیں گزاری ہیں
میں اکثر چیخ اُٹھتا ہوں بنی آدم کی ذلت پر
جنوں سا ہو گیا ہے مجھ کو احساسِ بضاعت پر
ہماری بھی نہیں افسوس، جو چیزیں 'ہماری' ہیں!

کسی سے دور یہ اندوہِ پنہاں ہو نہیں سکتا!
خدا سے بھی علاجِ دردِ انساں ہو نہیں سکتا!

☆☆☆

مرے محبوب، جانے دے، مجھے اُس پار جانے دے
اکیلا جاؤں گا اور تیر کے مانند جاؤں گا
کبھی اس ساحلِ ویران پر میں پھر نہ آؤں گا
گوارا کر خدارا اس قدر ایثار جانے دے!

نہ کر اب ساتھ جانے کے لیے اصرار جانے دے!
میں تنہا جاؤں گا، تنہا ہی تکلیفیں اٹھاؤں گا
مگر اُس پار جاؤں گا تو شاید چین پاؤں گا
نہیں مجھ میں زیادہ ہمتِ تکرار جانے دے!

مجھے اُس خواب کی بستی سے کیا آواز آتی ہے؟
مجھے اُس پار لینے کے لیے وہ کون آیا ہے؟
خدا جانے وہ اپنے ساتھ کیا پیغام لایا ہے
مجھے جانے دے اب رہنے سے میری جان جاتی ہے!
مرے محبوب! میرے دوست اب جانے بھی دے مجھ کو
بس اب جانے بھی دے اس ارضِ بے آباد سے مجھ کو!

گناہ اور محبت

گناہ

گناہ کے تند و تیز شعلوں سے روح میری بھڑک رہی تھی
ہوس کی سنسان وادیوں میں مری جوانی بھٹک رہی تھی
مری جوانی کے دن گزرتے تھے وحشت آلود عشرتوں میں
مری جوانی کے میکدوں میں گناہ کی مے چھلک رہی تھی
مرے حریمِ گناہ میں عشق دیوتا کا گزر نہیں تھا
مرے فریبِ وفا کے صحرا میں حورِ عصمت بھٹک رہی تھی
مجھے حسنِ ناتواں کے مانند ذوقِ عصیاں بہا رہا تھا
گناہ کی موجِ فتنہ ساماں اُٹھا اُٹھا کر پٹک رہی تھی
شباب کے اوّلیں دنوں میں تباہ و افسردہ ہو چکے تھے
مرے گلستاں کے پھول، جن سے فضائے طفلی مہک رہی تھی
غرض جوانی میں اہرمن کے طرب کا سامان بن گیا مَیں
گنہ کی آلائشوں میں لتھڑا ہوا اک انسان بن گیا میں

سپاہی

تو مرے ساتھ کہاں جائے گی؟
— موت کا لمحۂ مایوس نہیں،
قوم ابھی نیند میں ہے!
مصلحِ قوم نہیں ہوں کہ میں آہستہ چلوں
اور ڈروں قوم کہیں جاگ نہ جائے —
میں تو اک عام سپاہی ہوں، مجھے
حکم ہے دوڑ کے منزل کے قدم لینے کا؟
اور اسی سعیِ جگر دوز میں جاں دینے کا
تو مرے ساتھ مری جان، کہاں جائے گی؟

تُو مرے ساتھ کہاں جائے گی؟
راہ میں اونچے پہاڑ آئیں گے
دشتِ بے آب و گیاہ
اور کہیں رودِ عمیق
بے کراں، تیز و کف آلود و عظیم
اجڑے سنسان دیار
اور دشمن کے گرانڈیل جواں
جیسے کہسار پہ دیودار کے پیڑ
عزت و عفت و عصمت کے غنیم
ہر طرف خون کے سیلابِ رواں —
اک سپاہی کے لیے خون کے نظاروں میں
جسم اور روح کی بالیدگی ہے
تو مگر تاب کہاں لائے گی
تو مرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی؟
دم بدم بڑھتے چلے جاتے ہیں
سرِ میدانِ رفیق،
تو مرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی؟
عمر گزری ہے غلامی میں مری
اس سے اب تک مری پرواز میں کوتاہی ہے!
زمزمے اپنی محبت کے نہ چھیڑ
اس سے اے جان پر و بال میں آتا ہے جمود
میں نہ جاؤں گا تو دشمن کو شکست
آسمانوں سے بھلا آئے گی؟
دیکھ خونخوار درندوں کے وہ غول
میرے محبوب وطن کو یہ نگل جائیں گے؟

ان سے ٹکرانے بھی دے
جنگِ آزادی میں کام آنے بھی دے
تو مرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی؟

آواز

— یہ دلّی ہے
اپنے غریب الوطن بھائیوں کے لیے
بار غزلوں کے لائی ہے ان کی بہن
اور گیتوں کے گجرے بنا کر:
"چھما چھم چھما چھم دلہنیا چلی رے۔
یہ دنیا ہے طوفان میل۔
اے مدینے کے عربی جواں۔
تیری زلفیں ہمیں ڈس گئیں ناگ بن کر—''
مگر اس صدا سے بڑا ناگ ممکن ہے
جو لے گیا ایک پل میں
ہزاروں کو غارِ فراموش گاری
میں یوں کھینچ کر ساتھ اپنے
کہ صدیاں گزرنے پر ان کی
سیہ ہڈیاں بھی نہ شاید ملیں گی؟

جہاں سے یہ آواز آئی
اُسی سرزمیں میں،
سمندر کے ساحل پہ، لاکھوں گھروں میں
دیے ٹمٹمانے لگے
اور اک دوسرے سے
بہت دھیمی سرگوشیوں میں
یہ کہنے لگے:
"لو سنو، اب سحر ہونے والی ہے لیکن
مسافر کی اب تک خبر بھی نہیں ہے!''
☆☆☆

لب بیاباں، بوسے بے جاں
کونسی الجھن کو سلجھاتے ہیں ہم؟
جسم کی یہ کارگاہیں
جن کا ہیزم آپ بن جاتے ہیں ہم!
نیم شب اور شہر خواب آلودہ، ہم سائے
کہ جیسے دزدِ شبِ گرداں کوئی!
شام سے تھے حسرتوں کے بندہ بے دام ہم
پی رہے تھے جام پر ہر جام ہم
یہ سمجھ کر، جرعۂ پنہاں کوئی
شاید آخر، ابتدائے راز کا ایما بنے

مطلب آساں، حرف بے معنی
تبسّم کے حسابی زاویے
متن کے سب حاشیے،
جن سے عیشِ خام کے نقشِ ریا بنتے رہے!
اور آخر بعد جسموں میں سرِ مو بھی نہ تھا
جب دلوں کے درمیاں حائل تھے سنگیں فاصلے
قربِ چشم و گوش سے ہم کون سی الجھن کو سلجھاتے رہے!
کون سی الجھن کو سلجھاتے ہیں ہم؟
شام کو جب اپنی غم گاہوں سے دزدانہ نکل آتے ہیں ہم!
زندگی کو تنگنائے تازہ تر کی جستجو
یا زوالِ عمر کا دیو سبک پا روبرو
یا انا کے دست و پا کو وسعتوں کی آرزو
کون سی الجھن کو سلجھاتے ہیں ہم؟

رقص

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو
رقص گہ کے چور دروازے سے آ کر زندگی
ڈھونڈ لے مجھ کو، نشاں پا لے مرا
اور جرمِ عیش کرتے دیکھ لے!
اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
رقص کی یہ گردشیں
ایک مبہم آسیا کے دور ہیں
کیسی سرگرمی سے غم کو روندتا ہوں میں!
جی میں کہتا ہوں کہ ہاں،
رقص گہ میں زندگی کے جھانکنے سے پیشتر
کلفتوں کا سنگریزہ ایک بھی رہنے نہ پائے!

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی میرے لیے
ایک خونیں بھیڑیے سے کم نہیں
اے حسین و اجنبی عورت اسی کے ڈر سے میں
ہو رہا ہوں لحظہ لحظہ اور بھی تیرے قریب
جانتا ہوں تو مری جاں بھی نہیں
تجھ سے ملنے کا پھر امکاں بھی نہیں
تو مری ان آرزوؤں کی مگر تمثیل ہے
جو رہیں مجھ سے گریزاں آج تک!

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
عہدِ پارینہ کا میں انساں نہیں
بندگی سے اس در و دیوار کی
ہو چکی ہیں خواہشیں بے سوز و رنگ و ناتواں
جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں
زندگی پر میں جھپٹ سکتا نہیں!
اس لیے اب تھام لے
اے حسین و اجنبی عورت مجھے اب تھام لے!

بیکراں رات کے سناٹے میں

تیرے بستر پہ مری جان کبھی
بیکراں رات کے سناٹے میں

جذبۂ شوق سے ہو جاتے ہیں اعضا مدہوش
اور لذت کی گراں باری سے
ذہن بن جاتا ہے دلدل کسی ویرانے کی
اور کہیں اس کے قریب
نیند، آغازِ زمستاں کے پرندے کی طرح
خوف دل میں کسی موہوم شکاری کے لیے
اپنے پر تولتی ہے، چیختی ہے
بیکراں رات کے سناٹے میں!

تیرے بستر پہ مری جان کبھی
آرزوئیں ترے سینے کے کہستانوں میں
ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں!

ایک لمحے کے لیے دل میں خیال آتا ہے
تو مری جان نہیں
بلکہ ساحل کے کسی شہر کی دوشیزہ ہے
اور ترے ملک کے دشمن کا سپاہی ہوں مَیں
ایک مدت سے جسے ایسی کوئی شب نہ ملی
کہ ذرا روح کو اپنی وہ سبک بار کرے!
بے پناہ عیش کے ہیجان کا ارماں لے کر
اپنے دستے سے کئی روز سے مفرور ہوں مَیں!
یہ مرے دل میں خیال آتا ہے
تیرے بستر پہ مری جان کبھی
بیکراں رات کے سناٹے میں!

☆☆☆

سوچتا ہوں کہ بہت سادہ و معصوم ہے وہ
میں ابھی اس کو شناسائے محبت نہ کروں
روح کو اس کی اسیرِ غمِ الفت نہ کروں
اس کو رسوا نہ کروں، وقفِ مصیبت نہ کروں

سوچتا ہوں کہ ابھی رنج سے آزاد ہے وہ
واقفِ درد نہیں، خوگرِ آلام نہیں
سحرِ عیش میں اس کی اثرِ شام نہیں
زندگی اس کے لیے زہر بھرا جام نہیں!

سوچتا ہوں کہ محبت ہے جوانی کی خزاں
اس نے دیکھا نہیں دنیا میں بہاروں کے سوا
نکہت و نور سے لبریز نظاروں کے سوا
سبزہ زاروں کے سوا اور ستاروں کے سوا
سوچتا ہوں کہ غمِ دل نہ سناؤں اس کو
سامنے اس کے کبھی راز کو عریاں نہ کرو
خلشِ دل سے اسے دست و گریباں نہ کروں
اس کے جذبات کو میں شعلہ بداماں نہ کروں

سوچتا ہوں کہ جلا دے گی محبت اس کو
وہ محبت کی بھلا تاب کہاں لائے گی
خود تو وہ آتشِ جذبات میں جل جائے گی
اور دنیا کو اس انجام پہ تڑپائے گی
سوچتا ہوں کہ بہت سادہ و معصوم ہے وہ
میں اسے واقفِ الفت نہ کروں---

☆☆☆

زندگی تو تم بھی ہو، زندگی تو ہم بھی ہیں
آدمی سے ڈرتے ہو؟
آدمی تو تم بھی ہو، آدمی تو ہم بھی ہیں
آدمی زباں بھی ہے، آدمی بیاں بھی ہے
اس سے تم نہیں ڈرتے!
حرف اور معنی کے رشتہ ہائے آہن سے
آدمی ہے وابستہ
آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ
اس سے تم نہیں ڈرتے!

اَن کہی' سے ڈرتے ہو'
جو ابھی نہیں آئی، اُس گھڑی سے ڈرتے ہو
اس گھڑی کی آمد کی آگہی سے ڈرتے ہو
پہلے بھی تو گزرے ہیں
دورِ نارسائی کے، بے ریا خدائی کے
پھر بھی یہ سمجھتے ہو، ہیچ آرزومندی
یہ شبِ زباں بندی ہے رہِ خداوندی
تم مگر یہ کیا جانو
لب اگر نہیں ہلتے، ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں
ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں، راہ کا نشاں بن کر
نور کی زباں بن کر
ہاتھ بول اٹھتے ہیں، صبح کی اذاں بن کر
روشنی سے ڈرتے ہو؟
روشنی تو تم بھی ہو، روشنی تو ہم بھی ہیں
روشنی سے ڈرتے ہو
شہر کی فصیلوں پر
دیو کا جو سایہ تھا پاک ہو گیا آخر
رات کا لبادہ بھی
چاک ہو گیا آخر، خاک ہو گیا آخر
رات کا لبادہ بھی
اژدہامِ انساں سے فرد کی نوا آئی
ذات کی صدا آئی
راہِ شوق میں جیسے راہرو کا خوں لپکے
اک نیا جنوں لپکے
آدمی چھلک اٹھے
آدمی ہنسے ...
دیکھو، شہر پھر بسے ... دیکھو
تم ابھی سے ڈرتے ہو؟

ادارہ

رام لال بھاٹیہ
فکر تونسوی

بیسویں صدی کے نثری مزاح نگاروں میں اردو کے جن قلم کاروں کو ان کی زندگی میں سب سے زیادہ پڑھا اور سراہا گیا ان میں ایک اہم نام فکر تونسوی کا بھی ہے جنھیں بلا خوف تردید اردو کا سب مقبول مزاحیہ کالم نگار کہا جاسکتا ہے۔ یہی نہیں ان کے یومیہ کالم 'پیاز کے چھلکے' کو بھی یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ تیس سال سے بھی زائد عرصے تک روزانہ چھپتا رہا اور اس ریکارڈ کو آج تک کوئی نہیں توڑ پایا ہے۔ تقسیم وطن کے بعد لاہور سے جالندھر اور پھر نئی دہلی وحیدراباد منتقل ہونے والے اردو روزنامہ ملاپ میں فکر صاحب کا یہ کالم اخبار کے قارئین کی پہلی پسند ہوا کرتا تھا۔ کالم اس قدر مقبول تھا کہ جس روز کسی اشد مصروفیت یا علالت کی وجہ سے فکر صاحب کالم تحریر نہ کر پاتے، اس روز بھی کالم کی مقررہ جگہ پر مضمون تو ضرور کسی اور کا چھپتا تھا لیکن کالم کے عنوان کو ہٹانے کی بجائے 'پیاز کے چھلکے' لکھ کر اسے کراس X کر دیا جاتا تھا، تاکہ قاری کو پہلے ہی اندازہ ہو جائے کہ آج 'پیاز کے چھلکے' کا ناغہ ہے۔ روزمرہ کی سماجی، سیاسی زندگی میں آتی ہوئی تبدیلیوں اور تضادات کو آئینہ دکھانے والے اس کالم کے کئی مجموعے بھی شائع ہوئے، اور خود فکر صاحب کا ذہن بھی روزمرہ تخلیقی عمل سے گزرنے کے سبب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ دو مرتبہ نروس بریک ڈاؤن کے شکار ہوئے۔ لیکن کئی مہینوں کی ناغہ کے بعد صحت مند ہو کر کام پر واپس آئے تو ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود ایک بار پھر نئی توانائی سے کالم لکھنا شروع کر دیا۔

فکر تونسوی کا اصل نام رام لال بھاٹیہ تھا۔ وہ 7 اکتوبر 1918 کو شجاع آباد (ضلع ملتان) میں پیدا ہوئے۔ تاہم ان کا آبائی وطن تونسہ شریف (ضلع ڈیرہ غازی خان) تھا اور اسی نسبت سے وہ تونسوی کہلائے۔ ان کے والد دھنپت رائے کوہ سلیمان بلوچ قبائل میں تجارت و طبابت کرتے تھے۔ فکر کی ابتدائی تعلیم تونسہ شریف میں ہوئی اور وہیں سے درجہ اوّل میں میٹرک پاس کیا۔ پھر ایمرسن کالج ملتان میں داخلہ لیا۔ لیکن نامساعد حالات کے پیش نظر ایک سال بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ اس کے بعد کئی پیشے اختیار کیے اور بالآخر صحافت سے منسلک ہوئے۔

فکر تونسوی کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا تھا۔ اسکول کے زمانے ہی میں غزلیں کہنی شروع کر دی تھیں۔ شہرت 1942 میں نصیب ہوئی جب ان کی نظم 'تنہائی' ادبی دنیا میں شائع ہوئی اور اُسے اس سال کی بہترین نظم قرار دیا گیا۔ 43-1942 کے آغاز میں ترقی پسند تحریک کے نمائندہ جریدے 'ادب لطیف' سے منسلک ہوئے۔ 1945 میں ممتاز مفتی کے اشتراک میں ایک طرز نو کا ادبی دو ماہی رسالہ 'سویرا' جاری کیا۔ 1946 میں انھوں نے ماہنامہ 'ادب لطیف' کی ادارت سنبھالی۔ ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان چلے آئے اور کالم نگاری شروع کی۔ پہلے کمیونسٹ پارٹی کی پنجاب برانچ کے روزنامہ 'نیا زمانہ' میں ایک طنزیہ کالم 'آج کی خبر' کے نام سے لکھتے رہے۔ پھر دہلی میں سکونت اختیار کی اور روزنامہ 'ملاپ' میں 1956 سے 'پیاز کے چھلکے' نامی روزانہ کالم لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ 1984 میں ملاپ سے رٹائرمنٹ کے بعد بھی مرتے دم تک جاری رہا۔ 12 ستمبر 1987 کو دہلی میں ان کا انتقال ہو گیا اور اردو ادب ایک منفرد طنزیہ مزاحیہ کالم نگار سے محروم ہو گیا۔

1947 میں فکر کی نظموں کا پہلا مجموعہ 'ہیولے' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ پھر انھوں نے شاعری ترک کی اور طنز و مزاح پر بھرپور توجہ دی۔ فکر کی پہلی نثری تصنیف 1949 میں شائع ہوئی جس کا نام 'چھٹا دریا' تھا جو فسادات پر ایک دردناک ڈائری کے فارم میں تھی۔ فسادات کے سلسلے میں ان کی دوسری کتاب 'ساتواں شاستر' 1949 میں چھپی۔ اس کے بعد طنز و مزاح کے مضامین پر مشتمل ان کی 16 تصانیف شائع ہوئیں جو حسب ذیل ہیں:

تیر نیم کش (1953)، پروفیسر بدھو (1954)، ماڈرن الہ دین، خد و خال، ساتواں شاستر (1956)، ہم ہندوستانی (ہندی، 1957) بدنام کتاب (1958)، آدھا آدمی (1959)، آخری کتاب (1961)، فکر نامہ (1966)، پیاز کے چھلکے (1972)، چھلکے ہی چھلکے (1973) فکریات (1982) گھر میں چور (1983)، میں (آپ بیتی حصہ اول 1987)، میری بیوی (آپ بیتی، حصہ دوم (1987)۔

1985 میں انھوں نے اردو ماہنامہ 'چنگاری' نئی دہلی کا ایک ضخیم 'اردو کالم نگار' نمبر مرتب کیا تھا جسے اس موضوع پر حرف اول بھی کہا جاسکتا ہے اور حرف آخر بھی۔

ماخذ: 'فکر تونسوی' از ڈاکٹر مہتاب امروہی، 'فن و شخصیت' کوائف نمبر 1994

فکر تونسوی

دس روپے کا نوٹ

دس روپے کے اس کرنسی نوٹ نے جس پر راہ چلتے سڑک پر میری نظر پڑ گئی تھی۔ اس نے میری پوری اقتصادی پسماندگی کو الف ننگا کر دیا تھا اور مجھے پچیس برس پہلے کی وہ آوارہ عورت یاد آ گئی جسے میں نے دس روپے کا نوٹ پیش کیا تھا تو اس نے اپنے زرتار بدن کے پورے کپڑے اتار دیے تھے اور استہزائیہ قہقہہ لگا کر کہا تھا ''اب ناپ لو اس نوٹ سے میرا پورا بدن۔ اور خوشی سے مالا مال ہو جاؤ۔''

اس استہزائیہ قہقہے کی زد سے اس وقت تو نہیں، لیکن آج میں دس روپے کے کرنسی نوٹ کو دیکھ کر کپکپا اٹھا تھا۔ اگرچہ کپڑے تو عورتیں آج بھی اتار دیتی ہیں۔ مگر اتارنے کا اماؤنٹ دس روپے نہیں بلکہ بہت سے دس روپوں تک پہنچ گیا ہے۔ البتہ اسے آوارگی نہیں کہتے ہیں۔ بلکہ آرٹ کہتے ہیں۔ روپوں کی تعداد کچھ اور زیادہ ہو تو زعما اور شرفا اسے فائن آرٹ کہہ دیتے ہیں۔

بہرکیف اس الف ننگا پن کو صرف میری اقتصادی پسماندگی نہ سمجھا جائے بلکہ میری اخلاقی پسماندگی کو بھی اس میں شامل کرلیا جائے۔ واقعہ کچھ غیر معمولی نہیں تھا مگر انسان کی سرشت عمل فرما ہو جائے تو انسان کو علم بھی نہیں ہوتا کہ کوئی معمولی چیز اس کے اندر غیر معمولی ہو رہی ہے دراصل سڑک پر چلتے چلتے میں کچھ ایسی باتیں سوچتا جا رہا تھا جن کا مجھ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مثلاً یہ کہ ایک دفاعی سودے میں ایک صاحب نے کروڑوں روپوں کی کمیشن ہڑپ کر لی تھی مگر میرے لیے یہ بے مطلب بات تھی۔ کروڑوں روپے؟ ہنہ! تو مجھے اس سے کیا؟ آج سے پندرہ برس پہلے میں نے ایک رشتہ دار سے پندرہ روپے طلب کیے تھے مگر وہ انھیں پندرہ برس بعد بھی نہیں بھولا۔ آج تک متواتر تقاضا کرتا آ رہا ہے کہ تم نے وہ پندرہ روپے بطور قرض لیے تھے۔ لہٰذا حساب بیباق کر دو۔

حالانکہ میں انھیں سینکڑوں مرتبہ سنجیدگی سے سمجھا چکا ہوں کہ وہ قرض نہیں تھا بلکہ رشتے داری تھی مگر ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ نجانے اللہ تعالیٰ کچھ انسانوں کو کیوں پیدا کر دیتا ہے۔ آیا وہ نہیں جانتا کہ عمر بھر ان کی سمجھ ناقص ہی رہے گی۔

بہرکیف ایسی بے مطلب باتیں سوچتے سوچتے اچانک میری نگاہ ایک ایسی چیز پر پڑی جس کا کچھ مطلب تھا یعنی دس روپے کا ایک کرنسی نوٹ سڑک پر پڑا تھا۔ بے اختیار اندر سے ایک لہر اٹھی کہ اسے اٹھا لوں اور اتنی تیز رفتاری سے اٹھاؤں کہ خدا کو (جسے میں نہیں مانتا) تو چاہے نظر آ جائے مگر میرا یہ فعل خدا کے کسی بندے کو نظر نہ آئے۔

یہ منفی لہر ہے، چھوڑو، ہماری لغات فیروزی میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔

مگر پھر ایک اور لہر — سرشت جو منفی اور مثبت کا منبع ہے۔ اس نے سر اٹھایا۔ ''کس زمانے میں جی رہے ہو۔ اخلاق کو بلند رکھتے ہوئے تمھیں شرم آنی چاہیے۔ اٹھا لو نوٹ! ہر آدمی روپے کے پیچھے بھاگ رہا ہے اسے خدا سمجھ ! برسوں کی تنگ و دو کے بعد تو یہ ایک نیا نویلا، پرکشش اور مہربان خدا ملا ہے مگر تم ابھی تو اس فرسودہ خدا سے چمٹے پڑے ہو کہ وہ تمھارے لیے کوہ ندا سے صدا دے گا۔

یہ لہر زوردار تھی اس لیے تیزی سے میرے قدم کرنسی نوٹ کی طرح آگے بڑھنے لگے۔ مگر درمیان میں دو چار سیکنڈ کی ایک اور لہر آ گئی۔ اس لہر کے پس منظر میں مرحوم والد صاحب وارد ہو گئے۔ مرحوم والد صاحب خدا انھیں جنت یا جہنم جہاں بھی مناسب جگہ ملی ہو گی نصیب کر چکے ہوں گے ایک مرتبہ جب میں ابھی آٹھ سال کا تھا، انھیں آ کر عرض کیا کہ یہ ایک اٹھنی مجھے سڑک پر آتے ہوئے ملی ہے تو وہ آگ بگولہ ہو گئے۔ یوں لگا جیسے گزشتہ آٹھ دس نسلوں کو آگ لگ گئی ہے۔ زناٹے کا ایک تھپڑ رسید کر کے بولے — ''اور تم نے اٹھا لی؟ حرامی تخم! کیوں اٹھائی؟ خاندانی عزت کا بیڑا ایک نگوڑی اٹھنی کے عوض غرق کرو، ابھی جاؤ، جہاں سے اٹھائی ہے وہیں رکھ آؤ۔ غیر کے مال پر اپنی ساکھ بناتے ہو؟''

والد صاحب کی یہ لہر کافی دل دہلا دینے والی تھی۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اگر وہ میرے والد صاحب نہ ہوتے کسی اور کے ہوتے تو وہ انھیں دو کوڑی کا والد بھی نہ سمجھتے۔ والد صاحب کی لغات فیروزی کا وہ پرانا ایڈیشن تھا جس میں خاندان اور عزت وغیرہ کا کچھ اور مفہوم تھا مگر اب تو زمانے نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ لغات فیروزی کے کتنے ہی نئے نئے اور دلآویز ایڈیشن چھپ چکے ہیں جن میں صاف صاف لکھا ہے کہ دس روپے میں آپ کو ایک ماچس تک نہ ملے گی۔ دس روپے کا مفہوم ہے ایک ماچس۔ چین میں جب انقلاب آیا تھا — جب انقلاب سے پہلے وہاں ایک ماچس خریدنے کے لیے دس روپے کے نوٹوں کی ایک گٹھڑی باندھ کر مارکیٹ میں لے جانا پڑتی تھی۔ لہٰذا آج کے دور میں جب تم دس روپے کا ایک نوٹ اٹھاتے ہو، تو گویا فقط ایک ماچس اٹھاتے ہو اور ایک ماچس اٹھانے کا مطلب ہے انقلاب کی آمد آمد! — ہاتھ آگے بڑھا۔ (احمق کہیں کے!)

پہلے احمق کی ہمت بڑھی اور پھر ہاتھ بڑھا۔ لیکن ہاتھ بڑھانے سے پہلے ایک چوکسی اور دور بینی ضروری تھی۔ اِدھر اُدھر چاروں طرف دیکھ بھال کر تشفی کر لی کہ کہیں کوئی آتا جاتا شخص دیکھ کر یہ نہ سمجھے کہ میں پرائے مال کی چوری کر رہا ہوں (میرا والد کمبخت مرتا کیوں نہیں میرے ایک گوشے میں اب تک زندہ کیوں ہے؟) — بہرحال تیکھی اور اندھی جرأت کر کے نوٹ کو گرفت میں

لینے ہی لگا تھا کہ ہوا کا ایک تیز طرار جھونکا آیا جس نے اس کرنسی نوٹ کو آگے دھکیل دیا اور اب نوٹ اور میرے ہاتھ کے درمیان دس گز کا فاصلہ پیدا کر دیا۔

اور نوٹ سڑک پر کھڑی ماروتی کار کے اگلے پہیے کے قریب جا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ کار کے عقبی حصے پر ایک چیت کبرا کتا اپنی ایک ٹانگ اٹھا کر پیشاب عرض کر رہا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ کتا پیشاب نہیں بلکہ کوئی مصرعہ عرض کر رہا ہو۔ یہ مصرعہ ہے یا مصرعہ طرح ہے، میں وضاحت سے نہیں کہہ سکتا۔ البتہ پیشاب کرتے ہوئے چوں کہ معمولی سے کچھ زیادہ ٹائم لگ گیا اس لیے شبہ ہوا کہ کسی لمبی بحر کا مصرعہ عرض کر رہا ہے۔

سوچا ایک پتھر مار کر اسے وہاں سے بھگا دوں مگر شاعری جیسی مقدس چیز میں یہ مداخلت تھی۔ کچھ جھجکا بھی کہ کہیں کتا یہ نہ سمجھے کہ میں ہوٹنگ کر رہا ہوں اور خطرہ تھا کہ ہوٹنگ پر کتا زور شور سے بھونکنے لگے، کاٹ کھائے۔

اس لیے ہندوستانی روایات کے مطابق صبر و شکر سے کھڑا رہا۔ یہ صبر و شکر کی دولت ہندوستانیوں کے نصیب میں نہ ہوتی تو سرمایہ دارانہ نظام کو چالیس برس تک سوشلزم کہہ کر برداشت نہ کرتے رہتے۔

چند سیکنڈ بعد میں نے دیکھا کہ کتا اپنا کام یعنی پیشاب تمام کر چکا تو سبک سر ہو گیا اور مجھے یوں لگا کہ وہ پیشاب نہیں تھا بلکہ اسے اپنے ضمیر کا اظہار کرنا تھا اور اظہار بھی اغیار کی اس چیز یعنی کار پر کرنا تھا جو اغیار کی برتری کا ثبوت تھی مگر کتا بھی اس برتری کو بچشم قلندر سمجھتا تھا کیوں کہ وہ اپنے اظہار کو کار سے کم برتر نہیں سمجھتا تھا۔

مگر پھر مجھے اپنے اوپر طیش آیا کہ میں کیوں خواہ مخواہ کتنے کی نفسیاتی طور پر مغز پچی کر کے تضیع اوقات کر رہا ہوں۔ میرا نصب العین تو فقط وہ دس روپے کا نوٹ تھا جو ماروتی کار کے اگلے پہیے کے قریب پڑا تھا لیکن کتا سبک سر ہونے کے بعد وہاں سے جاتا کیوں نہیں؟ یوں محسوس ہوا، سبک سر ہونے کے بعد اس نے انگڑائی لی جیسے مشاعرہ لوٹ لیا ہو۔ اس کے چہرے پر کچھ توانائی اور شوخی نمودار ہوئی۔ اس توانائی اور شوخی کا تعلق اس دس روپے کے نوٹ سے ہرگز نہیں تھا۔ وہ تو صرف میرا مطمح نظر تھا۔ کتے کا نہیں! اُس کا علم نوٹ کی موجودگی کے متعلق، ہم انسانوں کے متعلق بے حد ناقص تھا کیونکہ ہم اشرف المخلوق تھے، وہ اشرافیت سے محروم تھا۔

اس کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ وہاں سے چلا جاتا۔ چاہے سامنے پارک میں لیٹی کتیا سے چھیڑ خانی جا کر کرتا۔ کوئی انسان اعتراض نہ کرتا۔ مگر یوں محسوس ہوا کہ اس کا اخلاق بھی اس برہم پرکاش ایڈوکیٹ کی طرح برتری سے محروم ہے جن کی یہ ماروتی کار تھی۔

اور پھر سچ مچ ایڈوکیٹ صاحب اپنی کوٹھی سے باہر ایک چابک لے کر نکل آئے۔ کتے کی طرف اچھالا۔ کتا شاید چابک سے بیگ گونہ آشنا تھا۔ بے تحاشا بھاگ گیا۔ میرے لیے میدان کتے سے خالی ہوا مگر ایڈوکیٹ سے بھر گیا۔ دنیا میں کوئی جگہ خالی نہیں رہتی، خالی ہوتے ہی بھر جاتی ہے۔

مجھے دیکھتے ہی مسکرایا۔ چار و ناچار مجھے بھی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دینا پڑا۔ ورنہ اس شخص سے مجھے شدید حقارت تھی کیونکہ یہ دھرم ادھرم دونوں میں ایمان داری کی حد تک یقین رکھتا تھا۔ بڑی رسمی عقیدت سے بولا ''آئیے، آئیے، تشریف لائیے نا، غریب خانے پر رامائن کی کتھا ہو رہی ہے۔ اپنے چند قیمتی لمحے صرف کر کے کتھا کا لابھ اٹھا لیجیے نا—؟ بڑا آنند آ رہا ہے۔''

میرے منہ سے نکلا ''مگر آپ آنند چھوڑ کر باہر کیوں آ گئے؟''

''اجی، کتھا سنتے سنتے میں نے دیکھا۔ ایک کتا اپنی غلاظت سے میری نئی نئی کار کو پلید کر رہا ہے۔ اس لیے چابک اٹھا کر...''

میرا جی چاہا، اسے کہہ دوں، اس کتے کو بھی سمجھا بجھا کر کتھا سننے کے لیے لے جائیے۔ مگر اس کے لیے جرأت رندانہ کی ضرورت تھی اور میرے ایسے دس روپے کے لالچی میں کہاں؟ اور پھر خطرہ تھا کہ کہیں دس روپے کے نوٹ پر اس کی نظر نہ پڑ جائے اور اسے اٹھا لے اور میری پوری فیٹو ین محنت رائیگاں جائے اور کچھ بعید بھی نہیں تھا۔ اٹھا لیتا اور میرے دعوے کو قانون کی غیر قانونی حرکتوں سے جو ہر قانون میں موجود ہوتی ہیں۔ مجھے شکست فاش دلا دیتا۔ گزشتہ سال ایک ایم اے پاس نو بیاہتا دلہن نے سسرال کے ہاتھوں خودکشی کر لی تھی تو اسی ایڈوکیٹ نے قانون کی غیر قانونی حرکتوں سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ دلہن ایک نفسیاتی مریض تھی۔ خودکشی اسی مرض کا شکار ہو کر کی تھی۔

اور یوں اس ایڈوکیٹ نے سسرال سے ہزاروں روپے اینٹھ لیے۔ اس ماروتی کار نے بھی ان ہزاروں روپوں کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ وہی ماروتی کار جس پر کتے نے پیشاب عرض کیا تھا۔ کتے اور میری حقارت میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔

''تو پھر چلیے نا؟ میرے گھر میں رام کتھا..'' وہ سر جھکا کر بولے۔

جی چاہا کہہ دوں۔ آپ کے گھر پر تو کتے پیشاب کر رہے ... مگر کہہ صرف یہی سکا'' میں کیمسٹ سے یہ دوائی لینے جا رہا ہوں۔ میرا بیٹا بخار میں تڑپ رہا ہے۔ اس کے بعد آنند لینے کے لیے حاضر ہو جاؤں گا''

میں نے جھوٹ بولا مگر ہمیشہ جھوٹ بولنے والے ایڈوکیٹ نے اسے سچ سمجھا اور جلدی جلدی لوٹ گیا، رام کتھا وہ کرا رہا تھا، مگر رام بھگوان نے میری سن لی اور اسے وہاں سے دفع کر دیا اور میری نگاہ پھر اس دس روپے کے نوٹ پر جا ٹکی۔ جواب سالا، ہوا کی پھر نئی لہر سے کار کے پہیے سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

سوچا، چھوڑو سالے کو۔ لگتا ہے، یہ میرے نصیب میں ہی نہیں ہے۔ ضرور کسی منحوس کا ہوگا۔ منحوس کا نہ ہوتا تو کیا میرے ہاتھ نہ آتا۔ منحوس کا خیال آتے ہی سب سے پہلا نام جو میرے ذہن میں آیا وہ اسی ایڈوکیٹ کا تھا۔ یہ نام نفسیاتی طور پر میرے لیے بڑا آنند مئی ثابت ہوا۔

''آپ یہ کیا اٹھا رہے ہیں؟'' ایڈوکیٹ نے پوچھا۔

''دس روپے کا نوٹ! ایسا نوٹ جسے آپ پرایا مال سمجھ کر آپ کی ڈکار تک نہیں سنائی دیتی کیوں کہ آپ کی رام کتھا کا لاؤڈ اسپیکر ڈکار سننے نہیں دیتا۔''

''بیکار کی چہ میگوئیاں مت کرو، یہ نوٹ میرا ہے۔''

''نہیں، یہ نوٹ میرا ہے۔''

''میں تمھیں کورٹ میں گھسیٹ کر لے جاؤں گا اور وہاں ثابت کر دوں گا کہ یہ نوٹ میرا ہے۔''

''اور میں بھی کورٹ میں جا کر ثابت کر دوں گا کہ یہ نوٹ میرا ہے۔''

''بکومت! یہ میرا ہے۔''

''گالی ایضاً ایضاً! نوٹ میرا ہے۔''

مگر نوٹ ابھی تک کسی کا نہیں تھا۔ تخیلی ڈائیلاگ کے باوجود نہیں۔ کیونکہ وہ اڑ کر خشک نالی میں جا گرا تھا اور میں ابھی اس کشمکش میں کھڑا تھا کہ اسے اٹھاؤں یا نہ اٹھاؤں کہ اچانک سامنے سے میرا آٹھ دس سال کا بیٹا آتا دکھائی دیا۔ اداس، مغموم، جیسے کہیں سے مار کھا کر آ رہا ہو۔

''کیا ہوا کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''ڈیڈی! مارکیٹ گیا تھا سودا لینے دس روپے کا نوٹ لے کر۔ مگر وہ راستے میں کہیں گر گیا۔''

میں نے اسے زناٹے کا چپت رسید کر دیا اور کہا— ''نالائق اولاد! اس نالی میں جھانکو۔ تمھارا نوٹ وہاں پڑا ہے۔ پڑا ہے کہ نہیں؟''

□

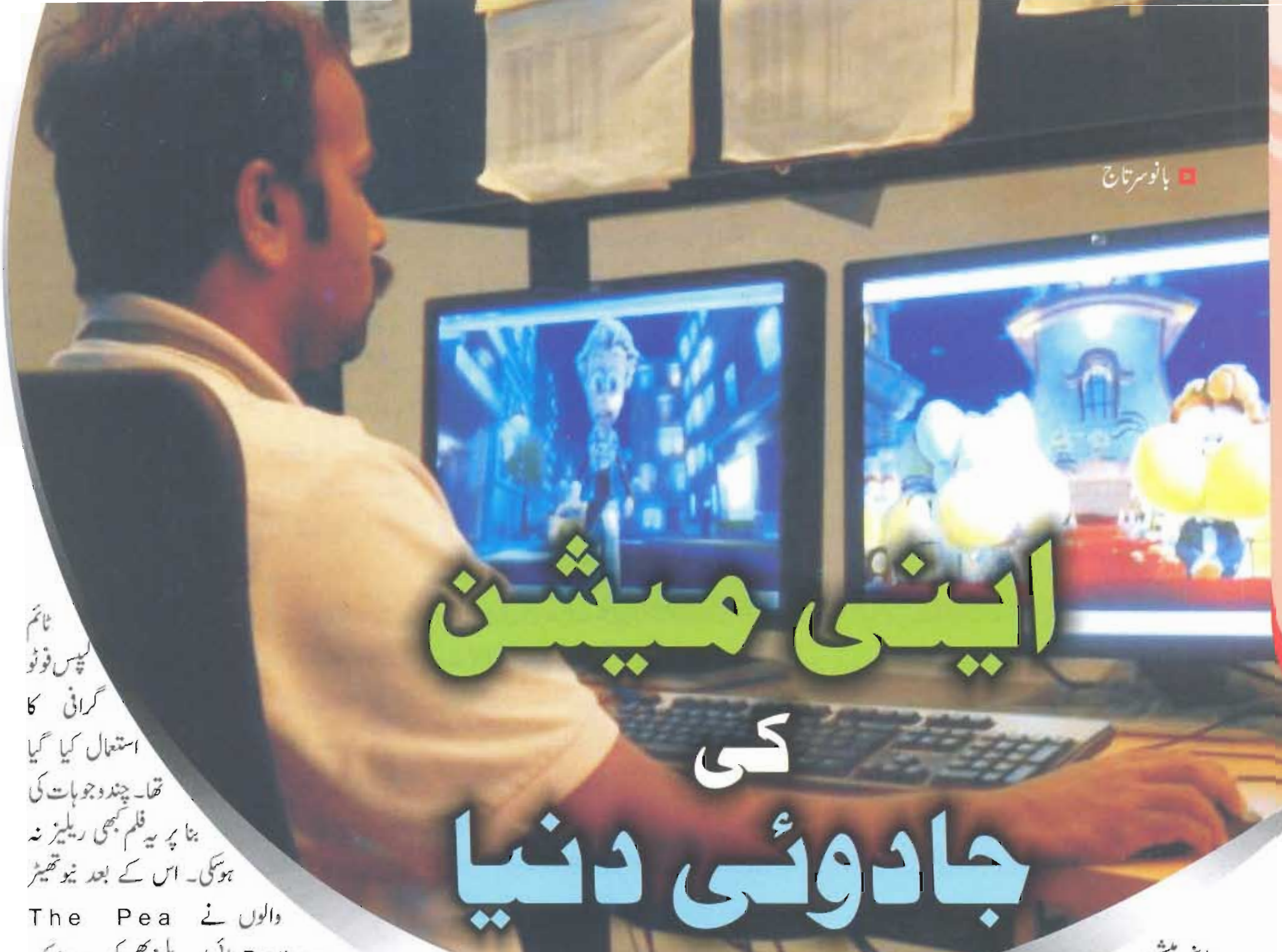

■ بانو سرتاج

اینی میشن کی جادوئی دنیا

اینی میشن کا بنیادی خیال ایک کھلونے سے سامنے آیا۔ ٹومیٹرپ (Tomatrope) نامی یہ کھلونا بچوں میں بے حد مقبول تھا (اب بھی ہے) اس میں گول کارڈ بورڈ پر دونوں طرف تصویریں ہوتی ہیں اور کارڈ بورڈ کے دونوں سروں پر دھاگا بندھا ہوتا ہے۔ دونوں طرف سے دھاگے پکڑ کر کارڈ بورڈ کو تیزی سے گھمانے پر دونوں تصاویر باہم اتنی مل جاتی ہیں کہ انھیں الگ الگ شناخت کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ دراصل اس عمل میں آنکھیں ایک امیج پر ایک سیکنڈ کے لیے رکتی ہیں کہ فوراً دوسری تصویر وہاں آجاتی ہے۔ یہ Quick Flash میں اینی میشن animation ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب نئی ایجادات نہیں ہوئی تھیں۔ تصاویر ہاتھ سے بنائی جاتی تھیں اور انھیں پروجیکٹر پر فریم در فریم دکھایا جاتا تھا ان کی رفتار بہت کم ہوتی تھی۔ رفتار کم ہونے سے تصاویر صحیح طریقہ سے پیش نہیں کی جاسکتی تھیں اور جلدی نہیں دکھائی جاسکتی تھیں، Super impose نہیں کی جاسکتی تھیں کہ انھیں الگ الگ نہ دیکھا جاسکے... رفتار کم ہونے سے تصاویر کے الگ الگ ہی نظر آنے سے مشین کی ضرورت محسوس ہوئی کمپیوٹر نے یہ مشکل آسان کردی۔ اینی میشن فلمیں بننے لگیں۔ ہالی ووڈ کی شریک (Shrek)، آئس ایج، (Ice-Age) فائنڈنگ نیمو (Finding Nemo)، ٹنکر بیل (Tinker Bell) اور 1970-80 میں بھارت کی بھیم سین کھرانہ کی قومی یکجہتی پر بنائی گئی اینی میشن فلم 'ایک- انیک' بے حد مقبول ہوئیں۔ بھارت میں پھر ہنومان، دی رٹرن آف ہنومان، مائی فرینڈ گنیش، بال گنیش وغیرہ فلمیں بنائی گئیں۔ ریمانڈ کی انگلش اینی میشن فلم ٹنکر بیل کے تخلیق کار جیفری ایم ہاورڈ اور جے ایم بیری اور ڈائریکٹر بریڈلی تھے۔ اس کہانی میں ایک ننھی پری ٹنکر بیل اپنی چار سہیلیوں کے ساتھ پکسی ہالو مقام کی سیر کو جاتی ہے۔ ٹنکر بڑی پرجوش اور فعال پری ہے۔ سیر کے دوران وہ استعمال شدہ بے کار پڑی چیزوں کو جمع کرتی جاتی ہے اور پھر ان سے خوبصورت چیزیں بناتی ہے۔ اس فلم سے یہ سبق ملتا تھا کہ دنیا میں کوئی چیز بے کار نہیں ہوتی۔ نئے موضوع پر نئی تکنیک (اینی میشن) سے بنی یہ فلم بے حد مقبول ہوئی۔

ہندوستان میں 1912 میں داوا صاحب پھالکے نے اوّل اینی میشن فلم بنائی تھی، جس کا نام تھا The Growth of a Pea Plant اس میں اسٹاف موشن ٹائم لیپس فوٹو گرافی کا استعمال کیا گیا تھا۔ چند وجوہات کی بنا پر یہ فلم کبھی ریلیز نہ ہوسکی۔ اس کے بعد نیو تھیٹر والوں نے The Pea Brothers بنائی اور ریلیز بھی کی۔ ہرچند کہ رفتار دھیمی تھی مگر اینی میشن فلمیں بنانے کا سلسلہ چل پڑا۔ شادی کا لڈو، ہم تم، راجو چاچا، ابھے، میں پریم کی دیوانی ہوں، نیم اینی میشن (Semi animation) فلمیں تھیں۔ سہارا ون، موشن پکچرس، پرسپٹ (Percept) پکچرس نے ان فلموں کو پروڈیوس کیا تھا۔ اس کے بعد Son of Alladin, The Legend of Buddha, Ali Baba, Pandavas Sind baad, Behind the Wheel of Mists اور Bhagmati- The Queen of Fortune بنائی گئیں۔

بھارت کی اوّل کامیاب اینی میشن فلم 'ہنومان' تھی۔ اس فلم سے اینی میشن فلم انڈسٹری میں انقلاب آگیا۔ تین کروڑ روپے کی لاگت سے بنی اس فلم نے پہلے 50 دن میں 12 کروڑ کا بزنس کیا۔ اس فلم کے فوراً بعد کرشن، فلم بنی جو کافی پسند کی گئی، جدوجہد آزادی کے مایۂ ناز ہیرو بھگت سنگھ پر 6 فلمیں بنائی گئیں مگر ہنومان کی بات ہی کچھ اور تھی۔

ہنومان میں 160 اداکاروں نے کام کیا تھا جن میں 20 اینی میٹر کلاکار، 20 بیک گراؤنڈ آرٹسٹ، 60 دوسرے اداکار، 30 ڈیجیٹل کلاکار اور فوٹو شاپ میں کل 6 کلاکار اور سپروائزر تھے۔ اس میں 2 لاکھ سے زیادہ ڈرائنگ کا استعمال کیا گیا تھا۔ 2007 مناظر بنائے گئے تھے۔ 1750 بیک گراؤنڈ سین تھے۔ ہنومان کو مکمل ہونے میں دو سال کا عرصہ لگا۔

اینی میشن فلم انڈسٹری کے چند خاص مسائل ہیں جن میں سے کچھ پر قابو پالیا گیا ہے۔ ابتدائی فلموں کی ناکامی، فلموں کی تقسیم میں دشواریاں، تکنیکی دشواریاں، ٹیلنٹ کا فقدان وغیرہ نے اس انڈسٹری کو کافی متاثر کیا ہے۔ ابتدائی فلموں کی ناکامی کی تاریخ کا ذکر کیا جائے تو ہنومان سے پہلے پرسپٹ پکچرس نے The Legend of Buddha بنائی تھی جو بڑے بڑے شہروں میں ریلیز ہوئی اور لگنے کے ساتھ ہی اتر گئی۔ (یہ الگ بات ہے کہ فیچر فلم کی کیٹگری میں اس فلم کا nomination آسکر ایوارڈ کے لیے ہوا تھا۔ سن آف علادین، علی بابا، پانڈو، سندباد اور Behind the wheels of Mists بھی بری طرح فلاپ ہوئیں۔ بھاگ متی 'دی کوئین آف فارچون' سے اتنی بھی کمائی نہیں ہوئی کہ پروڈکشن کا خرچ نکل پاتا۔ شاہ رخ خان اینی میشن فلمیں بنانے میں دلچسپی رکھتے تھے مگر رسک لینے میں ڈرتے تھے۔۔ ان کا کہنا تھا ''اینی میشن فلم بنانے میں کم سے کم دو سال کا عرصہ لگتا ہے اور روپیہ بھی بہت زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ اس کے بعد اگر فلم نہ چلے تو چھوٹا پروڈیوسر تو سڑک پر آجاتا ہے۔ اگر میرا پروڈکشن ہاؤس ٹھیک چلتا رہا تو میں یہ رسک لینے کی ضرور کوشش کروں گا۔'' (حالیہ فلم را-ون) اس کی مثال ہے۔

اینی میشن فلموں کی تقسیم کا الگ مسئلہ ہے۔ اسپائس (spice) کمپنی، یش راج فلمز، سہارا ون...، پریتیش نندی کمیونی کیشن، ایڈلیب (Ad lab) وغیرہ کی پبلسٹی کا کام سنبھالتی ہے اس کے پروپرائٹر پر بھارت چودھری نے ایک بار کہا تھا ''ہمارے یہاں فلم نہیں، فلم اسٹار بکتے ہیں، اینی میشن فلم کو فروخت کرنا مشکل کام ہے۔ مثال کے طور پر ہالی ووڈ ہٹ فلم The Incredibles کے ہندی ورژن 'ہم ہیں لاجواب' کو بھارت میں فروخت کرنے کے لیے کنگ خان شاہ رخ کا نام اس فلم سے جوڑا گیا۔ شاہ رخ خان اور ان کے بیٹے سے فلم کی ڈبنگ کرائی گئی۔ پرسپٹ کمپنی اور سہارا ون کی طرح ہر فلم کمپنی اتنی اسٹرانگ نہیں ہے کہ اینی میشن فلم بنا کر اس کے نہ بکنے کا جوکھم اٹھا سکے... یا اپنے دم پر اُسے ریلیز کر سکے۔''

ہنومان فلم کی کامیابی نے پروڈیوسروں کو اینی میشن فلموں کے تئیں نظریہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ سہارا ون موشن پکچرس کے سی ای او سندیپ بھارگو نے اعتراف کیا کہ ''ہم غور کر رہے ہیں کہ اب کس طرح کی اینی میشن فلم بنائیں۔ ہنومان کی کامیابی تو یقینی تھی کیونکہ ٹی وی سیریلس میں رام، سیتا، کرشن اور دوسرے دیوی دیوتاؤں کو جس افراط سے دکھایا گیا تھا وہاں ہنومان کے ساتھ ایسا نہیں تھا... خصوصاً بال ہنومان (بچے ہنومان) کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ ہم اپنے موقف میں واضح تھے کہ ہمیں کیا بنانا ہے؟ اور کس کے لیے بنانا ہے؟ ہم نے بچوں کو مرکز میں رکھا تھا اس لیے چھوٹے ہنومان کا انتخاب کیا اور اسی کے حساب سے مارکیٹنگ اصول اپنایا۔ ہم ہزاروں اسکولوں میں گئے۔ ہنومان کی فوٹو والی نوٹ بک، اسٹیکر اور کھلونے بنوائے اور تقسیم کیے... اچھے پروجیکٹ اور اچھی مارکیٹنگ کا ہی نتیجہ ہے ہنومان کی بے مثال کامیابی۔''

مسئلہ تکنیکی دشواریوں کا بھی ہے۔ یو ٹی وی ٹونس، پاریجات اینی میشن اکادمی، جادو ورکس، سائنووا، کریسٹ، پینگا میڈیا وغیرہ کئی کمپنیاں ہیں جو اینی میشن فلمیں بناتی ہیں مگر یہ سب ٹو ڈی 2-D یا ٹو ڈائمنشن فلمیں بناتی ہیں۔ زمانہ تھری ڈی 3-D یا تھری ڈائمنشن کا ہے۔ (حالیہ خبر کے مطابق مہاراشٹر کے ناگپور شہر میں شیام ایڈونچرس نے 40 لاکھ کی لاگت سے 5-D اینی میشن فلم سینٹر قائم کیا ہے) اسی طرح کی انڈسٹری کا جال پورے ملک میں پھیل جائے تو ہندوستان میں اینی میشن کا سنہرا دور آجائے گا۔

ایک دشواری یہ بھی ہے کہ ہندوستان کی اینی میشن انڈسٹری کو سرکاری سرپرستی حاصل نہیں ہے... پھر ٹیلنٹ کی کمی بھی مسئلہ ہے۔ ہمارے یہاں ٹیلنٹڈ طلبا کو گود لیے جانے کا رواج نہیں ہے۔ کئی ملکوں میں ملٹی میڈیا کورس کے دوران ذہین طلبا کو بڑے پروڈکشن ہاؤس یا کارپوریٹ ہاؤس گود لے لیتے ہیں اور انھیں بہتر کارکردگی کے لیے تیار کرتے ہیں۔ بھارتیہ اینی میشن کے جادوگر وی جی ساونت اس ضمن میں کافی امیدیں رکھتے ہیں... ان کا کہنا ہے ''جہاں تک ٹیلنٹ کی بات ہے، اینی میشن فلموں کا ٹرینڈ (trend) تو ایسا چلے گا جس کا کسی نے تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ مغربی ممالک کے پاس اسپائڈر مین، سپر مین، مکی ماؤس، ڈونالڈ ڈک جیسے کیریکٹرس ہیں جن پر وہ فلمیں بنا رہے ہیں۔ ہمارے دھرم گرنتھوں میں تو ایسے کرداروں کی بھرمار ہے جن پر فلمیں بنا کر انڈسٹری ہزاروں سال تک چل سکتی ہے۔ ہماری لوک کتھائیں فلموں کے لیے بہت بڑا ماخذ ہیں جو اینی میشن میں اور مناسب اور خوبصورت لگیں گی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اینی میشن کا یہ سفر جو دیومالائی کہانیوں (mythological stories) سے شروع ہوا ہے، تاریخی اور لوک کتھاؤں سے ہوتا ہوا عصری سینما تک پہنچنے والا ہے۔ اینی میشن فلموں کا مستقبل بہت تابناک ہے۔''

واقعی یہ بات ہمارے ملک کے لیے خوش آئند ہے۔ اینی میشن فلمیں بھارت میں کم لاگت میں بن رہی ہیں۔ امریکہ میں آدھے گھنٹے کی اینی میشن فلم میں 2 کروڑ روپے خرچ آتا ہے جب کہ ہندوستان میں آدھے گھنٹے کی فلم پر صرف 40 لاکھ خرچ ہوتا ہے... اس لیے امریکی فلم پروڈیوسر ہندوستان میں فلم بنانے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ ہالی ووڈ کی The Fentom Menace, Star wars, The Mumy, Stuart Little وغیرہ فلمیں ممبئی کی مایا انٹرٹین منٹ میں تیار ہوئی ہیں۔ امریکہ کہ PBS نیٹ ورک نے اپنی ہٹ کارٹون سیریز Jackers-The Adentures of Pingle Binks) ممبئی کی کرسٹ (Crest communications) کمیونی کیشنز سے تیار کرائی ہے۔ ممبئی سے تیار کروائی گئیں کچھ اور اینی میٹڈ فلموں میں The Three Anigose, Cluty and Dumpling, Jack Frest, Ciber Doba اور Frog School وغیرہ اہم ہیں۔

غیر ملکی کمپنیاں بھارت کے اشتراک سے اینی میٹڈ فلمیں بنانے کے لیے آگے آرہی ہیں۔ مایا انٹرٹین منٹ کی سی ای او اور ڈائرکٹر کیتن مہتہ کی بیوی دیپا ساہی کا کہنا ہے ''عنقریب بھارت دنیا بھر میں اینی میشن کا مرکز بن جائے گا ... بس گورنمنٹ کا ساتھ دینا ضروری ہے ... سرکار سے اُسی مدد اور سرپرستی کی توقع ہے جو اس نے آئی ٹی انڈسٹری کو دی ہے۔ آج بھارت میں 2000 سے کہیں زیادہ اینی میشن اسکول چل رہے ہیں۔ بی ایف ایکس عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کررہا ہے۔ معقول تعداد میں گیم اسٹوڈیوز ہیں جہاں نوجوان لڑکے لڑکیاں تربیت لے رہے ہیں۔''

آیئے، اب دیکھتے ہیں کہ اینی میشن فلمیں بنتی کیسے ہیں؟

- سب سے پہلے کہانی کا انتخاب کیا جاتا ہے پھر کہانی کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کیا جاتا ہے یعنی اسکرپٹ تیار کی جاتی ہے۔
- لینڈ اسکیپ تیار کیا جاتا ہے جس پر کردار موومنٹ کرتے ہیں۔
- پھر فلم کے فریم بنتے ہیں۔ ایک سیکنڈ کے لیے عموماً 25 فریم درکار ہوتے ہیں۔ منظر کی ضرورت کے مطابق فریم کم زیادہ بنتے ہیں۔ منظر دھیما ہو تو فریم کم اور منظر تیزی سے چلنے والا ہو تو فریم زیادہ بنائے جاتے ہیں۔ (('ہنومان' فلم کے لیے 2 لاکھ فریم تیار کیے گئے تھے۔ ہالی ووڈ کی فلموں میں اس سے کہیں زیادہ فریم تیار ہوتے ہیں۔)
- کرداروں کے اسکیچ تیار کیے جاتے ہیں جب تمام کردار کاغذ پر منتقل ہوجاتے ہیں تو انھیں inking ڈیپارٹمنٹ میں بھیجا جاتا ہے Inkers تصاویر یا اسکیچز کو شفاف (transparent) شیٹ پر نقل کرتے ہیں۔ اس عمل کو Eketat سیلولائیڈ یا سیل کہتے ہیں۔ نقل کرنے یا کاپی کرنے کا عمل Linking کہلاتا ہے۔
- سیل سے نکلی کاپی پینٹنگ ڈپارٹمنٹ کو بھیجی جاتی ہے جہاں پینٹر پشت کی طرف سے اسے پینٹ کرتے ہیں جس سے تصاویر رنگین ہوجاتی ہیں .... آوٹ لائن ابھر جانے سے وہ صاف اور واضح نظر آنے لگتی ہیں۔
- تصاویر کو بیک گراؤنڈ پر فٹ کرتے ہیں۔ ٹیبل پر رکھ کر تصاویر کو فریم در فریم کیمرہ سے فلمایا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کردار بیک گراؤنڈ کی مختلف سمتوں میں چل پھر رہے ہیں۔ یہ ... ٹو ڈی (2-D) اینی میشن کا عمل ہے۔ تھری ڈی اینی میشن میں اسکیچ یا تصاویر کی جگہ گڈے گڑیاؤں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اسٹوڈیو میں بیک گراؤنڈ کے باقاعدہ سیٹ لگائے جاتے ہیں۔ (عامر خان کی فلم 'تارے زمین پر' Clay animation کا عمدہ تجربہ تھی۔

اب ہم دیکھیں گے کہ اینی میشن فلم کے کردار بولتے کس تکنیک سے ہیں:

- فلم کے شوٹ ہونے سے قبل ہی ڈائیلاگ ریکارڈ کرکے magnetic فلم میں ٹرانسفر کردیے جاتے ہیں۔
- اس کے بعد ساؤنڈ ریڈر (Sound Reader) کی مدد سے ان الفاظ کو رکن تہجی (syllables) میں تبدیل کیا جاتا ہے۔
- ڈائیلاگ (مکالموں) کی طوالت کے مطابق فریم طے کیے جاتے ہیں ... مثلاً کوئی کیریکٹر بولتا ہے، 'میں سپرمین بننا چاہتا ہوں' تو ساؤنڈ ریڈر بتاتا ہے کہ ڈائیلاگ بولنے میں کتنا وقت لگا؟
- ساؤنڈر ریڈر کی مدد سے اینی میٹر animator دیکھتا ہے کہ کیریکٹر کو کس لفظ پر کتنی دیر منہ کھولنا ہے اور کتنی دیر بند رکھنا ہے۔
- ڈائیلاگ کے حساب سے فریم شوٹ کیے جاتے ہیں اور آواز ڈالی جاتی ہے اس کے بعد فلم تواتر کے ساتھ تیار (syncronlised) ہوتی ہے۔
- کیمرے کا لینس، بیک گراؤنڈ اور سیلولائیڈ پر عمودی (vertical) سیٹ کیا جاتا ہے جس سے بیک گراؤنڈ اور سیلولائیڈ دونوں مکمل طور پر کور ہوسکیں۔ پھر شاٹ لیا جاتا ہے... یہی عمل تمام سیلولائیڈ کے ساتھ دہرایا جاتا ہے۔

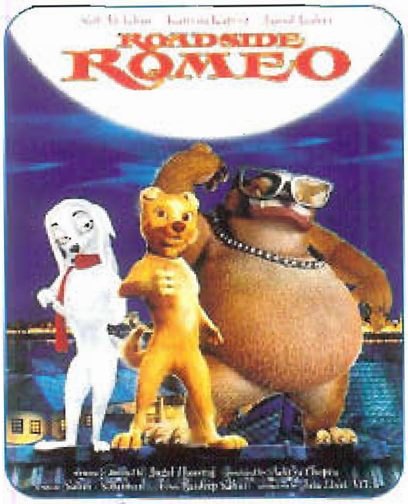

- سب سے آخیر میں فلم لیب میں جاتی ہے جہاں امیج (image) کے ساتھ آواز (ڈائیلاگ) کو ملا کر دیکھا جاتا ہے کہ کہیں گڑبڑ تو نہیں ہوگئی؟
- بیک گراؤنڈ اور اسپیشل ایفیکٹس (special effects) فلم شوٹ ہونے کے بعد ڈالے جاتے ہیں اور فلم تیار ہوجاتی ہے۔

اینی میشن فلموں کی تیاری میں کئی لوگوں کا اہم کردار ہوتا ہے۔ ان میں اسکرپٹ رائٹر (script writer)، اسٹوری السٹریٹر (story illustrator)، ڈیزائنر (designer) کی اینی میٹر (key animator)، اینی میٹرس (animators) اسسٹنٹ اینی میٹرس (assistant Aimaors) لے آوٹ آرٹسٹ (Layout Artists)، ان بٹوین ویورس (inbetween viewers) ڈرائنگ میکرس (Drawing Makers)، اسکینرس (Scaners)، ڈیجیٹل اسکینرس (Digital Scanners) وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

آج تو اگر کمپیوٹر کیمرہ اور اسکینر ہوں تو گھر میں اینی میشن فلم تیار کی جاسکتی ہے۔ بس ڈرائنگ آنا اور مصوری کا شوق ہونا ضروری ہے۔ طریقہ بہت آسان ہے۔ کیریکٹر کا انتخاب کرکے عنوان طے کریں اور پھر اس پر کیریکٹر ریسرچ کریں۔ کہانی تیار کریں۔ اسٹوری بورڈ بنائیں۔ ڈرائنگ کریں۔ مختلف کٹ آوٹ بنا کر تمام سین فریم میں رکھے جائیں۔ اچھے ویب کمپیوٹر سے فریم کرکے موشن (حرکت) اور میوزک دے دیں۔ ہوگئی فلم تیار!

اینی میشن فلم بنانے کے لیے سب سے پہلے یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ فلم کس لیے بنائی جارہی ہے... بچوں کے لیے یا بڑوں کے لیے ... (عموماً بچوں کے لیے ہی بنائی جاتی ہے)۔ پھر موضوع کا انتخاب ہوتا ہے۔ مذہبی موضوعات سب سے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ خاص طور سے لوگ کچھ مذہبی معلومات رکھتے ہیں اور مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وی جی ساونت اس عمل کو اور زیادہ واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں "اینی میشن فلم کے لیے سب سے پہلے ایک کردار کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ جیسے چیتک (chetak) یا پیاسا کوا... چیتک مہارانا پرتاپ کا گھوڑا تھا۔ اب اس گھوڑے کے بارے میں گہرائی سے ریسرچ کیجیے جیسے گھوڑا چیتک کس رنگ کا تھا؟ کہاں پیدا ہوا تھا؟ رانا پرتاپ کے پاس کہاں سے آیا؟ وغیرہ۔ ساتھ ہی اس کی کہانی تیار کرنی چاہیے۔ پھر اسٹوری بورڈ تیار کریں۔ اس کے بعد ڈرائنگ بنائیں اور مشاہدہ کریں۔ اب کٹ آوٹ کے ذریعے کہانی کے تمام منظروں کو ایک ایک فریم میں رکھیں۔ اچھے ویب اور کمپیوٹر سے فریم کرکے اس میں موشن اور میوزک بھر دیں۔ میوزک اگر گھر میں نہیں بناتے ہیں تو باہر سے بھی مل سکتا ہے۔ اب آپ اپنی اینی میشن فلم اپنے دوستوں اور مہمانوں کو دکھا سکتے ہیں۔"

سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں اینی میشن نہ صرف تفریح کا بلکہ روزگار کا بھی عمدہ ذریعہ ہے۔

■

Dr. Bano Sartaj, Opposite Akashwani, Civil Lines, Chandrapur - 442401 (M.S)

ڈاکٹر سی ایم خان

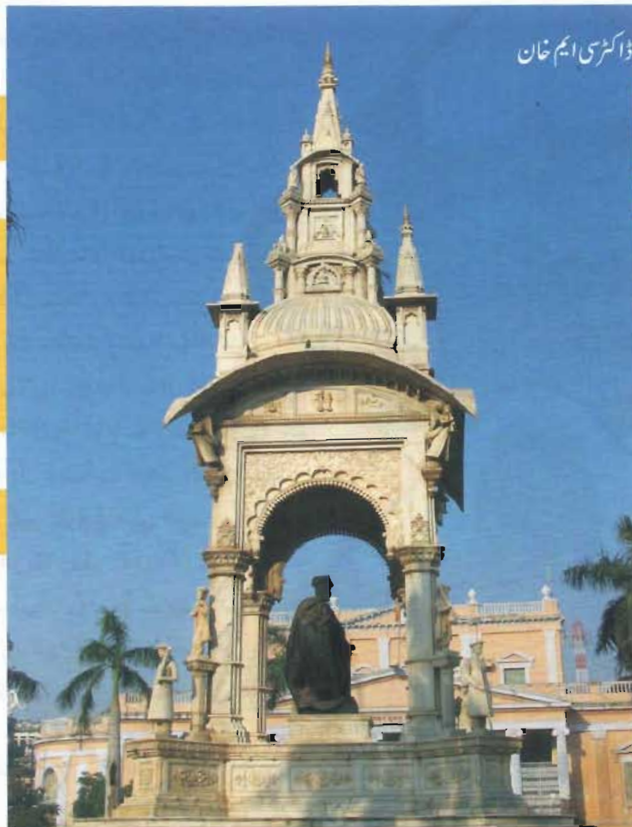

جیواجی چوک

گوالیار: ایک تعارف

شہر کا تعارف: شہر گوالیار ہندوستان میں مدھیہ پردیش کا ایک تاریخی شہر ہے جو کہ آگرہ سے 122 کلومیٹر جنوب میں اور مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال کے 423 کلومیٹر شمال میں واقع ہے۔ ملٹری پوائنٹ آف ویو سے گوالیار کی لوکیشن ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ گوالیار شہر ڈویژن کا ایڈمنسٹریٹو ہیڈکوارٹر بھی ہے۔ گوالیار ضلع شمال میں مرینہ ضلع اور جنوب میں شوپوری، مشرق میں بھنڈ و مغرب میں دتیا ضلع سے گھرا ہوا ہے۔ گوالیار ضلع میں چار بلاک مرار، ڈبرا، گھاٹی گاؤں وبھتر وار وغیرہ ہیں۔ یہاں کا موسم سبٹروپکل ہے۔ یہاں گرمی بہت شدت سے پڑتی ہے۔ سردی کے مہینے ٹیمپریٹ ہوتے ہیں لیکن کچھ وقت کے لیے سردی بہت ہوجاتی ہے۔ یہاں پرندے کم ہیں۔ میدانی علاقے کافی زرخیز ہیں جنگل کم ہیں۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں بہت کم آبادی رہتی ہے۔ اس کا اثر تعلیمی حلقوں میں بھی نظر آتا ہے۔ پہاڑی اور جنگلی علاقوں میں رہنے والے شہر میں رہنے والے لوگوں سے کم تعلیم یافتہ ہیں۔

تاریخی اہمیت: گوالیار شہر کی اپنی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ گوالیار اسٹیٹ کے حکمرانوں نے کلچرل سرگرمیوں کو کافی بڑھاوا دیا۔ اسی وجہ سے میوزک کا گوالیار گھرانہ کافی مقبول ہوا۔ شہنشاہ اکبر کے نورتنوں میں سے ایک میاں تان سین اِسی گوالیار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ گوالیار شہر کو سنگیت کا شہر بھی کہتے ہیں۔ یہاں ہر سال موسیقی کا کل ہندتان سین سماروہ پوری شان وشوکت سے منایا جاتا ہے جس میں ہندوستان کے کئی مشہور اور معروف فنکار شرکت کر کے اپنی عقیدت کے پھول میاں تان سین کے مقبرے پر پیش کرتے ہیں۔ تان سین کے علاوہ حسو خاں، حدو خاں، شنکر راؤ پنڈت سرودنواز استاد حافظ علی خاں، استاد امجد علی خاں اور بالا صاحب پوچھ والے بھی سرزمینِ گوالیار سے تعلق رکھتے ہیں۔ سو سال پرانا گوالیار کا میلہ جو کہ آج گوالیار ٹریڈ فیئر کے نام سے مشہور ہے اسی شہر میں منعقد ہوتا ہے۔

صنعت و حرفت: صنعت وحرفت کے لحاظ سے گوالیار ایک ترقی یافتہ شہر ہے۔ زیادہ تر صنعت کاشت کاری اور اس سے جڑے ہوئے دھندوں پر مشتمل ہے۔ دلی اور آگرہ کے نزدیک ہونے کی وجہ سے انٹراسٹیٹ ٹریڈ کافی پھل پھول رہا ہے نوجوانوں کو روزگار کے نئے نئے مواقع فراہم ہورہے ہیں۔ مالی حالت کے بہتر ہونے سے لوگ موڈرن ایمنٹیز کا فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلوانے کے لیے کوشاں ہیں۔ نئی نئی صنعتیں لگ رہی ہیں اور ہندوستان کے ساتھ ساتھ بیرونی ملکوں میں بھی ان کے پروڈکٹ کی کافی کھپت ہے۔

تعلیمی، سماجی اور سیاسی صورت حال: گوالیار شہر اپنی قدیمی وراثت اور تہذیب کے لیے مشہور رہا ہے اور ہندوستان میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ اس شہر میں جیواجی یونیورسٹی، آئی ٹی ایم یونیورسٹی، مہاراجہ مان سنگھ یونیورسٹی، مہارانی لکشمی بائی آرٹس اینڈ کامرس کالج، گجراراجہ میڈیکل کالج وغیرہ مشہور تعلیمی ادارے ہیں۔ ہندوستان کے سابق وزیرِ اعظم اٹل بہاری واجپئی اسی شہر سے تعلق رکھتے ہیں اور مہارانی لکشمی بائی کالج کے طالبِ علم رہے ہیں۔ مادھوراؤ سندھیا اور ان کا سندھیا اسکول گوالیار کی پہچان ہے۔ خواتین کے لیے کے آر جی کالج ایس ایل پی کالج مرار، وومین این سی سی کالج گوالیار مشہور ہیں۔ مدھوانسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، آیوروید کالج، ہومیوپیتھک کالج، آر کے لاجیکل سروے آف انڈیا، ڈفینس ریسرچ لیباریٹری، آل انڈیا ریڈیو گوالیار دوردرشن دغیرہ اور فوج کو ٹریننگ فراہم کرنے کے لیے اکادمی بورڈ سیکیورٹی فورس ٹیکن پور، لا انسٹی ٹیوٹ گوالیار تعلیمی حلقوں میں اپنا اہم مقام رکھتے ہیں۔

شہر کی تاریخی عمارتیں: گوالیار شہر کی تاریخی عمارتوں میں گوالیار کا قلعہ، جے ولاس پیلیس، مان مندر پیلیس، شہستر باہو مندر، گجری محل، تان سین کا مقبرہ، محمد غوثؒ کا مقبرہ، میوزیم، سندھیا محل، موتی محل، یا سورمند، جین مورتیاں، رانی لکشمی بائی کی سمادھی، پھول باغ گرودوارا، موتی مسجد، کیتھولک چرچ، تھیوفیسیکل لاج، گردوارہ داتا بندی چھوڑ، درگاہ حضرت خواجہ خانونؒ، درگاہ حضر بابا کپور، تیلی کا مندر، ماتا مندر، سورج کنڈ، اربائی گھٹی، کٹوراتال، سناتن دھرم مندر، شری کرشن مندر، جیاجی چوک باڑا، سندھیا راج گھرانے کی چھتریاں، دیوکھو، تگھرا باندھ، پوایا پدماوتی، پیتامبرا پیٹھ دتیا، رتن مٹھ، چندیری کے مندر، سلطانوں کے مقبرے، شاہی مسجد، موتی

مسجد، ہوا محل، دتیا کا ست گھنڈا محل، اور چھا کا جہانگیر محل، رام راجا کا مندر، لکشمن مندر، سونا گیر کے جین مندر وغیرہ اہم ہیں اور سیاحوں میں کافی مقبول ہیں۔

گوالیار کے چند نامور سنگ تراش: یہاں کے سنگ تراشوں میں دیدار ومستری (جنھوں نے جے ولاس پیلیس) بنایا۔ سلار و مستری (جنھوں نے موتی محل بنایا)۔ شمبھو مستری (جنھوں نے وکٹوریہ کالج بنایا جو آج لکشمی بائی کالج کہلاتا ہے)۔ غفور مستری (جنھوں نے جل وہار بنایا)۔ اللہ الدین مستری جنھوں نے پانچ پتی پتھر کا جھاڑ بنایا وغیرہ۔

اردو بولنے والی عوام کی آبادی اور تناسب: گوالیار شہر کی آبادی تقریباً پندرہ لاکھ ہے جس میں مسلم آبادی لگ بھگ 2.5 لاکھ کے قریب ہے۔ ویسے تو یہ آبادی الگ الگ علاقوں میں بکھری ہوئی ہے لیکن کچھ علاقے جیسے اواڑ پورا، اندرا نگر، آپا گنج، حیدر گنج، نور گنج، شنکر پور، سگورا، جلال خاں کی گوٹھ، گھاس منڈی گوالیار، غوث پورا وغیرہ ایسے علاقے ہیں جہاں یہ آبادی اکثریت میں رہتی ہے۔ مسلمانوں کی مالی حالت بے حد خراب ہے اور یہ نہ اردو جانتے ہیں اور نہ ہی عربی و ہندی، اور انگریزی سے بھی نابلد ہیں۔ اردو آبادی کی حالت نہایت دگرگوں ہے اور اس سلسلے میں سرکار کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اقلیتوں کے علاوہ اکثریتی طبقے کو بھی اردو کی جانب راغب کرنے کی ضرورت ہے۔

اردو کی معروف ہستیاں اور ان کے کارنامے: گوالیار شہر ہندوستانی زبانوں کا گہوارہ رہا ہے۔ سندھیا ریاست کے زمانے میں اردو زبان وادب کا بول بالا رہا ہے جس کے تئیں کئی عظیم شخصیتوں نے اپنا تعاون دیا ہے۔ مثال کے طور پر جاں نثار اختر، فیاض گوالیاری، ظہیر قریشی، اختر نظمی، وقار احمد قریشی، محمد کریم شوق و شکیل گوالیاری بھی شامل ہیں جن کی بدولت اس علاقے میں اردو زبان و ادب کا ماحول قائم ہے۔ ندا فاضلی گوالیار کے ایک ایسے شاعر ہیں جنھیں اردو ادب کی خدمات کے لیے حکومتِ ہند نے و دیگر تنظیموں نے بڑے بڑے انعامات سے نوازا ہے۔

اردو کی موجودہ صورت حال: اردو زبان صدیوں سے تہذیب اور ادب کی مثال رہی ہے جو آج بھی قائم ہے۔ اس کا تلفظ اور نزاکت، اس کی شیرینی اور لطافت اس زبان کو دیگر زبانوں پر بالادستی دیتی ہے۔ زبان چاہے کوئی بھی ہو اس کو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والا ہی زبان کو اور اس کی پہچان کو زندہ رکھ سکتا ہے۔ البتہ آگے جا کر یہ زبانیں دھیرے دھیرے ختم ہو کر میوزیموں کو رونق افروز کرتی ہیں۔ اردو زبان کا بھی یہی حال ہے۔ گوالیار شہر بھی اس سے قطعی الگ نہیں ہے۔ اردو زبان کو سکھانے اور پڑھانے والے استادوں نے ہی اردو کو غائب کر رکھا ہے۔ اردو کسی ایک مذہب وملت کی زبان نہیں ہے بلکہ عام آدمی کی زبان ہے جس پر سبھی کا حق ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو زبان سے محبت کرنے والے اور اردو داں عوام میں اس زبان کی فلاح اور بہبود کے لیے ایک جذبہ اور جنون پیدا کیا جائے تاکہ اس زبان کو سیکھنے کے لیے عام آدمی سامنے آئے اور لطف اندوز ہو سکے۔

(1) اردو کے فروغ میں قومی کونسل کے مراکز کا رول: قومی کونسل کے مراکز اردو زبان کو ملک میں فروغ دینے کے نیٹ ورک کا ایک حصہ ہیں۔ ان مراکز کا عوام سے سیدھا سیدھا رابطہ قائم رہتا ہے۔ جہاں تک ملک میں اردو کے فروغ کے لیے قومی کونسل کے مراکز کے رول کا تعلق ہے تو اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ مراکز اپنی ذمے داریاں بخوبی نبھانے کے لیے کوشاں ہیں اور ان کو اپنے مقصد میں کامیابی بھی حاصل ہو رہی ہے۔ ضرورت ان مراکز کی کارکردگی پر نظر رکھنے کی ہے تاکہ نوڈل ایجنسی (کونسل) سرکاری اسکیموں کو صحیح طریقے سے سرانجام دے سکے۔

(2) کامیابیاں: کونسل کا مرکز گوالیار میں قائم ہونے سے قبل شہر میں اردو زبان لکھنا، پڑھنا اور بولنا محض مسجدوں مدرسوں اور گھر گھر جا کر ٹیوشن کرنے والے استادوں تک ہی محدود تھا۔ ان مدرسوں میں جہاں اردو پڑھائی جاتی تھی وہ بھی تین یا چار جماعت تک ہوتے تھے۔ وہ بھی نان گرامیٹکل۔ پڑھانے والے استاد بھی کوئی بڑے اردو داں نہیں ہوتے تھے۔ ایک یا دو سرکاری اسکولوں میں ہی اردو چلتی تھی۔ اردو زبان کے طلبا کی کمی کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ ایک تو پورے ملک میں زیادہ تر ہندی زبان بولنے، لکھنے، پڑھنے کا ماحول ہونا۔ دوسرے یہ کہ سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی لکھا پڑھی بھی ہندی زبان میں ہونے سے طلبا پڑھنے لکھنے کے بعد سرکاری نوکری حاصل کرنے کے لیے اردو زبان کی جگہ ہندی و انگریزی زبان کو ترجیح دینے لگے۔ اس طرح اردو زبان کے لکھنے، پڑھنے و بولنے والوں کا دائرہ کم ہونے لگا اور آج اردو زبان کو اپنے

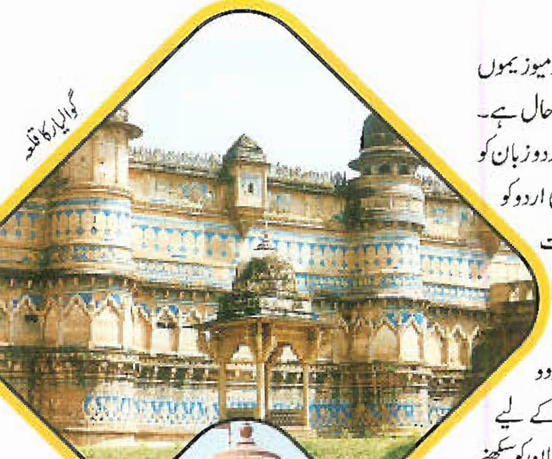
گوالیار کا قلعہ

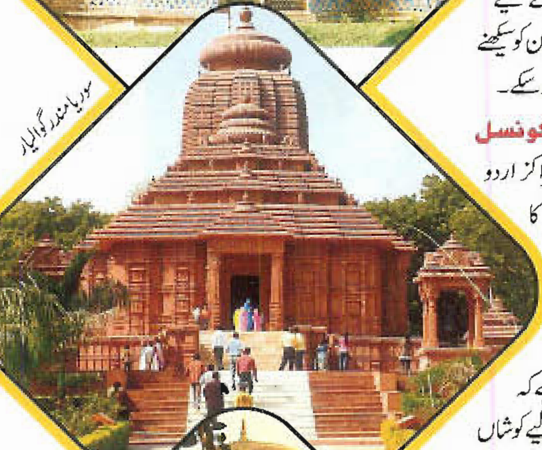
سوریا مندر گوالیار

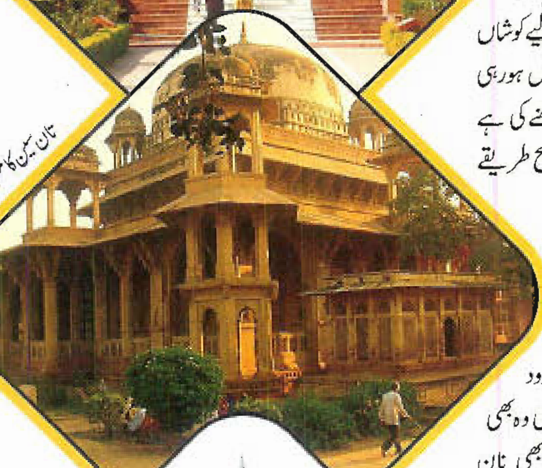
تان سین کا

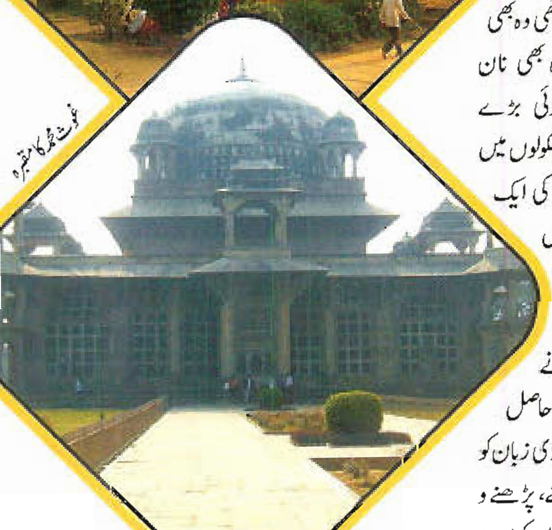
غوث محمد کا مقبرہ

وجود کو قائم رکھنے کے لیے جد و جہد کرنا پڑ رہی ہے۔

آج سے آٹھ یا نو سال پہلے گوالیار میں قومی کونسل کے مرکز کی ابتدا مال روڈ مرار آدرش سماج سیوا شکشا سمیتی کے تعاون سے ہوئی۔ اس وقت قریب بیس، پچیس بچوں نے داخلہ لیا۔ خدا کے فضل سے اور یہاں کے استادوں کی محنت اور ادارے کے نگراں کی محنت اور لگن کی بدولت آج طلبا کی تعداد لگ بھگ دو سو سے زیادہ ہے۔ آج کے دور کو دیکھتے ہوئے مرکز میں بچوں کو کمپیوٹر ٹریننگ، اردو، عربی ٹائپنگ، شارٹ ہینڈ ٹریننگ، ہندی انگریزی زبان کا اردو زبان اور اردو زبان کا ہندی اور انگریزی میں ترجمہ کرنے کی ٹریننگ دی جاری ہے۔ مرکز میں اردو زبان میں سیمینار، سمپوزیم و ورک شاپ کا اہتمام کر کے ان کی اردو تعلیم میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ این سی پی یو ایل کے اس مرکز کے پہل کی تعریف گوالیار شہر کی جانی مانی ہستیوں نے ہی نہیں کی بلکہ مقامی اخباروں نے بھی اس مرکز کی ستائش کی اور اس سے متعلق خبروں کو اخبارات میں جگہ دی۔ اس طرح این سی پی یو ایل کے مراکز اردو زبان کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ قومی اتحاد کو مضبوط کرنے کے لیے بھی ٹھوس کام کر رہے ہیں۔ کونسل کی ماہانہ میگزین 'اردو دنیا' بھی اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ کر رہی ہے۔

(3) کونسل کے مرکز کی کامیابیوں سے حوصلے تو بلند ہوئے ہیں لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ فروغِ اردو کو ایک عوامی موومنٹ 'اردو سیکھو اور سکھاؤ' کے ذریعے ملک کے ہر چھوٹے بڑے گاؤں اور شہروں میں پھیلا دیا جائے تاکہ یہ زبان ایک عوامی زبان کا جامہ پہن سکے۔

(4) **مسائل:** جب بھی کوئی تنظیم فیلڈ میں کوئی کام کرتی ہے تو اس کو مسائل کا سامنا تو درپیش ہوتا ہی ہے۔ یہ مسائل حقیقی ہوتے ہیں اور انھیں سلجھانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ مراکز کے حقیقی مسائل یہ ہوتے ہیں:

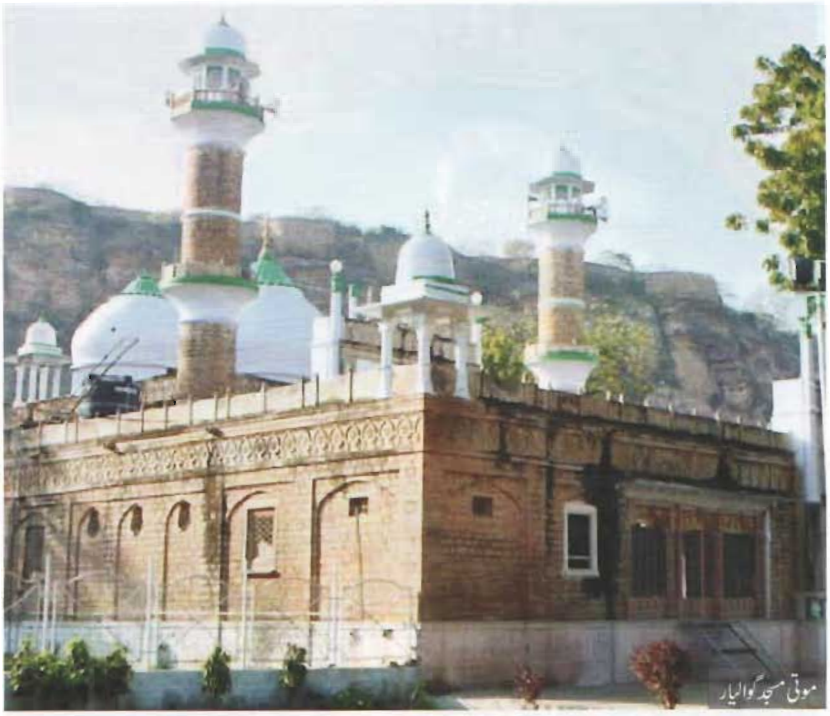
موتی مسجد گوالیار

(1) کونسل اپنا جو پروگرام اخباروں میں شائع کرواتی ہے وہ زیادہ تر نیشنل اور ریاستی سطح کے اخباروں میں ہوتا ہے جن میں مراکز کا کوئی بھی حوالہ نہیں دیا جاتا ہے۔

(2) پروگرام ضلعی سطح کے اخباروں میں بھی شائع کیا جائے اور وہاں کے سینٹر کے ذریعے فارم منگائے جائیں جس سے مرکز کی اہمیت برقرار رہ سکے۔

(3) اردو سیکھنے والے طلبا کو روزگار دینے کے لیے vocational training schemes شروع کی جائیں تاکہ اردو زبان کو فروغ ملنے کے ساتھ ساتھ طلبا کو روزگار بھی فراہم ہو سکے۔

(4) اردو طلبا کو جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کر کے ان کو ملک میں یا بیرونی ملکوں میں روزگار حاصل کرنے کے مواقع فراہم کروائے جانے کی کوششیں کی جائیں۔

(7) لائبریری، انفراسٹرکچر، بلڈنگ وغیرہ کے خرچ سے متعلق معاملات پر توجہ دی جائے۔

امکانات: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے جو کوششیں کر رہی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ خدا سے یہی دعا ہے کہ کونسل اپنے مقصد میں دن دونی رات چوگنی ترقی کی طرف یونہی گامزن رہے۔ آمین!

□

Dr. C. M Khan(Director) Adarsh Samaj Sewa Shiksha Samittee Mall Road Moraj Gwalior (M.P)

کوکب قدر سجاد علی میرزا

نواب واجد علی شاہ
عروج و زوال

13 فروری 1847 قریب نو بجے رات کو واجد علی شاہ کی تخت نشینی عمل میں آئی۔ واجد علی شاہ کا ابتدائی دور حکومت ان کی بیدار مغزی کے ثبوت اور ساتھ ہی ان کے مخالفوں کو ہوشیار کرنے کے لیے کافی اہمیت رکھتا ہے:

''ابتدائے زمانہ سلطنت میں جس وقت ملاحظہ کاغذات ملکی و مالی فرماتے تھے بمقتضائے ذکاوت خلقی ایسی ایسی باریکیاں نکالتے تھے کہ بڑے بڑے دانشوروں کے ہوش جاتے تھے۔'' (آفتاب اودھ (قلمی) ص 44-143)

داد و دہش میں بھی کسی سے کم نہ تھے:

''اس روز (درگاہ جاتے ہوئے) ایک لاکھ دس ہزار روپے پھینکے تھے۔'' (تاریخ اقتداریہ (قلمی) جلد 2 ص 228)

عدل و انصاف کے ضمن میں علاوہ 'مشغلۂ سلطانی عدلِ نوشیروانی' کے جس کی مختلف عنوان سے تعریف کی گئی ہے۔ مستغیث اگر سرِ راہ انصاف طلب کرتا تو اسی وقت متوجہ ہوتے اور مطلق کسی کا لحاظ نہ کرتے۔ رعایا بادشاہ سے ایسی ہی پرورش کی خواستگار ہوتی ہے۔ بادشاہ کی دادرسی نے خاص و عام ہر شخص کو گرویدہ بنالیا تھا اور باوجودیکہ بادشاہ کی مقبولیت اس کے بعد بھی باقی رہی کیونکہ بذات خود وہ جب بھی رعایا کی طرف متوجہ ہوئے اپنی پہلی روش کو برقرار رکھا۔ ان کے انتظامِ سلطنت اور نیک نامی کو ایسے لوگوں کی کارگزاری سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا جو بظاہر دوستی کا دم بھرتے تھے۔ ان میں سے پہلا گروہ اربابِ سیاست کا ہے اور بادشاہ کا سلطنت کے کاموں سے قطع تعلق کرلینا اسی گروہ کی کارگزاری کا ردعمل ہے، دوسرا گروہ اربابِ نشاط کا ہے جو ولی عہدی کے زمانے سے اسی دن کا منتظر تھا اور اب خطابات، منصب اور اختیارات سے سرفراز ہوکر من مانی کارروائیوں میں مصروف تھا۔ اول الذکر گروہ مخلص ہوتو ہو، بادشاہ کے مزاج سے مطلق آشنا نہ تھا۔ آخر الذکر گروہ ضرورت سے زیادہ مزاج داں تھا لیکن اپنے علم کا کوئی صالح ثبوت نہ دے سکے۔

5 اگست 1947 کو نواب امین الدولہ کی جگہ نواب علی نقی خاں کا تقرر بہ حیثیت وزیر بہت کچھ انھیں اربابِ اختیار کی باہمی سازشوں کی بدولت ہوا جن کے سرغنہ ارباب نشاط میں قطب علی خاں رامپوری اور امرائے سلطنت میں مہاراجہ بال کرشن تھے، نواب علی نقی خاں کو کاروبارِ سلطنت کا مطلق سلیقہ نہ تھا۔ ان کے تقرر کے ساتھ ہی ملک میں بدنظمی اور بادشاہ اور ریذیڈنٹ کے درمیان تعلقات کشیدہ ہونے کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے آخر کار سلطنت ہی کا خاتمہ کردیا۔ انتظامِ مملکت سے ناآشنا نواب کی تمام تر توجہ انھیں تین باتوں پر مرکوز تھی کہ بادشاہ کو جنھوں نے محض قول کی پابندی میں کسی کے کہے کی ایک نہ سنی کیوں کر خوش رکھا جائے، رزیڈنٹ جس نے ان کے تقرر کے خلاف آواز بلند کی کیوں کر مطمئن رہے اور اربابِ نشاط جن کی سفارش سے یہ عہدہ ملا کس طرح اپنی من مانی کارروائیوں میں مگن رہیں۔ علی نقی خاں کو اپنے منصوبوں میں سے کسی ایک میں بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی لیکن جہاں تک عہدے پر قابض رہنے کا تعلق ہے وہ اس عہدے پر اس وقت تک قابض رہے جب تک کہ سلطنت واجد علی شاہ کے اختیار میں رہی۔

واجد علی شاہ برسرِ حکومت ہوتے ہوئے بھی براہِ راست سلطنت کے کاموں سے شروع عہدِ حکومت میں ہی دست بردار ہوگئے تھے۔ اس کا سبب بظاہر مختلف طرح کے امراض تھے جن کے پیشِ نظر حکیموں نے مشورہ دیا تھا کہ وہ سلطنت کے کاموں میں دماغ سوزی نہ کیا کریں۔ مزاج آشنا حکیموں کی نگاہوں سے اصل مرض اور اس کا سبب پوشیدہ نہ ہوگا کیوں کہ شروع عہدِ حکومت میں ہی بادشاہ نے کئی ایسی باتوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی جو ان کے منصب کے شایانِ شان تھی، عوام کو پسند تھیں لیکن ''خواص'' کو شاق گزرتی تھیں۔ شاہی فوجوں کی تنظیم ان

باتوں میں نمائندہ حیثیت رکھتی ہے۔ سلطنت کے استحکام کے لیے فوج کا جدید اسلحہ اور قواعد سے آراستہ ہونا ضروری تھا۔ بادشاہ نے فوج کی ازسرنو تنظیم کا کام اپنے ذمے لیا اور ولی عہدی کے زمانے میں جو تجربہ کر چکے تھے اسے اب بڑے پیمانے پر پھیلایا۔ گورنر جنرل کی اطلاع کے مطابق فوج میں چار سو توپیں، پانچ ہزار توپچی، چار ہزار سوار اور چوالیس ہزار پیادے تھے۔ خود بادشاہ نے پلٹنوں کے نام اختری اور نادری اور پیادوں اور سواروں کی تعداد تین ہزار بتائی ہے۔ انگریزی زبان میں قواعد ان کے مزاج کے خلاف تھی

قواعد سکھاتا تھا خود فارسی
زبان دگر میں تو تھی عار سی

قواعد کی اصطلاحیں فارسی زبان میں وضع کی گئی تھیں اور وقت کی پابندی سے روزانہ کئی کئی گھنٹے اسی شغل میں بسر ہوتے تھے۔ رزیڈنٹ کو یہ حرکت ناپسند تھی، بادشاہ کو علم ہوا تو ''بالکل اس طرف سے کنارہ کیا۔''

سالِ جلوس کے اختتام کے ساتھ افواجِ واجدی کی تنظیم سے کنارہ کشی متوجہ کرنے کے لیے کافی خیال کی جاسکتی ہے کہ واجد علی شاہ نے سلطانِ عالم بننے کی فکر کیوں ترک کی اور جانِ عالم بننے کا خیال کیوں کر پیدا ہوا۔ بادشاہ اگر ترک سوارنیوں کا دستہ ترتیب دیں تو کوئی اعتراض نہ تھا لیکن اگر وہی عمل اختری اور نادری فوجوں پر ہوتو رزیڈنٹ سے لے کر گورنر جنرل تک سمجھانے کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے۔ رزیڈنٹ کرنل رچمنڈ کی رخصت تک (25 نومبر 1848) یہ مداخلت زود رنج حکمراں کو دل برداشتہ کرنے کے لیے کافی تھی کرنل سلیمن کے آتے ہی معمولی معمولی باتوں میں تحقیر و تذلیل کے موقعے تلاش کیے جانے لگے۔ یہ زمانہ بادشاہ کی شدید علالت کا زمانہ تھا۔ بادشاہ کا ارادہ تھا کہ ولی عہد کو اپنا جانشین کر دیں لیکن یہ لوگوں کو منظور نہ ہوا۔ ناچار مدارالدولہ نواب علی نقی خاں اپنے چچیا خسر اور وزیر کو مختار بنایا اور ایک کتاب دستورِ واجدی ان کو ہدایت کے لیے ان کے سپرد کرتے ہوئے خود رقص و سرود اور تصنیف و تالیف میں اپنا وقت صرف کرنے لگے۔ واجد علی شاہ کی براہِ راس حکومت کا دور اسی بیماری کے ساتھ 1849 میں ختم ہو جاتا ہے۔

جولائی 1849 رمضان 126 ہجری میں قطب علی خاں اور ان کے ساتھیوں کو ان کی نازیبا حرکتوں کے سبب شہر بدر کر دیا گیا۔ مصاحبین خاص کی جدائی بادشاہ کو بہت شاق تھی:

''کھسیانے سے رہے۔ اب نواب (علی نقی خاں) حضرت کی ہوشیاری سے چونکے اور ان کی بے شغلی کے لحاظ سے مشغلۂ نگہداریِ امورِ مملکت کی توجہ سے ڈرے۔ اس میں ہر چند خاطر اقدس کو بہت بہلایا، طرح طرح کے چرچوں میں لگایا۔ خصوصا نواب خاص محل طرازِ بے بدل نے ڈور پتنگ شعر و شاعری کے ڈورے ڈالے۔ رنگ رنگ کے گل کھلائے۔'' (مرقع خسروی (قلمی) ورق، 190 الف)

رشک نے اسی زمانے میں پانچ شاعروں کے خلعت پانے کی تاریخ کہی ہے، نام نہیں بتائے ہیں۔ رزیڈنسی کے اخبار نویس نے فتح الدولہ برق، مقبول الدولہ قبول، آفتاب الدولہ قلق، مہرالدولہ میرزکی، اور تدبیر الدولہ اسیر کا ذکر کیا ہے۔ بظاہر گویوں بجویوں کا اخراج اور شاعروں کا عروج ایک خوشگوار تبدیلی کی علامت تھی۔ شعر و شاعری کے علاوہ بادشاہ نے اسی زمانے میں اپنی تینوں داستانی مثنویوں کو ڈرامائی صورت میں پیش کیا، اپنے کئی بچوں کی شادی رچائی اور علی نقی خاں کی صاحبزادی سے نکاح بھی اسی زمانے کی بات ہے۔ عوام شاید ان باتوں سے خوش نہ تھے:

''واقعی نواب علی نقی خاں وزارت کے نام سے بادشاہی کرتے تھے۔ کسی وزیر نے یہ رتبے اور درجے اور اختیار نہ پائے مگر بڑے صاحب (رزیڈنٹ سلیمن) کے دل میں یہ سب باغ و بہار تھے۔'' (مرقع خسروی (قلمی) ورق 199 ب)

بڑے صاحب، بادشاہ اور وزیر کے باہمی ارتباط، جلسوں اور مشاعروں سے محظوظ ہونے نہیں آئے تھے۔ علی نقی خاں کیا کوئی بھی وزیر ان کو اپنے مقصد کی تکمیل سے روک نہ سکتا۔ ہاں کسی دور اندیش وزیر کی موجودگی میں یہ ممکن تھا کہ الزامات کی فہرست اتنی طویل نہ ہوتی جو نواب علی نقی خاں کے وزارت حاصل کرنے اور برقرار رکھنے میں خواہ مخواہ مرتب ہوئی۔

معزولی 5 دسمبر 1854 کو اودھ کے نئے رزیڈنٹ کرنل اوٹرم نے اپنے عہدے کا چارج لیا۔ ان کو ''خصوصیت'' سے کرنل سلیمن کی پیش کردہ رپورٹوں کی تنقیح کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اوٹرم نے اپنے طور پر تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ انتظامِ مملکت میں امید افزا اصلاحیں ہوئی ہیں مرکزی حکومت کو شاید ایسی رپورٹوں کی ضرورت نہ تھی۔ اوٹرم نے انھیں کاغذات کا سہارا لیا جو کرنل سلیمن چھوڑ گئے تھے اور تین مہینے کے اندر اپنی رپورٹ روانہ کر دی۔ اوٹرم کی رپورٹ میں صرف الفاظ اوٹرم کے ہیں مواد سلیمن کا مہیا کیا ہوا ہے۔ اس رپورٹ اور لارڈ ڈلہوزی کے منشا کے مطابق 21 نومبر 1855 کو الحاق کی اجازت دے دی گئی اور ایک عہد نامہ مرتب کا گیا جس میں بادشاہ کو یقین دلایا گیا کہ اگر وہ ان شرائط کو قبول کر لیں گے تو ان کا لقب اور شاہی عمارتوں پر ان کا اختیار بدستور باقی رہے گا، ان کے اخراجات کے لیے بارہ لاکھ روپے سالانہ ذاتِ خاص اور تین لاکھ سالانہ عملے کے خرچ کے لیے دیا جائے گا اور یہی سلوک ان کی نسل میں ان کے جانشینوں کے ساتھ بھی ہوگا۔ بادشاہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے رزیڈنٹ کو اختیار تھا کہ حسب مطالبہ اس رقم میں اضافہ کرے اور ضروری سمجھے تو بادشاہ کی والدہ اور وزیر کے بھی گراں قدر وظیفے مقرر کرے۔

4 فروری 1856 کو رزیڈنٹ کی بادشاہ سے ملاقات ہوئی۔ وزیر، بھائی، والدہ، اور چند دوسرے امرائے سلطنت کی موجودگی میں بادشاہ نے عہدنامہ صاحب الدولہ بہادر کے سپرد کیا کہ پڑھ کر سنائیں لیکن امنڈے ہوئے جذبات کے سبب وہ چند لفظوں سے زیادہ نہ پڑھ سکے۔ بادشاہ نے عہدنامہ ان کے ہاتھ سے لے لیا اور خود لفظ بلفظ پڑھا۔ 'عہدنامہ برابر والوں میں ہوتا ہے، میں جب بادشاہ نہیں تو پھر مجھے اختیار ہی کب ہے کہ برٹش گورنمنٹ سے معاہدہ کروں؟ میں انگلستان جاؤں گا اور تاج برطانیہ سے درخواست کروں گا کہ اس فیصلے پر نظر ثانی کی جائے۔'' بادشاہ نے کہا اور رزیڈنٹ کی فہمائش اور وزیر کی پرزور تائید کے باوجود دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ رعایا کو خاموش رہنے اور فوج کو ہتھیار رکھ دینے کے حکم پہلے ہی دیے جا چکے تھے۔ اتمام حجت کے لیے بادشاہ نے اپنی دستار رزیڈنٹ کے ہاتھ میں رکھ دی اور دل سوز پیرائے میں یاد دلایا کہ اسی برٹش حکومت نے ان کے دادا کو تخت نشین کیا تھا اور اگر اس کی یہی مرضی تھی کہ وہ کچھ نہ رہیں تو اب وہ جاہ و منصب ہر عزت سے سبکدوش تھے اور ان سے کسی معاہدے پر دستخط کے لیے اصرار کرنا بے سود تھا۔

کلکتے کا سفر

13 مارچ 1856 آٹھ بجے رات کو بادشاہ لندن کے ارادے سے کلکتے روانہ ہوئے۔ بادشاہ کے امتناعی حکم کے باوجود کہ جب وہ روانہ ہوں تو کوئی ان کے ساتھ نہ جائے تقریباً ایک ہزار افراد جن میں چند موروثی نمک خوار، بیگمات اور دوسرے متوسل شریک تھے کانپور تک بادشاہ کے ساتھ گئے، کچھ کو رزیڈنٹ نے جانے نہ دیا، کچھ کانپور تک جا کے واپس چلے آئے۔ بادشاہ نے بنارس

تک بگھی اور بنارس سے کلکتے تک اسٹیمر پر سفر کیا اور پورے دو مہینے کے بعد 13 مئی 1856 کی دوپہر کو کلکتے پہنچے۔ موچی کھولے میں مہاراجہ بردوان کی کوٹھی پانچ سو روپے ماہوار کرائے پر حاصل کی جا چکی تھی۔ بادشاہ نے وہیں قیام کا۔ بظاہر یہ قیام عارضی تھا لیکن حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ اکتیس برس بعد جلاوطن حکمراں کا جنازہ اسی کوٹھی سے اپنی آخری منزل کو پہنچایا گیا۔

سفر کی کلفت، بنگال کی مرطوب آب و ہوا کی ناموافقت اور اخراجات اور صدمات کی زیادتی کے سبب بادشاہ کلکتے پہنچتے ہی بیمار پڑ گئے۔ وفد کا انگلستان جانا ضروری تھا۔ بادشاہ نے اپنی ماں، بھائی اور ولی عہد کو گراں بہا تحائف کے ساتھ 18 جون 1856 کو الوداع کہا اور خود وہیں سے جواب بلو بک جیسی کتابیں لکھ کے اور لکھوا کے مقدمے کی پیروی کرتے رہے۔ لکھنؤ سے آنے والوں کا سلسلہ جاری تھا۔ اخراجات کی کوئی حد نہ تھی اپنی گوناگوں پریشانیوں کے باوجود بادشاہ کی خواہش تھی کہ ان کے ساتھی مصیبت میں بھی ان کے ساتھ رہیں۔

گزارے کے لیے جو ممکن تھا سب کو دیا گیا لیکن چند افراد ساتھ چھوڑ کے الگ ہو گئے۔ اسیر کا لکھنؤ میں رہ جانا اور قلق کا کلکتے آ کر واپس چلا جانا بادشاہ کو خصوصیت سے ناگوار گزرا لیکن نہ اب بادشاہ سے ممکن تھا کہ لوگوں کی پہلی جیسی نازبرداریاں کریں اور نہ لوگوں کو خیال تھا کہ جو کہتے تھے اب کر دکھائیں۔ ربیع الاوّل 1273 ہجری (نومبر 1856) میں نواب علی نقی خاں سے ستر لاکھ قرض مانگے۔ انھوں نے نہ دیے اور نہ ہی بندوبست کا وعدہ کیا۔ بادشاہ کو ان باتوں کا بے حد ملال تھا اور بیمار تھے کہ ایک دوسری ناگہانی میں گرفتار ہوئے۔

نظر بندی

10 مئی 1857 کو میرٹھ سے جنگ آزادی کی ابتدا ہوئی۔ 21 اور 27 مئی کو کلکتے کے ایک وکیل امیر علی خاں نے حکومت کو اطلاع بہم پہنچائی کہ بادشاہ درپردہ مفسدوں سے ساز باز رکھتے ہیں۔ حکومت کے شبہات کو مزید تقویت موچی کھولے میں سپاہیوں کے آنے جانے سے حاصل ہوئی اور حکومت نے فیصلہ کر لیا کہ بادشاہ کو نظر بند کر دیا جائے۔ اسی زمانے میں بادشاہ اپنی طویل علالت سے صحت یاب ہوئے تھے اور 14 جون 1857 کی رات کو محل میں بادشاہ کے غسلِ صحت کا جشن تھا۔ 15 جون 1857 (22 شوال 1273 ہجری) کو صبح کی اذان کے ساتھ دریا کی راہ سے جنگی جہازوں اور خشکی کی طرف سے انگریزی فوجوں نے موچی کھولے کو گھیر لیا۔ ساتھ لے جانے کا مطالبہ صرف بادشاہ سے تھا لیکن بادشاہ کی رفاقت میں عزیز خدمت گار، عورت مرد کل چوبیس افراد بادشاہ کے ساتھ گئے۔ ساتھ دینے والوں کے بادشاہ خصوصیت سے شکر گزار تھے لیکن ان ساتھ جانے والوں میں سے آدھے لوگ بھی نظر بندی کے چھبیس مہینے فورٹ ولیم (کلکتہ) میں بسر نہ کر سکے۔ خود بادشاہ کے الفاظ میں:

جب سلیمانِ جہاں بے جرم زنداں میں رہا
کالی پریاں اڑ گئیں گوروں کا بستر رہ گیا
جج کا دھیان آیا کسی کو کوئی دیوانہ بانا
ساتھ والے چھٹ گئے زنداں میں اختر رہ گیا

فتح الدولہ برق ضعیفی اور ممانعت کے باوجود فورٹ ولیم میں بھی

بادشاہ کے ساتھ تھے اور 28 صفر 1274 ہجری (18 اکتوبر 1857) کو وہیں فورٹ ولیم میں قید زندگی سے آزاد ہوئے۔ بادشاہ اپنے اس شعر کو اپنے استاد کا آخری عطیہ بتایا:

برق جو کرنا تھا آخر وہی کر کر اٹھے
جان دی آپ کے دروازے پر مر کر اٹھے

نظر بندی کی ابتدائی وحشت سے قطع نظر بادشاہ کے یہ اوقات لکھنے پڑھنے کے دلچسپ مشغلے میں گزرے اور اس بہانے خطوں اور غزلوں کا جو ذخیرہ چند مہینوں میں جمع ہو گیا اس سے قبل اور اس کے بعد چند برسوں میں بھی نہ ہوا۔ خود بادشاہ کے مرتب کیے ہوئے خطوں کے مجموعے دیکھیے تو بادشاہ کو شروع میں سوائے اپنی بدنصیبی کے بیان کے بہت کم کسی بات کا خیال تھا۔ نظر بندی کے آخری زمانے میں انھیں اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ اپنی بیگمات کو اطمینان سے خط لکھتے۔ یہ کام ذوالفقار الدولہ کے سپرد کر دیا۔ 7 ذی الحجہ 1275ھ (مطابق 9 جولائی 1859) کو جب قلعہ سے رخصت ہوئے تو یہی ذوالفقار الدولہ نامہ نویسی کے فرائض انجام دے رہے تھے اور خود بادشاہ اپنا کلام جمع کرنے میں مصروف تھے۔

جلاوطنی

کلکتے پہنچتے ہی بادشاہ فیصلہ کر چکے تھے:

''بے سلطنت لیے ارادہ میرا لکھنؤ میں آنے کا نہیں ہے، ہاں اگر سلطنت نصیب ہوئی تو وصل بھی تم لوگوں کا ہوگا اور نہیں تو مجھ کو رکاوٹ سے کیا حاصل ہے، میں آپ کسی کے گھر بیٹھ جاؤں گا۔'' (ادب کا مقصد ص186، بحوالہ تاریخ مذہب۔)

1857 کے ہنگامے کے سبب ہندوستانی بالخصوص اودھ کے باشندے، کسی بھی ہمدردی کے مستحق نہ تھے۔ اخراجات میں تخفیف کے باوجود مانگنے والے سبھی تھے، دینے والا کوئی نہ تھا۔ ماں اور بھائی کی ناوقت موت سے وہ گرفت بھی ڈھیلی پڑ چکی تھی جو بادشاہ کو انگریزوں کی پیش کش قبول کرنے سے روکے ہوئے تھی۔ ضرورت اور فراست کا تقاضا تھا کہ جو ملتا ہو اسے قبول کر لیا جائے اور بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔

حکومت برطانیہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اب سوائے بارہ لاکھ روپے سالانہ کے ایسی کوئی رعایت نہیں دی جائے گی جس کا فروری 1856 کے عہد نامے میں وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ بارہ لاکھ بھی انکم ٹیکس سے مستثنیٰ نہ تھے اور بادشاہ کی درخواست کے باوجود اس میں کوئی تخفیف نہیں کی گئی۔ بادشاہ کی عطا کی ہوئی جاگیریں اور نوٹ جن خوش نصیبوں کے قبضے میں تھے وہ آج بھی ان پر قابض اور متصرف تھے لیکن خود بادشاہ کی اور کوئی ذاتی آمدنی نہ تھی۔ لکھنؤ میں جو لوگ اب تک آس لگائے بیٹھے تھے کہ بادشاہ واپس آ جائیں گے بادشاہ کے کلکتے میں قیام کر لینے اور اپنی بے روزگاری کے سبب تلاشِ معاش میں کلکتے پہنچنے لگے۔ مروّت اور وضع داری کا تقاضا تھا کہ جو آئے واپس نہ جائے۔ اس پر بادشاہ کے اپنے شوق، سندر بن کو گلزار بنانے کے لیے عمارتیں اور عمارتوں کو برقرار رکھنے کے

لیے کافی روپے کی ضرورت تھی:

''اس غریب الوطنی میں بھی بیس ہزار متوسلین حضرت کے ہم رکاب رہے اور سب کے ساتھ حتی الوسع وہی سلوک وہی برتاؤ برقرار رکھا جو زمانہ سلطنت میں برتا جاتا تھا... دنیا کا وہ کون سا شوق تھا جو سلطان عالم کو نہ ہوا اور خدا کے فضل و کرم سے سب ہی شوق پورے ہوتے تھے۔'' (مخزانہ جاوید، جلد 1، ص 208)

خدا کے فضل و کرم سے قارون کا خزانہ بھی خالی ہو جاتا ہے۔ ایک لاکھ کی پنشن تو کچھ ایسی بڑی رقم بھی نہ تھی:

''جس روز پنشن آتی اسی دن سب کو دے دی جاتی اور کچھ نہ بچتا، روزمرہ کے اخراجات جواہرات فروخت کر کے پورے ہوتے۔'' (جانِ عالم، ص 92-191)

لکھنؤ سے روانہ ہوتے وقت بادشاہ اپنے ساتھ کیا لے گئے تھے اس کا ہمیں کوئی علم نہیں لیکن لکھنؤ میں اب ان کا کچھ نہ تھا۔ عہد شاہی کے جن خفیہ خزانوں کی اب تک تلاش ہو رہی ہے وہ اگر ہوتے تو بادشاہ کو کیا ضرورت تھی بلکہ قرض کی فکر میں پریشان رہتے۔ 1957 کے بعد انگریز حاکموں نے 'تخمیناً پچیس لاکھ' کے جواہرات بادشاہ کو بھیج دیے تھے۔ یہ رقم ایک دو سال سے زیادہ کے لیے کافی نہ ہوئی ہوگی، خصوصاً جب ہم دیکھتے ہیں کہ بیگمات کو عید بقرعید جڑاؤ زیورات اسی طرح تقسیم ہوتے رہے جیسے کہ عہد شاہی میں ہوتے تھے۔

واجد علی شاہ نے اور ان کے اسلاف نے کمپنی کو کروڑوں روپے قرض دیے اور وظیفے وثیقے اس رقم کے سود سے ملتے رہے۔ انتزاع سلطنت کے وقت ایک کروڑ اسی لاکھ سے زیادہ روپے کمپنی کے ذمے باقی تھے۔ سلطنت کی ضبطی کے بعد حکومت نے یہ رقم اور نیپال کی ترائی کا وہ علاقہ (کھیری گڑھ) بھی ضبط کر لیا جو بادشاہ کی ذاتی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ بڑھتے ہوئے اخراجات کے سبب بادشاہ نے چاہا کہ یہ رقم واپس ملے یا اس کے عوض اور کسی فلاح کی صورت ہو۔ برٹش پارلیمنٹ میں یہ مقدمہ بھی پیش ہوا لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ پریشانیوں پر ایک پریشانی یوں بڑھی کہ جن لوگوں کو معتمد سمجھتے ہوئے اپنا مختار بنایا تھا بادشاہ کو ایک کروڑ روپے کا مقروض بتاتے ہوئے انھیں لوگوں نے مقدمہ دائر کر دیے۔ مقدموں کی پیروی کے لیے مارچ 1867 میں بادشاہ نے انھیں وکیل صاحب کو طلب کیا جو 1857 میں ان کے خلاف مخبری کر چکے تھے۔ وکیل صاحب کی حساب فہمی سے صرف سات لاکھ کا قرض واجب الادا نکلا اور ان کی کارگزاری سے خوش ہو کر 1275 ہجری (1868) میں بادشاہ نے انھیں ''وزیر السلطان محمد امیر علی خان بہادر'' خطاب عنایت کیا۔ وزیر السلطان اپنی آخری عمر تک بادشاہ کے مختار اور معتمد رہے اور بادشاہ کے حالات میں وزیر نامہ انھیں کی تالیف ہے۔

مالی اور چند دوسری خانگی الجھنوں کے علاوہ جلاوطنی کے زمانے میں بادشاہ کو ایسی کوئی ذہنی پریشانی نہ تھی جو ان کی تعمیری اور تہذیبی دلچسپیوں میں مخل ہوگی۔ موچی کھولے کی نوآبادی میں مطبع سلطانی تو گویا پہلا سنگ میل تھا جو نصب ہوا۔ صاحبانِ کمال کی آمد اور مجلسوں، محفلوں اور مشاعروں کے انعقاد نے رفتہ رفتہ وہ غم غلط کر دیا جو شروع میں بڑی شدت سے محسوس ہو رہا تھا۔ سلطنت واپس ملنے کی امیدیں اور دعائیں بدستور جاری تھیں لیکن لوگ مع اپنے سرپرست کے اپنے حال پر قانع اور مسرور تھے۔ واجد علی شاہ کی کتابیں جو جلاوطنی کے اس دور سے تعلق رکھتی ہیں ان کی آسودہ راضی برضائے الٰہی زندگی کی اچھی ترجمانی کرتی ہیں۔

وفات

واجد علی شاہ کے انتقال کی تاریخ میں خفیف سا اختلاف ہے۔ ثاقب نے 20 ستمبر 1887 بتایا ہے:

از ستمبر بود آن تاریخ بستم آشکار
نصف شب از چار شنبہ ثالث از ماہ غرا
بہر تاریخ مسیحی بے سر آمد در نظر
فردشان د تاج د تخت د سکہ د چتر ولوا
7 600 25 1000 4 51 200
1887 سنہ عیسوی

مولوی نجم الغنی خاں جن کی تالیف اس موضوع پر معتبر خیال کی جاتی ہے 21 ستمبر 1887 مطابق 3 محرم 1305 'نو گھڑی رات گئے' فرماتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھتے ہیں:

''سرفراز علی خاں نامی ایک شخص کے خط سے جو وہیں موجود تھا ان کا انتقال کرنا 2 محرم کو ثابت ہوتا ہے۔ انتقال سے تیسرے دن اپنے تیار کردہ امام باڑہ سبطین آباد میں پیوند زمین ہوئے۔'' (تاریخ اودھ، جلد 5، ص 282)

تذکرہ نگاروں میں یہ اختلاف دراصل تاریخ بدلنے کے وقت سے بے خبری ظاہر کرنا ہے۔ قمری مہینے کی تاریخ رویت ہلال کے وقت یعنی مغرب کی اذان کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ شمسی مہینے کی تاریخیں بارہ بجے رات سے بدلتی ہیں۔ چند گھنٹوں کے اس فرق سے شمسی اور قمری مہینوں کی تاریخ میں اختلاف ناگزیر ہے کیوں کہ ہر شمسی تاریخ میں دو قمری تاریخیں اور ہر قمری تاریخ میں دو شمسی تاریخیں شامل ہوتی ہیں اور اگر کوئی واقعہ مغرب اور 12 بجے شب کے درمیان پیش آئے تو اختلاف کا قوی امکان ہے۔ فلاں ہجری تاریخ مطابق فلاں عیسوی تاریخ لکھنے کا دستور اسی لیے رائج تھا نہ کہ اس لیے کہ جس طرح تقویم وغیرہ میں ہر شمسی تاریخ کے مقابل ایک قمری تاریخ لکھ دی جاتی ہے اسی طرح کتب تواریخ اور قطعات تاریخ میں بھی لکھ دیا جائے یا اگر کتب تواریخ اور قطعات تاریخ میں صحیح لکھا ہے تو برخود غلط بیانات اور میکانکی طریقے پر مرتب کی ہوئی تقویموں کی مدد سے ان کو ضعیف قرار دیا جائے۔ آج سے سو برس پہلے کے عام ہندوستانی سنہ عیسوی اور تاریخ کے بدلنے کے دستور سے اتنا ہی ناواقف تھے جتنا آج کل ہجری سنہ سے ناواقفیت کا اظہار ملتا ہے۔

ثاقب کے مذکورہ بالا قطعے میں صرف شمسی مہینے کی تاریخ غلط ہے بادشاہ کا انتقال چونکہ دو بجے رات کو ہوا اس لیے شمسی تاریخ 21 ستمبر شمار ہوگی برخلاف اس کے اگر کوئی واقعہ مثلاً واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے عشا کے وقت پیش آئے تو شمسی مہینے کی تاریخ وہی ہوگی جو اسی دن عصر کے وقت تھی لیکن قمری تاریخ مغرب کے وقت سے بدل چکی ہوگی۔ چنانچہ تقویم کی مدد یا قیصر التواریخ کی سند سے واجد علی شاہ کی تخت نشینی کی تاریخ 26 صفر 1263 ہجری مطابق 13 فروری 1847 کو تخت نشین ہوئے جیسا کہ افضل التواریخ میں اور واثق کے اس ملفوظی قطعۂ تاریخ میں درج ہے جسے نجم الغنی خاں نے نقل تو کیا ہے لیکن افضل التواریخ کے اس بیان پر شک کا اظہار بھی فرمایا ہے۔ انتقال کی تاریخ میں بھی مولوی صاحب نے اسی طرح اختلاف کے امکانات کو اور روشن کر دیا لیکن اختلاف کو مٹانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ واجد علی شاہ نے 21 ستمبر 1887 مطابق 3 محرم 1305 ہجری رات دو بجے داعی اجل کو لبیک کہا اور شمسی مہینے کی جس تاریخ انتقال ہوا تھا اسی تاریخ کو رات گیارہ بجے انتقال سے تقریباً اکیس گھنٹے بعد اپنے تیار کردہ امام باڑے امام باڑہ سبطین آباد مبارک، مٹیا برج، کلکتے میں دفن ہوئے:

سالِ تاریخ اس بیانِ واقعی سے ہے عیاں
مٹ گیا لو ہائے کلکتے میں نام لکھنؤ
1305 ہجری

منشی سراج الدین احمد

□

ماخذ: واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات
مصنف: کوکب قدر سجاد علی میرزا، **سنہ اشاعت:** 1995، **ناشر:** ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

ایرو اسپیس انجینئرنگ: ملازمت کے بہتر مواقع

شمیم اختر

جب کوئی جنگی طیارہ زبردست رفتار میں ژوم کی آواز کے ساتھ آپ کے سر کے اوپر سے گزرتا ہوگا تو یہ آواز آپ کو بڑی پیاری لگتی ہوگی لیکن کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ ژوم کی اس آواز اور زبردست رفتار سے پرواز کرنے والے اس طیارے کے پیچھے کن لوگوں کی محنت کارفرما ہے؟ جی ہاں تخلیقی صلاحیتوں سے حامل ان لوگوں کو ایرونوٹیکل یا ایرواسپیس انجینئر (Aeronauticalor Aerospace Engineer) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ایرونوٹیکل انجینئرنگ یا ایرو اسپیس انجینئرنگ، انجینئرنگ شعبے کا اہم ترین حصہ ہے جس میں جنگی طیارہ، جہاز میزائل سٹیلائٹ اور ہر اس چیز کا ڈیزائن بنا کر اسے تیار کیا جاتا ہے اور اس کی آزمائش کی جاتی ہے جو پرواز کرتا ہو۔ انجینئرنگ کے اس شعبے میں نئے مادوں، انجن اور طیارے کے جسم کی شکل اور بناوٹ پر بھی تحقیق کی جاتی ہے۔ ایرونوٹیکل انجینئرنگ کا تعلق صرف سائنس سے نہیں ہے بلکہ یہ تخلیقی صلاحیتوں سے بھی وابستہ ہے جس کی وجہ سے آپ اپنے خیالات کو صرف تصور ہی نہیں کر سکتے ہیں بلکہ اسے پرواز بھی فراہم کر سکتے ہیں۔

ایرو اسپیس انجینئرنگ جسے راکٹ سائنس (Rocket Science) کے نام سے بھی جانا جاتا ہے کے دو وسیع شعبے ہیں انھیں ایرونوٹیکل انجینئرنگ (Aeronautical engeeniring) کہا جاتا ہے۔ ایرونوٹیکل انجینئرنگ میں جہاں مختلف قسم کے طیاروں کا مطالعہ کیا جاتا ہے وہیں ایرونوٹیکل انجینئرنگ میں خلائی گاڑیوں جیسے سٹیلائٹ وغیرہ کے بارے میں جانا جاتا ہے۔

ضروریات (Requirement)

ایرنوٹیکل انجینئرنگ میں اپنا کیریئر بنانے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ریاضی، منطقی، تنظیمی اور تخلیقی صلاحیتوں کے حامل ہوں۔ ذمے واری کے تئیں سنجیدہ ہوں اور بردباری سے کام لینے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں کیوں کہ کسی بھی پروجکٹ میں بہت طرح کے لوگ کام کرتے ہیں لہٰذا انھیں تمام طرح کے لوگوں سے ہر سطح پر مل کر کام کرنا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ جسمانی طور پر بھی مضبوط ہوں کیوں کہ کبھی کبھی کسی پروجیکٹ پر کافی دیر تک کام کرنے کی نوبت آجاتی ہے۔

تعلیمی اہمیت

ایرونوٹیکل یا ایرواسپیس انجینئر بننے کے لیے بیچلر ان انجینئرنگ / بیچلر ان تکنالوجی (BE/B Tech) کی ڈگری حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ 10+2 کے بعد ہی ڈپلوما کورس بھی کیے جاتے ہیں لیکن اچھی ملازمت کے لیے ڈگری کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ انجینئرنگ کے اسی شعبے میں M Tech اور ڈاکٹریٹ بھی کیا جاتا ہے۔ انجینئرنگ کے تمام کالج اور IITs، ڈگری اور پوسٹ گریجویٹ کی تعلیم فراہم کرتے ہیں جب کہ Polytechnics سے ڈپلوما حاصل کیا جاسکتا ہے۔

انجینئرنگ کے اس شعبے میں پہلے پرواز کے اصول وضوابط، ایروڈائی نمکس (Aerodynomics)، طیارے کی بناوٹ، پروپلشن (Propulsion) الکٹرانک، میٹولوجی اور ایرٹریفک کنٹرول جیسے مضامین میں تعلیم دی جاتی ہے اس کے بعد ایروڈائنامکس، پروپلشن، ساخت، نیوی گیشن اینڈ کنٹرول، انسٹرومینیشن اینڈ کمیونکشن جیسے مضامین میں اسپٹلائزیشن (Specialisation) حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ خلائی مصنوعات، تجارتی آمد و رفت، فوجی جنگی طیارہ، ہیلی کاپٹر، خلائی طیارہ، میزائل اور راکٹ کا بھی خصوصی مضمون کے طور پر انتخاب کیا جاسکتا ہے۔

تعلیمی ادارے

ہندوستان کے مختلف شہروں میں بہت سارے ایسے ادارے ہیں جہاں ایرونوٹیکل یا ایرواسپیس انجینئرنگ کی پڑھائی کی جاسکتی ہے۔ اہم اداروں کے نام اس طرح ہیں:

1 IITs in Mumbai, Kharagpur, Chennai & Kanpur & Delhi
2 Madras Institute of Technology Chennai
3 Punjab Engineering College, Chandigarh
4 Hindustan Institute of Engineering & Technology, Chennai
5 Nehru College of Aeronautics & Applied Science, Coimbatore
6 School of Aviation Science and Technology, New Delhi
7 Indian Institute of Aeronautical Engineering (IIAE), Dehradun
8 Institute of Aviation Technology, Babadurgarh, Haryana
9 Hindustan Electronics Academy, Bangalore
10 Indian Institute of Aeronautics, Patna
11 VSM Institute of Aerospace Engineering and Technology, Bangalore
12 Institute of Information Technology & Managements Aeronautical Engineering Training Academy, Pune
13 Mohamed Sathak Engineering College, Kilakarai, Tamil Nadu
14 Park College of Engineering and Technology, Coimbatore, Tamil Nadu
15 Rajasthan Vidyapeeth (Deemed) University, Rajasthan
16 Academy of Aerospace & Aviation Indore Madhya Pradesh
17 National Institute of Aeronautical Engineering, Deharadun
18 Guru Gram Institute of Aeronautical Engineering Nagpur & Technology

داخلہ کے لیے انتخاب

BE/Tech میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے فزکس، کمسٹری اور ریاضیات میں کامیابی کے ساتھ 10+2 یا اس کے مساوی امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس کرنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ IITs کے ذریعے اہتمام کیے جانے والے جوائنٹ انٹرنس اگزام JEE میں

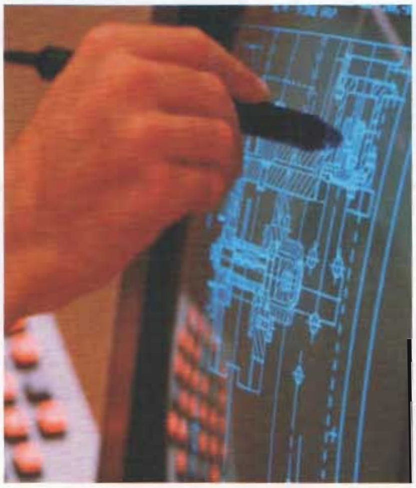

کامیابی حاصل کرنا ضروری ہے۔ JEE میں پاس کرنے والوں کو ہی IITs میں داخلہ مل سکتا ہے۔ دیگر ادارے اپنے طور پر بھی داخلے کے امتحان کو منعقد کرتے ہیں لیکن زیادہ تر ادارے جہاں ایرونوٹیکل انجینئرنگ کی تعلیم فراہم کی جاتی ہے، JEE میں حاصل ہوئے نمبروں کو ہی داخلے کی اہلیت کا گریڈ مانتے ہیں۔ BE/BTech چار سال کا پروگرام ہے جب کہ ڈپلوما کورس کی مدت 2 سے 3 سال تک ہوتی ہے۔

ملازمت کے مواقع

ایرونوٹیکل انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد آپ سرکاری تنظیموں جیسے ہندوستان کی خلائی تحقیق کی تنظیم، ISRO، دفاعی تحقیق اور ترقیات کی تنظیم DRDO، ہندوستان ایرونوٹکس لمیٹڈ، HAL (اس کی فیکٹریاں بنگلور، ناسک، کوراپٹ اور کانپور میں ہیں)، نیشنل ایرونوٹکس لیب، NAL وغیرہ میں ملازمت حاصل کرسکتے ہیں۔ بین الاقوامی ایئرلائن اور ایئرکرافٹ کمپنیوں کے ہندوستان میں، Maintanance Repair and Overhaul کی سہولیات فراہم کرانے کی فیکٹری قائم کرنے کے منصوبے کی وجہ سے بھی ایرونوٹیکل انجینئروں کی مانگ میں اضافہ ہونے والا ہے۔

اس کے علاوہ آپ ہندوستانی ایئرلائن کمپنیوں، ایئرانڈیا، انڈین ایئرلائنس، جیٹ ایرویز وغیرہ میں کام کرسکتے ہیں۔ محکمہ شہری ہوابازی اور ہندوستانی فضائیہ بھی اچھی ملازمت کے مواقع پیش کرتے ہیں۔ یہی نہیں آپ امریکہ کی خلائی تنظیم NASA اور Boeings اور McDonnel Douglas جیسی ایئرلائنس کی کمپنیوں میں بھی ملازمت حاصل کرسکتے ہیں۔

تنخواہ

BE/B Tech کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اگر آپ ایئرلائنس کی کسی کمپنی میں ملازمت شروع کرتے ہیں تو آپ کو 3 سے 5 لاکھ روپے سالانہ تک کی تنخواہ مل سکتی ہے۔ اگر آپ تحقیقی تنظیموں جیسے ISRO اور DRDO میں کام شروع کرتے ہیں تو آپ کو ہر ماہ تنخواہ کے طور پر 35 سے 45 ہزار روپے مل سکتے ہیں۔ اگر آپ HAL اور NAL جیسی تنظیموں میں نوکری کرتے ہیں تو آپ کی تنخواہ 30 ہزار روپے سے 40 ہزار روپے کے درمیان ہوسکتی ہے۔ سرکاری شعبے کی بہ نسبت پرائیویٹ سیکٹر میں تنخواہوں کی پیش کش بہتر ہوتی ہے۔ کہتے ہیں نہ کہ Sky is the Limit کچھ سالوں کے تجربے کے بعد آپ کافی اچھی تنخواہ حاصل کرسکتے ہیں۔

ایرواسپیس انڈسٹری کا ہندوستان میں تابناک مستقبل:

ہندوستان میں ایرواسپیس انڈسٹری کا مستقبل کافی تابناک ہے جہاں حکومت نے گزشتہ 16 برسوں میں اس سیکٹر میں امریکہ اور یوروپ کے مقابلے کہیں زیادہ سرمایہ کاری کی ہے اور اب ہمارا ملک برازیل اسرائیل اور اسپین کو ایرواسپیس انڈسٹری میں حاصل ہوئی کامیابی کی طرز پر اور آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ایرواسپیس کے بہت سارے پروجیکٹوں پر ابھی کام چل رہا ہے۔ یہی نہیں کیلکر کمیٹی کی سفارشات پر حکومت نے اس انڈسٹری کا دروازہ پرائیویٹ سیکٹر کے لیے بھی کھول دیا ہے اور ریاستی حکومتوں نے اس سلسلے میں خصوصی اقتصادی زون (Special Economic Zones) بھی قائم کیا ہے جس کے تحت آندھراپردیش کے رنگاریڈی ضلع میں تین ہزار کروڑ کا ایک ایرواسپیس اینڈ پری سیزن انجینئرنگ اسپیشل اکونومک زون، بنگلور انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے نزدیک 1000 ایکڑ پر مشتمل ایک خصوصی ایرواسپیس پارک کی تجویز اور گجرات میں 2500 ایکڑ پر مشتمل ایک اسپیشل اکونومک زون کا قیام شامل ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی دوسری بڑی کمپنیاں جیسے ہیروموٹرس، ٹاٹا گروپ، مہندرا اینڈ مہندرا اور لارسن اینڈ ٹوبرو (L&T) بھی کسی نہ کسی طرح سے ایرواسپیس کی ترقی کرتی انڈسٹری میں شامل ہورہی ہیں اور ظاہری بات ہے کہ جب کام بڑھیں گے تو کام کرنے کے لیے لوگوں کی ضرورت ہوگی جو نتیجتاً روزگار کے مواقع فراہم کریں گے۔

□

Md. Shamim Akhter, 18/12 B, Okhla Main Market, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

مصنف: دولگا ، مترجم: انیس ظفیر الحسن

سنگم

(حیدرآباد کی سمتا لیگل رسیورس سینٹر برائے خواتین جنرل سکریٹری دولگا کا اصلی نام پوپوری للیتھا کماری ہے۔ (پیدائش 27 نومبر 1950) اب تک ان کے لکھے چھ ناول اور مختصر افسانوں کے دو مجموعے منظرعام پر آچکے ہیں۔ مضامین، تبصرہ نگاری، ایڈیٹنگ اور ترجمے بھی ان کے دائرہ کار میں آتے رہتے ہیں۔ 1995 میں ایک ڈراما بھی لکھا۔ اوشاکرن موویز حیدرآباد کے لیے پندرہ سے زیادہ فلموں کے لیے 1960 سے 1995 تک کام کرتی رہیں۔ ای ٹی وی کے شروعاتی دور کے پروگراموں میں بھی ان کی شمولیت رہی ہے۔ قومی ایوارڈ یافتہ تلگو فلم 'بھادرم کوڈیکو' فلم کے گانے ان کے ہی لکھے ہوئے ہیں۔ فلموں اور سیریلز کے اسکرپٹ لکھتی رہتی ہیں۔ ان کے ناول 'Su Eccha' کو 1987 میں تو دوسرے ناول 'Akasamio' کو 1990 میں بہترین ناول کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1993 میں انہیں خواتین کے لیے کیے گئے کارہائے نمایاں پر تلگو یونیورسٹی کی طرف سے ایوارڈ دیا گیا تو 1998 بہترین افسانے کا ایوارڈ آندھراپردیش کی سرکار سے تفویض کیا گیا۔ 1999 میں انہیں بہترین خاتون مصنف کا ایوارڈ تلگو یونیورسٹی کی طرف سے دیا گیا ہے۔ آپ آندھراپردیش کے وی ایس آر اور این دی آر کالج تنالی میں 1973 سے 1986 تک تلگو ادب کی استاد رہیں۔ 1986 سے 1995 تک حیدر آباد کی اوشا کرن موویز کے سینئر ایگزکیوٹو کی ذمے داریاں سنبھالے رہیں۔ 1991 سے 1997 تک سمتا کی سینئر ایگزکیوٹو پرسیڈنٹ کے فرائض انجام دیے نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کے تلگو ایڈوائزری پینل کی ممبر ہونے کے ساتھ ایک فیمنسٹ پبلشنگ ہاؤس VAMTIMT (رسوئی گھر سے نکلتا دھواں) کے ادارتی شعبے سے بھی منسلک ہیں۔ میرا یہ ترجمہ ان کے افسانے 'سنگم' کے وجے سائی اور پراتیک کانجی لال صاحبان کے انگریزی ترجمے 'کونفلوئنس' پر مبنی ہے جو دلی سے شائع ہونے والے رسالے لٹل میگزین میں شائع ہوا ہے۔

غروب آفتاب کا وقت ہے۔ رات کا استقبال کرنے کے لیے شفق کی لالیما میں لپٹے بن نے دوسری طرف سے آتی تاریکی کو اپنے گرد لپیٹنا شروع کردیا ہے— دن بھر کی کارگزاریوں کا جشن مناتے طیور جھنڈ جھنڈ ہم آواز چہچہاتے اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے ہیں۔ غزال دن بھر کی تھکان جھٹک کے چاندرات کے بن میں کلیلیں کرنے کی تیاریوں میں جٹ گئے ہیں۔ گھنی ہریالیوں کے بیچ کسی بے مثل مورتی کار کے تراشے ہوئے مجسموں کی طرح ایستادہ رِشی منی— آشرم میں سندھیا کی پوجا کی شروعات ہوچکی ہے— مقدس آگ روشن ہے۔ فضاؤں میں وید منتروں کے آلاپ کی گونج بڑھتی جارہی ہے— رشیوں کی دھرم پتنیوں میں سے کچھ پھولوں سے رنگولی بنانے میں مصروف ہیں تو کچھ پشپ مالائیں بنانے میں لگی ہوئی— بن کو گئے بچے اپنی اپنی ماؤں کی ممتا کی چھاؤں میں آگئے ہیں جنھیں وہ پوجا کے لیے جلدی جلدی تیار کررہی ہیں— مگر آشرم کی ایک کٹیا ایسی بھی ہے جہاں ایک ماں اب تک انتظار کے عالم میں کھڑی ہے۔ اس کے بچے ابھی تک نہیں لوٹے!— کوئی اس ماں کی آنکھوں میں جھانکے تو وہاں اسے ممتا کے سوا کچھ نظر نہیں آنے والا کہ یہ ماں تو صرف اپنے بچوں کے لیے جی رہی ہے— مگر اس وقت ان ممتا بھری آنکھوں میں ڈر اور اندیشے کی رمق بھی گھلانے لگی ہے۔ اس منتظر ماں کا نام سیتا ہے!

روز تو بچے وقت پر گھر آجاتے تھے۔ ماں کی پوجا کے لیے بن سے چنے گئے پھولوں سے بھرے ہوئے— آتے ہی سارے پھول ماں کے قدموں میں ڈھیر کردیتے اور ماں جب ان بے نام پھولوں کو پوجا کے لیے لینے سے جھجکنے لگتی تو اپنی طرف سے ان پھولوں کے ایسے ایسے نام رکھ کر ماں کو بتانے لگتے جسے سنتے ہی وہ ہنسنے لگ جاتی ہے اور اس کے اس طرح ہنسنے پر کیسا برا منہ بنا کے بیٹھ جاتے ہیں اس کے بچے!— پھر ان پھولوں کو قبول نہ کرے تو سیتا اور کیا کرے! سندھیا کے رات بن جانے کے بعد دل کھول کر ایسا سنگیت چھیڑ دیتے ہیں جسے

سن کر سارا بن جھومنے لگتا ہے۔ اس کے بیٹے۔ لو اور کُش!— کہاں رہ گئے آج؟— بن کے کونے کونے سے وہ واقف ہیں۔ اس بن کے پالے ہیں اس کے بچے۔ ان کا تو جنم ہی اس بن میں ہوا۔ اپنے بچوں کے لیے سیتا کو بن سے کوئی خطرہ نہیں محسوس ہوتا ڈر تو اسے اس خیال سے لگ رہا ہے کہ کہیں پھر شہر کو نہ چل پڑے ہوں۔ جب سے وہ اجودھیا جا کے لوٹے ہیں تبھی سے سیتا کی جان کو یہ فکر لگ گئی ہے— ایک اندیشہ ایک خوف رہ رہ کے انھیں اپنے گھیرے میں لیتا رہتا ہے۔ اس وقت بھی وہ یہی سوچ سوچ کے تشویش کرتی تھکی جا رہی ہیں۔ بڑھتی ہوئی تاریکی میں اپنی آنکھوں کے دیے جلائے بیٹھی ہے سیتا! اور اسی روشنی کے سہارے اس نے انھیں لوٹتا ہوا دیکھ لیا—

''اتنی دیر کہاں لگا دی؟— کہاں رہ گئے تھے؟''

''ماں۔ ماں۔ دیکھیے تو سہی، کیا لے کے آئے ہیں ہم!''

انھوں نے دامن میں بھرے سارے پھول ماں کی تھالی میں ڈھیر کر دیے تو کٹیا ایسی مہک اٹھی جیسی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ سفید، سرخ، زرد ہر طرح طرح کے پھول تھالی میں پڑے مسکرانے لگے۔ لو اور کش کی طرح۔ جن کے چہرے اس خوشی سے گلنار ہو رہے تھے کہ وہ کیسے نایاب پھول آج چن لائے ہیں! ''کہاں مل گئے یہ پشپ تمھیں'' سیتا ملائمیت سے پھولوں کو چھونے لگیں۔ ''بہت ہی سندر پھول ہیں۔''

''ایک نئی بگیا دریافت کر لی ہے ہم نے! ایسی بگیا تو ہم نے کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ بالمیکی دادا کی لکھی ہوئی پُشپ واٹیکائیں بھی اس کے آگے ماند پڑ جائیں گی ''بڑے جوش و خروش سے کش بتانے لگا تو لو کی گردن بھی اس کی تائید میں ہلنے لگی۔

''کس کی ہے؟ - وہ پشپ واٹیکا؟'' سیتا پوچھنے لگیں۔

''ارے ماں۔ کچھ نہ پوچھو۔ واٹیکا جتنی خوبصورت ہے اس کی مالکن تو اس سے کہیں زیادہ بدصورت نکلی۔ ہم تو اسے دیکھتے ہی ڈر گئے۔ پھول چن رہے تھے تبھی آ گئی— بھراتا کُش نے بڑی ہمت جٹائی تو اسے بتایا کہ ہم رشی پتر ہیں۔ پھول چننے یہاں آ گئے ہیں۔ لو کا چہرہ اس عورت کے چہرے کو یاد کرتے ہوئے بگڑا جا رہا تھا۔ ''پھر ہم بھاگتے ہوئے وہاں سے نکل گئے — کتنا بھیانک چہرہ تھا!— جیسے کشٹ روگیوں کا ہوتا ہے!''

''بری بات! کسی کو اس کے چہرے مہرے کی وجہ سے برا نہیں کہتے۔ اس کی صورت خراب تھی تو کیا ہوا۔ اتنے سندر پھول تو اسی کے اگائے ہوئے ہیں۔ ہیں کہ نہیں؟''

''ہاں یہ تو ہے— ویسے ڈیل ڈول سے ٹھیک ٹھاک تھی مگر اس کا چہرہ!— ارے ماں اس کے تو نہ ناک تھی نہ ہی کان— بس سوراخ پڑے تھے ان کی جگہ!'' کش بڑی کراہیت سے کہہ رہا تھا۔

سیتا کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کی پیٹھ پر کوڑا دے مارا ہو۔ تڑپ کے بول اٹھی— ''کیا کہا؟ ... ناک نہیں تھیں؟ کان بھی نہیں ...''

''ہو سکتا ہے پہلے رہے ہوں۔ شاید کسی نے کاٹ ڈالے۔ لگتا تو یہی تھا۔ کیوں بھراتا کش؟'' لو نے کش کی طرف دیکھا—

سرپ نکھا... ہو نہ ہو سرپ نکھا!... کون ہو سکتی ہے کوئی اور اس کے سوا!— اٹھارہ برس پہلے شری رام کو لبھانے رجھانے کے لیے آنے والی سرپ نکھا! کتنی خوبصورت تھی! شری رام اور لکشمن کی انتقامی کارروائی نے اس کا کیا حال کر دیا!— مگر سرپ نکھا اس بن میں؟... کیسے؟... گردشِ زمانہ بھی کیا کیا دکھا دیتی ہے! شری رام اور لکشمن کے ہاتھوں سرپ نکھا کی درگتی کی وجہ سے ہی تو راون کے ہاتھوں سیتا کا ہرن وقوع پذیر ہوا تھا— ہے ایشور!— مردوں کی انتقامی کارروائیوں کے لیے کیسے مہرہ بنائی جاتی رہی ہیں ہم عورتیں! سرپ نکھا اگر راون کی بہن نہ ہوتی تو کیا اس کے ساتھ وہی ہوتا جو ہو گیا شری رام اور لکشمن کو راون کو یدھ کرنے پر اکسانے کے لیے جو چاہیے تھا وہ سرپ نکھا کی توہین کر کے مل گیا تھا— یدھ نیتی! واہ رے یدھ نیتی!— ہائے رے یدھ نیتی!— اور ہائے رے سرپ نکھا!— روپ رنگ کی متوالی پریم باوری سرپ نکھا دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر رام کے پاس آ گئی تھی— کیا ملا اسے! کیا حاصل ہوا! کیسے جی رہی ہوگی اب! بدہیئت مکروہ صورت عورت کو کوئی مرد چاہنے والا مل سکتا ہے کیا! کیسے گزر رہی ہوگی اب اس کی زندگی؟.. ہاں... یہ پھول... اس کے نازک احساسات کا آئینہ ہیں کیا؟— کتنا حسرت ناک ہے یہ سب کچھ!

لو اور کش نے اپنی ماں کی آنکھوں میں امنڈتے آنسوؤں کو دیکھا تو حیران رہ گئے۔ ''کیا ہوا؟ کیا ہوا ماں؟ اس استری کی کروپتا جان کے آپ کیوں رو رہی ہیں؟'' انھوں نے پوچھنا شروع کر دیا تو ان کی پریشانی دیکھ کے سیتا نے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں اور مسکرانے لگیں۔

''سنو مجھے لے چلو گے؟ وہاں؟'' لو اور کش نے سنا تو بے یقینی سے ماں کو دیکھنے لگے۔

''ہاں بھئی— میں بھی دیکھنا چاہتی ہوں۔ لے چلو گے؟ راستہ یاد ہے نا۔ وہاں کا؟''

بچے ایک دم سے بہت خوش ہو گئے۔ ماں ان کے ساتھ کہیں جانے کو کہہ رہی ہیں! ان کی دیرینہ خواہش پوری ہونے جا رہی تھی۔ کب سے وہ ماں کو بن کی سیر کرانے لے جانا چاہتے تھے۔ مگر وہ تو ضرورتاً بھی کبھی جانا پڑ جائے تو ان کے ساتھ نہیں اپنی کسی سکھی کے ساتھ ہی جایا کرتی ہیں۔ بچے بڑے جوش میں آ گئے اور وہیں بیٹھ کر ماں کو جنگل میں پیش آ جانے والے ہر امکانی خطرے سے بچنے کے طریقے بتانے بیٹھ گئے۔ مارے خوشی کے انھیں رات کو ٹھیک سے نیند بھی نہیں آئی صبح کے انتظار میں جاگ جاگ کے سوتے رہے۔

سیتا کے لیے یہ رات بڑی بھاری ہو گئی تھی۔ نہ چاہنے پر بھی پرانی یادیں ہر طرف سے ان پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ بن باس کے صحرا میں رام جی کے ساتھ گزارے ہوئے خوشگوار دن!— کتنے اچھے تھے!!. پھر سرپ نکھا آ گئی۔ خراماں خراماں چلتی ہوئی کیسی شاندار لگ رہی تھی! چنبیلی کے گجروں سے سجے اس کے گیسو! گلے میں زرد پھولوں کی مالائیں۔ آسمانی رنگ کے پھول کلائیوں میں زیب دیتے ہوئے۔ از سرتاپا کھلتے پھولوں والی پشپ لتا جیسی سرپ نکھا! سیتا کے گہنوں کو کیسے اچنبھے سے دیکھ رہی تھی! جیسے کہہ رہی ہو کہ ان خوشبو سے عاری چیزوں کو کیوں لاد رکھا ہے تم نے؟— مگر ان سے تو وہ کچھ بولی ہی نہیں۔ سیدھی رام جی کے پاس چلی گئی تھی اور اس سے پہلے کہ سیتا معاملے کی نوعیت جاننے کی زحمت اٹھائیں... دلگداز چیخیں... اور رکت دھارا سے کٹیا شرابور ہو گئی...

کیسا انرتھ کر دیا گیا تھا اس کے ساتھ!... کیسی کیسی بددعائیں نکلی ہوں گی سرپ نکھا کے دل سے... شراپ!... جو ابھی تک ان کے ساتھ لگا چل رہا ہے!

کیسی عجیب مماثلت ہے سیتا اور سرپ نکھا کے حالات میں!

سرپ نکھا!— کسی بھی مرد کے لیے ناقابلِ قبول بنا دی گئی اور سیتا کو عزیز از جان رکھنے والے مرد نے تیاگ دیا! سرپ نکھا سے ملنے جاؤں تو کیا کہے گی وہ؟— کیا پتا اتنی خفا ہو کہ اس سے بات ہی نہ کرے!— جو بھی ہو، اس سے ملنے تو جانا ہی ہے!

دوسرے دن جلدی جلدی سارے کام نبٹا کر وہ بن کے لیے نکل پڑے— لو اور کش ماں کی دلبستگی کے لیے مسلسل باتیں کیے جا رہے تھے۔ ''ماں۔ ماں۔ میں آج آپ کو اپنے راجہ سے ملواؤں گا۔ لو کی جنگلی ہاتھی سے بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ دونوں بھائی اس کی پیٹھ پر بیٹھ کے خوب مزے کرتے تھے۔'' آپ... اس کی پیٹھ پر بیٹھ جائیں گی

نا؟''لو نے پوچھا تو سیتا کو شاہی ہاتھوں پر اپنی سواری کی یاد آ گئی۔

''نا بھئی— مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں پیدل ہی بھلی۔'' ماں نے کہا تو بچے سمجھے ماں ہاتھی پر بیٹھنے سے ڈر رہی ہے۔

''کیوں پریشان کرر ہے ہو ماں کو۔'' کش بھائی کو ڈانٹنے لگا۔

''ہاتھی کی پیٹھ پر ماں کو بیٹھنا کیسے آئے گا۔'' پھر جنگل کے کونے کونے سے اپنی آگاہی جتلاتے دہ ماں ے ساتھ راستے طے کرنے لگے اور سیتا ان کی باتوں میں ایسی محو ہوئیں کہ انھیں نہ تھکان کا احساس ہوا نہ ہی دور دراز راستے کے طے ہو جانے کا— لیجیے پہنچ گئے ہم!... وہ رہی!... وہ رہی! پُشپ واٹیکا!...'' ان کے اشارے کی طرف سیتا نے دیکھا تو مسحور سی وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئیں۔ نگاہ جہاں جاتی اسے اپنے اندر جذب کر لینے کو ٹھیری جا رہی تھی۔ امرت کی بوندوں کے کام و دہن میں اترنے جیسا سیراب کن نظارہ!— سچ کہا تھا بچوں نے۔ بیشک اشوک واٹیکا ئیں بھی اس کے آگے ماند پڑ جائیں گی...

''دھنیہ ہو سرپ نکھا۔'' سیتا دل ہی دل میں کہے جا رہی تھیں— ''ماں اندر چلیں؟'' بچے پوچھ رہے تھے۔ ''نہیں تم نہیں اندر صرف میں جاؤں گی۔ تم لوگ جا کے بن ویہار کرو۔ سندھیا سے پہلے آ جانا۔ پھر ساتھ آشرم لوٹ چلیں گے۔''

بچوں کو بھیج کر اندر گئیں تو سامنے ہی ایک استری نظر آ گئی۔ پیٹھ سے بالکل سرپ نکھا لگ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے چلتی سیتا اس کے پاس پہنچ گئیں ''سرپ نکھا— بڑی ملائمیت سے انھوں نے اسے مخاطب کیا۔ وہ چونک کے مڑی اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔

''کون ہو؟'' اس نے پوچھا ''ڈگر بھول کے آ گئی ہو؟ میرا نام... کیسے معلوم ہوا تمھیں؟''

''نہیں میں کوئی راستہ نہیں بھولی ہوں۔ تمھاری تلاش میں ہی نکلی تھی۔ سرپ نکھا! میں سیتا ہوں!''

سرپ نکھا ہکّا بکّا رہ گئی۔ سیتا! اور یہاں؟ اس حال میں؟ کیسے؟ بیشک میں نے سیتا کو چھن بھر کے لیے ہی دیکھا تھا مگر گہنوں سے لدی پھندی وہ سیتا ایسی تو ہرگز نہیں تھی... مہابلی راون کے راجیہ کا اَنت ہونے کے بعد پورے بھارت ورش پر رام راجیہ ہو گیا تھا جس کی گدی پر رام کے ساتھ سیتا کو بھی براجمان ہونا تھا۔ وہ یہاں کیسے؟ اور اس حال میں؟ موٹی بورے جیسی ساڑی۔ دھوپ کی تمازت سے جھلسی رنگت۔ زیبائش کے نام پر صرف پھول مالا.. یہ شری رام کی سیتا کیسے ہو سکتی ہے؟

''سیتا؟.. شری رام کی..''

''ہاں— میں وہی سیتا ہوں! راجہ جنک کی پُتری دھرتی ماں کی بیٹی جانکی!'' سیتا بڑے غرور سے سر اٹھائے ایک ایک لفظ ادا کر رہی تھیں۔ بڑے اہتمام سے!... ''شری رام نے مجھے تیاگ دیا ہے! ان دنوں رِشی والمیکی کے آشرم میں رہتی ہوں۔

سرپ نکھا تو جیسے سکتے میں آ گئی.. سیتا کو تیاگ دیا؟ شری رام نے؟... وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے کیا ہیں، اس بات کو سرپ نکھا سے زیادہ کون جان سکتا ہے؟ بڑی بھاری قیمت چکا کے یہ جاننا ملا ہے اسے!... مگر یہ کیسے ہو گیا؟... شری رام کا موہ رکھنے والیوں کا یہ کیسا مقدر ہے؟ کچھ نہیں حاصل ہوتا انھیں کفِ افسوس ملتے رہنے کے سوا! مگر سیتا کی طرف دیکھا تو اور بھی حیرانی ہونے لگی۔ ان کا چہرہ! اتنا پرسکون!— نہ کہیں گردِ ملال نہ تردّد!... اپنی ساری ارتقائی منزلیں طے کر کے آئی لگتی ہے!

''میرے بچے کل تمھاری واٹیکا میں آ گئے تھے۔'' سیتا کہہ رہی تھیں۔ ''تم سے بھی ملے تھے نا! ان کے ساتھ ہی آ گئی۔ واقعی۔ تمھاری واٹیکا بہت سندر ہے!''

''وہ تمھارے بچے تھے؟ بڑے پیارے بچے ہیں۔ دیکھتے ان کا موہنی منتر دل پر چل جاتا ہے۔'' اور سیتا کو فخریہ مسکراتے دیکھا تو کہے بغیر نہیں رہ سکی۔ ''اور یہ میرے بچے ہیں! میرے لگائے ہوئے پودے!''

''تبھی تو اتنے سندر ہیں! تمھارے بچے نہ ہوتے تو ایسے تھوڑا ہی نکلتے!'' سن کے سرپ نکھا نہال ہو گئی۔ ''کچھ اپنے بارے میں بھی بتاؤ! کیسی گزر رہی ہے زندگی؟''

''—'' بہت اچھی۔ اس مسحور کن واٹیکا کی طرح سندرتا سے بھری پُری!

''مجھے یہ جان کے کتنی خوشی ہو رہی ہے کہ بیان نہیں کر سکتی۔ تمھارے بارے میں جب جب سوچتی تھی دل تشویش سے بھر جاتا تھا۔ بڑی فکر ہونے لگتی تھی تمھارے لیے۔ کیسے جی رہی ہوگی۔ اپنی اتنی ہتک کے بعد؟ روپ رنگ اور پریم کی دلدادہ تم! جیسا تمھیں بنا دیا گیا، کیسے جھیل رہی ہوگی؟'' سیتا کے لہجے میں سرپ نکھا کے لیے جو دردمندی اور اپنا پن تھا وہ سرپ نکھا کے دل کو چھونے لگا۔ رفاقت کا یہ کیسا رشتہ ہے جو انھیں باندھنے لگا ہے؟

''تم بہت بہادر ہو!'' سیتا کہہ رہی تھی ''اتنا سب کچھ جھیل جانا آسان نہیں ہے۔''

''آسان نہیں تھا سیتا!'' سرپ نکھا تڑپ کے بول اٹھی۔

''زندگی کی رَو میں الٹی طرف ڈال دی گئی تھی میں! اپنی مکروہ صورتی کو برداشت کر لینا مجھ سے ہو ہی نہیں رہا تھا۔ اپنے وجود سے نفرت ہو گئی تھی مجھے کئی بار تو اپنی جان سے گزر جانے کی بھی سوچ بیٹھتی تھی... سوچو ذرا... میں جو رنگ روپ کی دیوانی تھی، ہر اس چیز سے جو مجھے ذرا بھی سندر نظر آتی۔ چڑھنے لگی تھی۔ حسین چہروں کو دیکھتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی اور میں اسے تہس نہس کرنے پر تل جاتی— دکھ کے اپار ساگر میں پڑی بے رحم موجوں کے تھپیڑوں پر تھپیڑے کھاتے کھاتے میں وہ سرپ نکھا ہی نہیں رہی تھی جو ہوا کرتی تھی... اپنی اس حالت کے ذمے دار رام اور لکشمن کو اٹھتے بیٹھتے کوستے دیتی رہتی... اور تمھارے لیے تو میرے دل میں سوائے زہر کے کچھ تھا ہی نہیں۔ اپنے اندر کی آگ میں جلتے جلتے خود ایک جوالامکھی بن کے رہ گئی تھی میں! جوالامکھی! جو اپنے اردگرد کی ہر شے کو صرف جلا کے راکھ کر دینے کے لیے بڑھتی رہتی ہے... ایسا برا حال ہو گیا تھا میرا!''

اپنے جذبات پر قابو پانے کے لے سرپ نکھا چپ ہو گئی... واٹیکا کی فرح ناک فضائیں اندوہ ناکی سے بوجھل ہو گئی تھیں دونوں عورتیں بے حد افسردہ سر جھکائے بیٹھ گئی تھیں.. سیتا نے خاموشی توڑی۔ ''پھر؟ کیسے نکلی تم اس دلدل سے؟'' ''مشکل ہی نہیں بہت دشوار تھا اس سے باہر آنا۔ مجھے اپنی خوبصورتی پر کس قدر ناز تھا اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتی تم! خاص طور پر اپنی ناک پر! تم آرین لوگوں کی ناک کی طرح میری ناک اونچی اور تیکھی تو نہیں تھی مگر سپاٹ یا بیٹھی ہوئی بھی ہرگز نہیں تھی بلکہ آرین لوگوں کی ناکیں عجیب لگتی تھیں مجھے۔ مگر عجیب ہونے کا بھی ایک اپنا حسن ہوتا ہے۔ سرشٹی کی طرح ناکوں کی رچنا بھی قسم قسم کی ہوئی ہے بھئی... خیر... مجھے اپنی اس ناک پر، جس میں ننھی سی کیل پڑ کے ستارے کی طرح دمک اٹھتی تھی ازحد پسند تھی۔ اسے دیکھتی تو اپنے حسن پر اور بھی نازاں ہونے لگتی تھی۔ اس ناک پر محبت بھرے بوسے کے تصور سے میرا روم روم تھرک اٹھتا تھا... اور اسی ناک سے محرومی! کیسے برداشت کر لیتی آسانی سے؟ پاگل ہو اٹھتی تھی میں۔ اور دنیا جہان کو تباہ کر دینے کی شدید خواہش مجھ سے توڑ پھوڑ کروانے لگتی تھی مگر جھیل گئی! سب کچھ جھیل گئی... وقت جو سب کی چارہ گری میں لگا رہتا ہے۔ میرے درد کا مداوا کرنے لگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ میرے اندر کا تانڈو شانت ہونے لگا اور میری حسن پرست فطرت مجھے مظاہر قدرت کی دلفریبیوں کی طرف لے جانے لگی۔ اپنی جمالیاتی حس کی

تسکین کے لیے میں کائنات میں بکھری خوبصورتی اور بدصورتی کی ماہیت کی تفہیم میں لگ گئی اور پھر یوں ہوا کہ متحرک اور غیرمتحرک تمثیلی وحدتوں کی ہم آہنگی اور رنگوں کے اسرار مجھ پر آشکار ہونے لگے۔ میں فطرت سے قریب ہوتی چلی گئی۔ کائنات کے ذرّے ذرّے کا بغور مطالعہ میرا محبوب مشغلہ بن گیا اور جانتی ہو؟ مجھے اس کے لیے کسی گرو کی ضرورت نہیں پڑی۔ میرے مشاہدے میرے تجربے میرے کام آنے لگے، میرے رہنما بن گئے اور میرا نظریۂ حیات بدلنے لگا۔ دھیرے دھیرے میرے اندر بھری ہوئی نفرت محبت میں بدلنے لگی۔ اردگرد سے مجھے پیار ہونے لگا۔ پنچھیوں کا اپنے نحیف ونزار بچوں کو اڑنے پر اکسانے کے لیے بار بار چونچ سے ٹھونگیں مارتے رہنے کا پرجمال اور محبت سے بھرا ہوا عمل مجھے کچھ نہ کچھ کرنے کی ترغیب دیتا رہتا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو دیکھنا شروع کیا تو مجھے بہت اچھے لگے۔ میں ان سے حسن کاریاں کروں گی! میں نے فیصلہ کرلیا اور اپنے ان کارگزار ہاتھوں سے اس بگیا کو پروان چڑھانے لگی۔ اپنی فطرت میں شامل حسن پرستی اور جنونِ عشق کے ساتھ!— اور اسی میں دس سال گزر گئے۔ پرائشچت کے نہایت سخت گزار دس سال!— مگر... بالآخر!... دیکھ ہی رہی ہو!''

سرپ نکھا کی ماہیت حسن جاننے کی مہم کا بیان ختم ہوا تو سیتا کہے بغیر نہیں رہ سکیں۔ ''تم بہت خوبصورت ہو سرپ نکھا! اتنی کہ ظاہر بین مرد کی نگاہ اسے دیکھ لینے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی۔'' کہتے کہتے ان کا گلا بھر آیا۔ اپنی آزمائشوں کی آگ سے ان کے گزرتے رہنے اور سرپ نکھا کی پریکشاؤں میں کوئی خاص فرق تو ہے نہیں... چھلکتے آنسوؤں کے ساتھ سرپ نکھا کی طرف دیکھا تو وہ بڑی بشاش مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''مگر.. سارے مرد... عورت کو مکروہ صورتی عطا کرنے والے تھوڑے ہی نا ہیں! ان میں اکثر کے دل بھی ہوتے ہیں اور آنکھیں بھی.. فکر و نظر رکھنے والے مرد بھی پائے جاتے ہیں یہاں!...''

''تو کیا...'' خوشگوار استعجاب سے سیتا نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہنس پڑی۔ ''ٹھیک سمجھی ہو! مل گیا ہے! اس روح افزا واٹیکا کی حسن کاری میں میرا معاون، میرا مددگار! میرے ہاتھ سے ہاتھ ملا کے چلنے والا۔ اور پکارنے لگی ''سدھیر!... سدھیر...'' اور پل بھر میں ایک متناسب الاعضا مردان کے سامنے آکے کھڑا ہوگیا ''سدھیر یہ سیتاجی ہیں! ان سے ملنے کے لیے بلایا ہے تمھیں۔''

سدھیر آیا اور چلا گیا۔ مگر اتنے سے وقت میں ہی سیتا نے ان کے درمیان کے رشتے کی وہ مضبوطی دیکھ لی۔ جو انھیں ابھی تک کسی رشتے میں نظر نہیں آتی تھی۔

''تو تمھیں مل ہی گیا بالآخر!... تمھاری تکمیل کرنے والا!'' اس کے جانے کے بعد سیتا کہنے لگیں تو سرپ نکھا نے ہاتھ اٹھا کے انھیں چپ کردیا۔— ''میں نہیں سمجھتی کہ مجھے اپنی تکمیل کے لیے کسی مرد کی ضرورت ہے— اور اس بات کے پورے تیقن اور آگہی کے بعد ہی میرا سدھیر سے رشتہ قائم ہوا ہے۔ اپنی تکمیل کے لیے میں کسی مرد کی محتاج ہرگز نہیں ہوں۔''

سیتا بڑے غور سے سرپ نکھا کا چہرہ دیکھ رہی تھیں جس سے خود آگہی اور اعتماد کا نور چھن چھن کے نکل رہا تھا۔ ''بولتی رہو سرپ نکھا... یوں ہی بولتی رہو۔'' سیتا کا دل کہے جا رہا تھا مگر سرپ نکھا کی توجہ تو اب سیتا کی طرف مبذول ہوگئی تھی۔

''اور تم؟... تمھارا کیا ارادہ ہے؟ کیا سوچا تم نے؟ اپنی تکمیل کے لیے؟''

''میں؟... اوہ... میرے بچے ہیں نا! ان کو پروان چڑھادوں۔ میری تکمیل ہوجائے گی۔''

ہوں!... تو یہ بنا رکھا ہے تم نے... اپنا نصب العین؟''

''ہاں۔ شری رام کی اردھانگنی بننے کا کام تو ادھورا رہ گیا— اب ان کے سپتروں کو ان کے راجیہ اور سنگھاسن کے لائق بنا دینے والی ماں بننے کی کوشش کررہی ہوں۔ یہ کام تو کرہی سکتی ہوں ہے نا؟''

''ہاں!.. وہ راجیہ، وہ سنگھاسن! جس پر تم براجمان نہیں ہوسکیں!... کیسا گورکھ دھندا ہے تمھاری زندگی سیتا؟''

''راجیہ ودھو کی تقدیریں!... ناگزیر ہوتی ہیں!'' کہتے ہوئے سیتا مسکرانے لگیں۔

''مجھے بھی لنکا میں رہنا ذرا اچھا نہیں لگتا تھا۔ جیشٹھ بھراتا راون میرے راج دھانی میں رہنے پر مصر رہتے تھے— مزا تو مجھے بن بن پھرنے میں آتا تھا—''

''مجھے بھی اب بن راس آگیا ہے۔ شری رام سے تیاگے جانے کے بعد سے یہیں رہ رہی ہوں۔ اب تو میرا گھر بن چکا ہے یہ بن!''

باتوں باتوں میں دن ڈھلنے لگا تھا۔

''میرے بچے... نہیں جانتے کہ شری رام ان کے پتا ہیں! میں نے انھیں بتایا ہی نہیں۔ صحیح وقت کا انتظار کررہی ہوں پھر بتادوں گی۔''

''بتادوگی؟.. پھر اس کے بعد؟ چھن بھر کو بھی ٹھیریں گے کیا؟ وہ... اس بن میں؟ یہ بھی تو سوچو۔''

''سوچتی ہوں'' سیتا کا سر مدھم ہوتا جارہا تھا۔

''ویسے.. اتھاہ پریم ہے انھیں بھی۔ اس بن سے!''

''ہوگا— مگر بن بیچارے کا شہر سے کیا مقابلہ راج پتروں کو اپنی جنتا کی فلاح اور بہبودی کے لیے راج دھانی میں ہی رہنا پڑے گا نا!— پھر کیا کروگی؟'' سرپ نکھا جو کہہ رہی ہے وہ ناگزیر ہے یہ تو سیتا بھی جانتی ہیں۔ کچھ نہیں بول سکتیں۔

''کیسے رہوگی تنہا! ان کے بغیر والمیکی آشرم میں؟ جی سکوگی؟''

''نہیں جی سکوں گی... اپنی دھرتی ماں کی گود میں سما جاؤں گی۔ ان کی ممتا مجھے ضرور پناہ دے گی۔''

''ہاں!— تمھاری دھرتی ماتا!— ہاں بھئی کہاں ہے وہ جگہ جہاں وہ نہیں ہیں!... مگر... یہاں... اس واٹیکا میں... ان کی جلوہ افروزی جتنی پرجمال اور دیدہ زیب ہے اتنی کہیں اور نہیں ہوسکتی... کیوں؟ ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟ سرپ نکھا بڑے فخریہ انداز میں اپنی واٹیکا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیتا کا چہرا دیکھ رہی تھی۔ سیتا مسکرانے لگیں۔ وہ کیا کہہ رہی ہے سب ان کی سمجھ میں آرہا تھا اور اپنے لیے سرپ نکھا کی فکر اور تشویش دیکھ کر ان کا دل بھر آنے لگا۔ ایسی محبت ان کے دل میں امنڈ آئی جیسے سرپ نکھا ان کی سگی بہن ہو۔

''آجاؤں گی.. سرپ نکھا!... میرے بچے مجھے تنہا آشرم میں چھوڑ گئے تو!... اپنی زندگی کے نئے معانی تلاش کرنے یہیں آجاؤں گی میں!... اپنی ماں کی اتنی ہری بھری گود مجھے اور کہاں ملنے والی ہے!''

وہ کہہ رہی تھیں تبھی بچے آگئے اور سرپ نکھا انھیں میٹھے پھل کھلانے میں لگ گئی۔

آشرم کو واپس جاتے ہوئے بچے ماں سے پوچھنے لگے۔

''یہ خاتون کون تھیں ماں؟''

''میرے دل کے بہت قریب! میری سب سے نزدیکی رشتہ دار''

''مگر آپ نے کبھی ہم سے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔''

''ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے... مگر تم لوگ... یاد رکھنا... اس واٹیکا کی ڈگر کبھی مت بھولنا... یاد رکھوگے نا؟...'' —'' ہاں ماں۔ ہاں۔ ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ کبھی نہیں بھولیں گے۔ ماں کو یقین دلائے بچے ان کے ہم قدم چلتے گئے۔

■

ماخذ: مانگے کی آگ، مصنف: دولگا، مترجم: بلقیس ظفیر الحسن، سنِ اشاعت: 2011، ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6

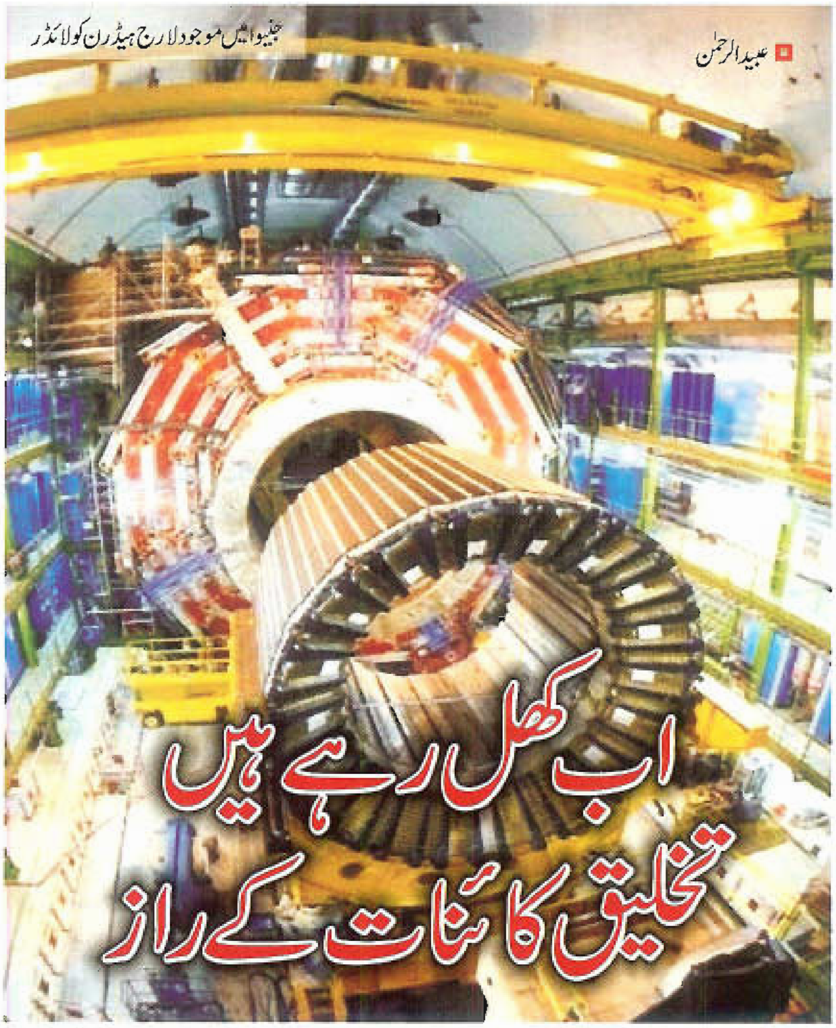

جنیوا میں موجود لارج ہیڈرن کولائڈر

اب کھل رہے ہیں تخلیق کائنات کے راز

عبیدالرحمٰن

کائنات، اس کی تخلیق اور اس کے راز دروں تک رسائی کے لیے ایک طویل عرصے سے تحقیقات و تجربات کا سلسلہ دراز ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم پیش رفت 10 ستمبر 2008 کو جنیوا میں کی گئی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اس بنیادی ذرے کی تلاش کی جائے جس کا نام ہگس بوسن (Higgs Boson) ہے۔ اس وقت جب عوام الناس کو اس کی بابت خبر ملی تو پوری دنیا میں ایک عجیب سی سراسیمگی اور خوف و دہشت کا ماحول قائم ہو گیا۔ یہاں تک کہ 10 ستمبر 2008 کو روز قیامت سے تعبیر کیا گیا۔ ایک طرف مایوسی کا ماحول چھایا ہوا تھا جس سے خوف زدہ ہو کر بھوپال کی سولہ سالہ چھایا نے خودکشی کر لی تھی، وہیں دوسری جانب ان تمام حوصلہ شکن باتوں سے پرے سائنس دانوں کی ٹیم ایک ایسے اہم تجربے کے خد و خال متعین کرنے اور اس کی حقیقت افشا کرنے میں سرگرم تھی جو تخلیق کائنات کے اسرار سے پردے اٹھا سکے۔ اس سے متعلقہ سوالات اور ان کے جواب کے متلاشی سائنس داں مستقل اپنی تحقیقات میں مصروف رہے اور بالآخر 4 جولائی 2012 کو یوروپین آرگنائزیشن فار نیوکلیئر ریسرچ سرن (CERN) کے ذریعے کائناتی تحقیق میں ایک نیا باب رقم کیا گیا۔ جنیوا کے مضافات میں سوئٹزر لینڈ اور فرانس کی سرحد پر واقع 175 میٹر زیر زمیں 27 کلو میٹر لمبی سرنگ کے اندر 10 بیلین ڈالر کے لارج ہیڈرن کولائیڈر تجربے نے اسے ممکن بنایا۔

ستمبر 2008 میں کیے گئے تجربات پر اپنے مضمون 'کیا راز ہے جو سینۂ یزداں میں نہاں ہے' (ماہنامہ 'آج کل' نومبر 2008) میں اس کی طرف اشارہ کیا تھا اور اب پھر ایک بار اسے دہرانا چاہتا ہوں کہ جنھوں نے ارض و سما، شمس و قمر، بحر و بر، نباتات و حیوانات اور انسان کے مطالعہ و مشاہدہ پر توجہ دی وہ کامیاب رہے اور جو ان سے کنارہ کش ہوئے وہ شکوک و شبہات، حقارت و نفرت، کینہ و کدورت، کٹرپن، فرقہ پرستی، کردار کشی اور آدم بیزاری سے خود بے زاری تک جا پہنچے۔ یہاں اس کا ذکر یوں ضروری ہے کہ جب کبھی کائنات اور اس سے وابستہ حقائق کی تحقیق اور انھیں سمجھنے کی جستجو کی جاتی ہے تو اکثر ہوتا یہ ہے کہ یہ عمل اور اس سے متعلق افراد شدید نکتہ چینیوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اس بار بھی یہی ہوا۔ اس تجربہ اور دریافت کی سخت مخالفت میں تحریریں نظر سے گزریں۔ ٹیلی ویژن پر بھی کچھ ایسے مباحث قائم کیے گئے۔ یہاں مجھے اس سے غرض نہیں کہ اس تجربے کے پس پردہ کسی سیاست کا عمل دخل ہے یا یہ کسی گہری سازش کا شاخسانہ ہے۔ یہ بھی موضوع بحث نہیں کہ دریافت شدہ ذرے کا نام 'گاڈ پارٹیکل' کیوں ہے؟ اس پر یوں تو بہت طویل گفتگو ہو سکتی ہے مگر اس مختصر مضمون کا صرف دو بنیادی باتوں سے علاقہ ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسے مذہب اور اس سے وابستہ ایقان سے جوڑا جا رہا ہے جو کسی طور مناسب نہیں ہے کیوں کہ ہر مذہب اس پر یقین رکھتا ہے کہ یہ کائنات اور تمام تر اشیائے نظام ایک مافوق الفطرت اور مالک علی الاطلاق کی تخلیق کردہ ہیں۔ اسے ہم خدا کہتے ہیں، کوئی ایشور تو کوئی پرماتما کہتا ہے۔ کوئی سائنسی مفروضہ اس ایقان کو متزلزل نہیں کر سکتا ہے۔ دریافت شدہ نئے ذرے کی بابت ایک بڑی غلط فہمی نہ معلوم کیسے پیدا ہو گئی ہے کہ یہ ذرہ 'پارٹیکل آف گاڈ' ہے۔ اس کا دعویٰ تو وہ سائنس داں بھی نہیں کر رہے ہیں جو اس تجربے سے وابستہ ہیں۔ مگر اس حوالے سے جیسی تحریریں نظر سے گزریں اور خبریں ملیں ان میں بڑی شدت سے اس ذرے کی دریافت پر بے زاری کا اظہار کیا گیا ہے اور اس تحقیق کو ایک غلط سمت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ حقیقت تو یہی ہے کہ یہ لامحدود کائنات ایک انتہائی منظّم اور منصوبہ بند طریقے سے ذات واحد خدا کی کبریائی وعظمت اور حکمت و صناعی کی خود وضاحتی مثال ہے جس میں کسی کی شرکت بحث طلب موضوع ہرگز نہیں ہے اور نہ اس پر ہمیں کسی سائنسی رہ نمائی کی ضرورت ہے۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تمام تر آفات، حادثات اور سانحات یا اچھے برے حالات کے لیے اب یہ دریافت شدہ ذرہ ذمہ دار ہوگا؟ ہرگز نہیں، لہٰذا یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ ذرہ کیا ہے؟ جسے گاڈ پارٹیکل کہا جا رہا ہے وہ دراصل ہگس بوسن ہے۔ یہ اصل نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے، ایک عرف اور کچھ نہیں۔ گاڈ پارٹیکل کا معاملہ یوں ہے کہ نوبل انعام یافتہ ماہر طبیعیات داں لیون لیڈرمین (Leon Lederman) نے 1993 میں اپنی کتاب کا نام "The Goddamn Particle: If the Universe is the

"Answer, What is the Question?" رکھا تھا مگر ان کے اڈیٹر نے اسے "God Particle" سے تبدیل کر دیا کہ اسے یہ زیادہ مناسب عنوان لگا تھا اور دوسری وجہ غالباً یہ تھی کہ اس نام کی پہلے سے کوئی اور کتاب موجود تھی۔ اس کی ایک بڑی اور قابل فہم وجہ یہ بھی ہے کہ مصنف کے نزدیک ایک ایسا ذرہ موضوع گفتگو تھا جو موجود تو ہے مگر پوشیدہ ہے، ظاہر نہیں۔ طاقت ور تو ہے مگر اسے پانا مشکل ہے۔ اور اسی لیے اس نے اسے The Goddamn Particle کا نام دیا تھا۔ (انگریزی میں Godman ایک Expletive کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جس کا God یا خدا سے کوئی تعلق نہیں) ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ Goddamn Particle ایک سب ایٹمی ذرہ ہے جو کائنات کے دیگر تمام اقسام کے مادوں، ان کی کمیت، جسامت، حجم اور اشکال طے کرتا ہے۔ لہٰذا اس ذرے کو مالک حقیقی سے وابستہ کیا جانا سراسر غلط ہے۔ یہ محض خود فریبی کہی جا سکتی ہے۔ خود پروفیسر پیٹر ہگس (Prof. Peter Higgs) اس عرف گاڈ پارٹیکل کے خلاف ہیں اور اس سے غلط فہمی پیدا ہونے کے شاکی بھی۔ ماہر طبیعیات اگرچہ اس ذرہ کو تخلیق کائنات کی اصل قرار دیتے ہیں مگر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ ماہرین اس منظم کائنات کے پس پردہ کسی خلاق ذہن اور معجزاتی قوت کی کارفرمائی کے بھی قائل ہیں۔ وہ تو کچھ اور ہی کہہ رہے ہیں، غور کیجیے کہ پروفیسر پیٹر ہگس (Prof. Peter Higgs) کے رفیق کار سر جان پولکنگ ہوم (Sir john Polking Home) کے مطابق وہ مساوات (Equations) جو زیر جوہری (Sub-atomic) تفاعل کا قدرتی حسن پیش کرتی ہیں ان میں خدائی یا مقدس چمک دیکھی جا سکتی ہے۔ اس سے وابستہ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ امریکی ماہرین طبیعیات رچرڈ فینمن (Richard Feynman) اور جارج اسموٹ (George Smoot) کو جب زیر جوہری ذرات کے طرز عمل اور کائناتی پس منظری تابانی (Cosmic Background Radiation) کے لیے نوبل انعام سے نوازا گیا تو انھوں نے اس تجربے کے حوالے سے کہا کہ انھیں ایسا لگا تھا گویا وہ خدا کے چہرے کو دیکھ رہے ہوں۔ اب کوئی اس سے یہ سمجھ بیٹھے کہ زیر جوہری تفاعل یا کائناتی پس منظری ہی خدا ہے، تو کیسی عجیب بات ہوگی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سائنس دانوں کے یہ تاثرات خدا کی خلق کردہ اس عظیم کائنات کا اعتراف کرتے ہیں۔

یہاں یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ ہم مذہبی مزاج رکھتے ہوں یا سائنسی یہ بات تو طے ہے کہ ان دونوں میں شرط غور و فکر کی ہے۔ قرآن پاک کی متعدد سورتیں ہمیں اس کی طرف متوجہ کرتی ہیں کہ ہم غور کریں اور دیکھیں کہ کیا کیا چیزیں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں اور جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے ان کو نشانیاں، دلائل اور تنبیہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچاتیں۔ یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیے کہ سائنسی تحقیقات اور مظاہر فطرت کو قابل تسخیر بنانے میں قرآنی حوالے ہماری رہ نمائی کو کافی ہیں۔ سورۃ العلق ہمارے سامنے ہے کہ ''جس نے انسان کو وہ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا'۔ ان کے علاوہ دیگر کئی اشارے موجود ہیں۔ دراصل جب تک تخلیق کو مخلوق کا درجہ دیا جاتا رہا، تحقیق و تجربات پر قدغن لگا رہا، مگر اسلام کے زیر اثر جب تحقیقاتی کام شروع ہوئے تو رخنے دور ہوئے اور ترقی کی جونئی راہیں ہموار ہوئیں ان سے زمانہ واقف ہے اور جس کا اعتراف فلپ کے ہٹی، ہنری پرین، بیروں کارادی فاکس، پروفیسر ہولٹ، مانٹگو مری واٹ، برٹرینڈ رسل، جارج سارٹن جیسے مورخین نے کشادہ دلی سے کیا ہے۔ اب کوئی علمی تحقیقات اور تسخیر مظاہر فطرت کی کوشش کرتا ہے تو اس میں یہ سوال بڑا بے معنی لگتا ہے کہ اس سے فائدہ کیا ہوگا؟ جس طرح زیر بحث تحقیق کی بابت یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں جن سے اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔ مثلاً، ہم یہ جانتے ہیں کہ اسلامی انقلاب سے قبل چاند ستارے موضوع پرستش تھے مگر اس انقلاب کے بعد ان پر مطالعے کے لیے رصد گاہیں قائم کی گئیں۔ اس طرح خلا، زمین، آسمان، سمندر اور پیڑ پودے بھی مطالعے کا موضوع بنے۔ جب امریکی خلاباز نیل آرم اسٹرانگ نے چاند پر قدم رکھا تو یہ الفاظ کہے "That is one one small step for a man, one giant leap for mankind" (ایک انسان کے لیے یہ ایک چھوٹا قدم ہے، مگر انسانیت کے لیے ایک عظیم چھلانگ ہے)۔ اس پر غور کیجیے تو بڑے معنی سامنے آئیں گے۔ دراصل حیات کا مقصد ہی ذہن کو روشن کرنا، دل و نگاہ کو کشادہ اور تدبر و تفکر کو بروئے کار لاکر مظاہر فطرت کے راز دروں تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی خالق کی عظمت کے ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ہزاروں سال کے انسانی مشاہدات، تجربات اور ایجادات نے کائناتی حوالوں یعنی زمین، آسمانوں، تاریخ انسان اور نفس انسان وغیرہ میں سے بے شمار اسرار و حقائق سے پردے اٹھائے ہیں۔ حیات و کائنات کے اسرار کو سمجھنے کے لیے سفر مسلسل جاری ہے۔ ایسے ہی سفر کا ایک اہم پڑاؤ نظام کائنات ہے۔ سوالات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، مثلاً کائنات کیا ہے؟ یہ کہاں سے آئی؟ کیا یہ ہمیشہ سے یوں ہی تھی؟ اس کا آغاز کیسے ہوا؟ کیا یہ وسعت پذیر ہے؟ اگر پہلے انتشار تھا تو اب بظاہر ترتیب کس طرح ہے؟ یہ کائنات آخر ہے کیوں؟ کیا یہ کبھی فنا ہو جائے گی؟ وقت کیا ہے؟ کیا یہ کبھی واپس جانا شروع کردے گا؟ مادہ کیا ہے اور اس کا مختصر ترین جز کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اب آیئے مضمون کے دوسرے مقصد پر نظر ڈالیں اور تنقیص سے اوپر اٹھ کر کچھ ضروری گفتگو کی جائے۔ اس سے گریز ممکن نہیں کہ حالیہ تجربہ اور تحقیق کے نتائج قدرت کے ادراک اور اس کے تئیں انسانی فکر و شعور سے عبارت ہیں، تو بہتر یہ ہے کہ ہم اس کی مبادیات سے تھوڑی آگہی حاصل کرلیں تاکہ ہم خود فریبی اور غلط فہمی کا شکار نہ بن سکیں۔

کائنات (Universe) زمین و آسمان کی تمام جان دار اور بے جان چیزوں پر مشتمل ہے۔ حالیہ تجربہ تخلیق کائنات کے اسباب و اسرار تک رسائی کی کوشش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان نے ایک قدیم عرصے سے کائنات کے آغاز و ارتقا اور اجرام فلکی پر غور کیا ہے کہ اس کے لیے یہ بڑی حیرت انگیز اور نہایت پیچیدہ حقیقت رہی ہے۔ کرۂ ارض پر سب سے پہلے اہل یونان نے کائنات کے آغاز اور اس کی ساخت پر علمی تحقیق کی اور اسے سمجھنے کی کوشش کی۔ ابوابراہیم بن جندب، تھیلز، انکسا غورث، بطلیموس کے علاوہ گلیلیو اور نیوٹن جیسے سائنس دانوں نے اس سمت کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ماہرین طبیعیات (Physicist) نے 1924 میں انتہائی طاقتور دوربینوں سے کائنات کی وسعتوں اور فضا کی گہرائیوں میں بکھری کہکشاں کا مطالعہ کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ اپنے مرکز سے ہٹ کر باہر کی طرف پھیل رہی ہے گویا یہ وسیع ہوتی چلی جا رہی ہے۔ علم طبیعیات (Physics) میں آسٹریلیا کے برائن شمڈٹ (Brian Schmidt)، اور امریکہ کے سول پرلمٹر (Saul Perlmutter) اور آدم ریس (Adam Reiss) جیسے معروف فلکی طبیعیات دانوں کو مشترکہ طور پر سوپرنووا (Supernova) کے مطالعے کے لیے نوبل انعام 2011 کا حق دار قرار دیا گیا۔ یہ مطالعہ کائنات کی از سرِ نو تفہیم میں معاون ثابت ہوا ہے۔ اس تحقیق کے دوران دو تحقیقی ٹیموں نے پچاس سے زیادہ ایسے متغیر سوپرنووا کا مطالعہ کیا جن کی روشنی امید سے کم تھی۔ یہ اشارہ تھا کہ کائنات کی وسعت کی رفتار تیز ہو رہی ہے۔ تقریباً گزشتہ ایک صدی سے یہ

سمجھا جا رہا ہے کہ کوئی 13.7 بیلین برسوں قبل رونما ہوئے بگ بینگ کے نتیجے میں یہ کائنات پھیل رہی ہے، مگر وسعت میں اس تیزی نے سب کو متحیر کر دیا ہے۔ بگ بینگ کا تصور بھی قابل گرفت رہا ہے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ 'کن فیکون' ہی دوسروں کے نزدیک بگ بینگ ہے۔ اب کوئی وہاں تک بگ بینگ کے ذریعے پہنچ رہا ہے تو پہنچنے دیجیے۔ سائنس اسی ایقان کی پیروی کرتی نظر آتی ہے اور اسی کے پیچھے پیچھے چل رہی ہے۔ دراصل یہ یا ایسی کوئی بھی سائنسی تحقیق ہمیں خدا سے مزید قریب ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ یہ مختصر مضمون اس کا متحمل نہیں کہ اس اہم نکتے پر تفصیلی بات کی جائے کہ سائنسی انقلاب کن قرآنی ہدایتوں اور احکامات کی پیروی کرتا نظر آتا ہے۔

کائنات ایک عظیم دھماکے سے وجود میں آئی یہ نظریہ پرنسٹن یونیورسٹی کے ماہرین فلکیات آرنو پنزیاس اور رابرٹ ولسن نے پیش کیا تھا جس پر انھیں 1978 میں نوبل انعام سے نوازا گیا تھا۔ اس نظریہ کے مطابق یہ کائنات تقریباً 13.7 بیلین برسوں قبل عدم سے وجود میں آئی اور آگ کے ایک گولے کی شکل میں پھٹ پڑی۔ اس بگ بینگ کے ساتھ ہی مادے، توانائیاں، اوقات اور مقامات کا وجود عمل میں آگیا۔ وہ بنیادی ذرات جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، کائنات کی اساس ہیں۔ یہ ذرات جڑ کر ایٹم بننے لگے، ایٹموں سے کہکشائیں بنیں اور ان کے ٹکڑوں سے سورج جیسے ستارے بننے لگے۔ چار ارب سال پہلے ہمارا یہ سیارہ زمین بنا اور یوں تاریخ کا آغاز ہو گیا۔ زیر بحث تجربہ نے اسی نظریہ کے مطابق حالات کو از سرنو تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تجربے کا مقصد ذرات کے درمیان اسی طرح کے ٹکراؤ یا اختلال کا پیدا کرنا تھا جو اس بگ بینگ کے سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے بعد پیدا ہوا تھا۔ ایسا خیال ہے کہ اس اختلال سے بے حرکت ذرات میں حرکت پیدا ہوئی ہوگی جس کے نتیجے میں انجماد (Condensation) ہونے لگا۔ اس طرح سب سے پہلے سدائم (Nebulae) یعنی کہر، دھند یا بادل پیدا ہوئے جو کائناتی مادے کی قدیم ترین صورت ہیں۔ اب یوں ہوا کہ انجماد کے بڑھنے سے باہمی فاصلوں میں زیادتی ہونے لگی اور سدائم ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے اور کائنات وسیع ہوتی گئی۔ اب بظاہر سدائم تو ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے مگر خود ایک سدیم کے اندرونی اجزا کے باہمی فاصلے کم ہوتے گئے لہٰذا کشش کی قوت مدافعت کی قوت پر حاوی ہوگئی اور اس میں ارتکاز (Concentration) ہونے لگا۔ نتیجتاً مرکز سے الحاق بڑھنے لگا۔ اس عمل سے مختلف ستارے پیدا ہوئے اور سورج۔ ستاروں میں بھی ان کی اپنی کشش اور مدافعت کی وجہ سے سیاروں کی پیدائش ہوئی۔ ان سیاروں میں سے ایک سے زیادہ چاند نکلے۔ ان میں سے بعض سیاروں پر زندگی کے موافق حالات پیدا ہوئے لہٰذا جمادات، نباتات، حیوانات اور پھر انسان ظہور پذیر ہوا اور اسے علم کے خزانے کی کنجی عطا کی گئی۔ اب یہ اس پر منحصر تھا کہ وہ اس کنجی سے عقل کے دروازے کھولے یا اس پر قفل پڑا رہنے دے۔ حالیہ تجربہ پروٹون کولیژن ٹسٹ (Proton Collision Test) یا لارج ہیڈرن کولائیڈر (Large Hadron Collider) اسی کنجی سے عقل کے در وا کرنے کی کوشش پر بڑھتے قدم ہیں۔

CERN میں نصب لارج ہیڈرن کولائیڈر مشین کا مقصد باریک ذرات کے مابین ٹکراؤ کے اثرات کا مطالعہ ہے جب کہ وہ روشنی کی رفتار سے سفر کر رہے ہوں۔ اسی بنا پر اسے Large Hadron Collider (LHC) کا نام دیا گیا ہے۔ Hadron سے مراد پروٹون کا وہ سب ایٹمی ذرہ ہے جو اس میں مستعمل ہے اور Collider ان ذرات کو پاش پاش کرتا ہے۔ ایسا کرنے کے لیے ایک چھوٹے چھلے (Ring) میں پروٹون کی دو شعاعوں کو بہت تیزی سے گزارا جاتا ہے جو ایک دوسرے کی متضاد سمتوں میں سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ ایک بار ان دو شعاعوں کا پائپ میں گزر شروع ہو جاتا ہے تو پھر ان کی رفتار روشنی کی رفتار کے 99.99 99 فیصد کے برابر ہو جاتی ہے۔ چار مختلف نقطوں پر ٹکراؤ کی صورت پیدا کی جاتی ہے۔ چار سراغ رساں نظام (Detector Systems) ان ذرات کو نشان زد کرتے ہوئے ان کے خواص کا پتہ لگاتے ہیں۔ اس مشین سے پروٹون شعاعوں کی 600 میلین ٹکراؤ فی سکنڈ پیدا ہوتی ہے۔ اس عمل میں سورج سے 100,000 گنا زیادہ حرارت خارج ہوتی ہے اور بگ بینگ کے فوراً بعد والی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اس کا تصور 80 کی دہائی میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ 1,600 انتہائی طاقت ور مقناطیسوں سے گھری ہوئی ہے۔ امدادی عملہ اور کنٹرول سسٹمز زمین کے اوپر موجود ہیں۔ یہ تقریباً 2,000 ٹن وزن کا ہے یعنی پانچ جمبو جیٹس کے برابر اور 500 ٹن کے دو تانبے کے سلنڈر (Barrel) ہیں۔ ہر ایک سلنڈر Statue of Liberty سے دوگنا وزن کا ہے۔ LHC کے چار تجربوں میں ATLAS، CMS، ALICE اور LHCb شامل ہیں۔ اس سمت مزید پیش رفت کے لیے 31 میل لمبی اور دو غیر معمولی نوعیت کے 'Guns' سے لیس ایک بڑی مشین انٹرنیشنل لینیئر کولائیڈر (International Linear Collider) الیکٹرانس اور اینٹی میٹر کے ذرات یعنی پوزی ٹرونس (Positrons) کو ٹکرانے سے قبل ہی اسے روشنی کی رفتار عطا کرے گی۔ اس مشین کے تجربات زائد پھیلاؤ (طول و عرض)، کشش ثقل کی ابتدا اور بگ بینگ نظریہ کی مزید وضاحت کر سکیں گے۔ اس مشین کو آئن سٹائن ٹیلی سکوپ بھی کہا جا رہا ہے۔ اس سے LHC کے تجربات پر مزید روشنی پڑے گی۔ LHC کی مدت کار آئندہ 15 برسوں تک باقی رہے گی۔

گزشتہ 25 برسوں کے دوران ذراتی طبیعیات (Particle Physics) میں جو کامرانیاں حاصل ہوئیں ان میں موجودہ دریافت کی بڑی اہمیت ہے۔ دراصل ہگس بوسن طبیعیات کے اسٹینڈرڈ ماڈل مفروضے (Standard Model Theory) کا آخری لا پتہ ٹکڑا ہے جو کائنات کے بنیادی تخلیقی ڈھانچے کی وضاحت کر سکتا ہے۔ یہ مفروضہ کائنات کو اس کی کلیت عطا کرنے والے ذرات، کشش یا قوت اور تفاعل کی تشریح کرتا ہے۔ اس ذرے کی بابت یہ خیال ہے کہ اس نے دوسرے بنیادی ذرات کی تشکیل کی اور انھیں کمیت عطا کی۔ اس بنیادی ذرے کے بغیر کشش ثقل ہوتی اور نہ یہ عظیم کائنات۔ 2006 میں گیلا پا گول آئس لینڈ، اکواڈور کی چوٹی کانفرنس برائے علم طبیعیات کو منعقد کرنے والے کارلوس مانٹو فر کے مطابق کائنات کی توسیع کو حرکت عطا کرنے والی ڈارک میٹر (Dark Matter) جس سے کائنات کے 25 فیصد مادے کی تشکیل ہوئی ہے مگر اسے کبھی دیکھا نہیں گیا، اس کے متعلق بھی اس تجربے سے معلومات حاصل کی جا سکیں گی۔ اسی طرح ڈارک انرجی (Dark Energy) جو کائنات کے 70 فیصد مادے کو محیط ہے مگر اسے بھی کبھی مقام زد نہیں کیا جا سکا۔ اب تک اسٹینڈرڈ ماڈل سے کائنات کی صرف چار فیصد ڈارک انرجی یا ڈارک میٹر کے متعلق باتیں سمجھ میں آسکی ہیں۔ ان کے علاوہ اینٹی میٹر (Anti Matter) اور کشش ثقل کی بھی ابھی پوری طرح وضاحت نہیں ہو پائی ہے۔ اسی طور جب کسی شے کی کمیت کے ذریعے (Source) کا صحیح علم ہو جائے گا تو اسے بہ آسانی ہلکا کیا جا سکے گا اور اس کی نقل مکانی میں کم طاقت کا استعمال ہوگا جس سے توانائی میں بچت ہوگی۔ اس کا اطلاق سٹیلائٹ کے ساتھ ساتھ نقل و حرکت کے دیگر ذرائع پر بھی ہو سکے گا۔ امید ہے کہ یہ تحقیق علم طبیعیات کے ایک نئے دور میں داخلے کا سبب بنے گی۔

برطانوی ماہر طبیعیات پروفیسر پیٹر ہگس (PeterHiggs) نے 1960 کی دہائی میں کمیت کو بیان کرتے ہوئے اس ذرے کی بابت خبر دی تھی۔ 1964 میں ہگس، براؤٹ (Brout) اور انگلرٹ (Englert) نے اس ذرہ کو تمام مادوں کی اہم خصوصیت یعنی کمیت (Mass) کی وجہ بتایا تھا۔ Boson (بوسون) کشش بردار ذرہ ہے جس کا نام ہندستانی سائنس داں ستیندر ناتھ بوس کے نام پر رکھا گیا ہے۔ بوس البرٹ آئن سٹائن کے ساتھ 1920 کی دہائی میں کوانٹم میکانکس پر کار ہائے نمایاں کے لیے یاد کیے جاتے ہیں اور روشنی کی ذرات کے جیسی خصوصیات پر نظریہ پیش کرنے کا انھیں شرف حاصل ہے۔ سرن کے اس تجربے نے اس عظیم سائنس داں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ حالیہ دریافت کے قبل اس کی تجرباتی سطح پر پہلے کبھی توثیق نہیں کی جا سکی تھی۔ اگر اخذ شدہ نتائج صحیح ثابت ہوئے تو علم طبیعیات کے ایک پیچیدہ اور اہم مسئلہ اسٹینڈرڈ ماڈل کی وضاحت ہو سکے گی۔ گزشتہ 30 برسوں میں سائنس داں اس پہلو اور اس طریقۂ کار کو سمجھنے اور اس کی تشریح کے لیے کوشاں ہیں جس کے تحت بنیادی کمیت پیدا ہوتی ہے۔ اس حوالے سے متعدد مفروضے پیش تو کیے گئے مگر موجودہ تحقیق سے قبل اس کا تجرباتی مشاہدہ نہیں کیا جا سکا تھا۔ ذراتی طبیعیات کا اسٹینڈرڈ ماڈل خرد بینی مادوں (Microscopic Matter) سے متعلق ہے۔ مادہ کوارکوں (Quarks) اور ہلکیوں (Leptones) پر مشتمل ہوتا ہے۔ بنیادی ذرات کے درمیان جو قوتیں عمل پیرا ہوتی ہیں وہ مختلف اقسام کے بوسیوں (Bosons) کے تبادلے سے پیدا ہوتی ہیں۔ تین کوارکوں کے باہمی اتحاد سے پروٹون اور نیوٹرون بنتے ہیں۔ نیوٹرون اور پروٹون آپس میں مل کر مرکزے (Nuclei) کی تشکیل کرتے ہیں۔ Leptones دو حالتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ برقی اثر والے اور غیر برقی اثر والے۔ غیر برقی اثر والے کو Nutrinos کہا جاتا ہے اور یہ مادہ کے ساتھ شاید ہی کبھی تفاعل کرتے ہیں۔ برقی اثر کے حامل ہلکیوں میں سب سے ہلکا الکٹرون ہوتا ہے جس پر منفی برقی اثر ہوتا ہے وہ مثبت برقی اثر والے مرکزے کی طرف کشش پا جاتے ہیں اور مادہ کی تشکیل کرتے ہیں۔

اسٹینڈرڈ ماڈل ایک انتہائی کامیاب مفروضہ ہے مگر اس میں کچھ شگاف بھی ہیں جن میں سب سے اہم یہ سوال ہے کہ کیوں کچھ ذرات میں کمیت ہے اور کچھ میں نہیں۔ ہگس اور دیگر رفقائے کار کے ذریعے بحث طلب بوسون کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بگ بینگ سے پیدا ہونے والے غیر مرئی اور حاظر و ناظر دائرے میں موجود ہے۔ اپنے اپنے طور پر آزادانہ تحقیق کرنے والی LHC کی دو بڑی سراغ رساں تجربہ گاہیں اٹلس (Atlas) کی سربراہ فیبیو لا گیانوٹی (Fabiola Gianotti) نے اپنے 3,000 سائنس دانوں کے ساتھ اور سی ایم ایس (CMS) کے سربراہ جوئے انکین ڈیلا (Joe Incandela) نے اپنے 2,100 سائنس دانوں کے ہمراہ اس حاصل شدہ نتیجہ کو سگما 5 (Sigma 5) درجہ پر کامیابی حاصل کرنے کی بات کہی ہے۔ دو علاحدہ رپورٹوں میں کمیتی خط 126-125 گیگا الکٹرون وولٹ (GeV) میں اس ذرے کو دریافت کیا گیا ہے، یعنی یہ تجربہ ایجاد کی حد تک پہنچ سکتا ہے مگر ابھی مزید تجربات درکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ CERN کے ڈائرکٹر رالف ہیوئر (Rolf Heuer) نے اسے A Higgs Boson کہا ہے، The Higgs Boson نہیں،

27 میل لمبی سرنگ میں لارج ہیڈرن کولائیڈر

لہٰذا یہ مطلوبہ ہگس بوسن جیسا ہی ہے یا واقعی وہی ہے اس پر حتمی فیصلہ ابھی باقی ہے۔ شاید 2015 تک یہ ممکن ہو سکے۔ یہ ذرہ ہر ایٹم کے مرکز میں موجود پروٹون سے 133 گنا وزنی ہے۔ سائنس داں تقریباً گزشتہ چار صدیوں سے ہگس بوسن کی تلاش میں ہیں تا کہ مادہ کے بنیادی اجزا اور باہمی تفاعل کی بابت معلومات حاصل کر سکیں جب کہ اس شعبے میں سائنسی تلاش کوئی 2,400 برسوں قبل یونانی فلسفی ڈیموکریٹس (Democritus) کے مفروضے سے شروع ہوئی تھی کہ ہر شے غیر مرئی ذرات سے بنی ہے۔

اس تجربہ میں ہندستان نے بھی خاطر خواہ عملی تعاون دیا ہے۔ ہمارے 100 سے زائد سائنس داں اس تحقیق کا حصہ ہیں۔ ہمارا ملک کنیڈا، جاپان، روس، اور امریکہ کے ساتھ لارج ہیڈرن کولائیڈر کے لیے کئی اہم پرزے تیار کرنے میں شامل رہا ہے۔ Dipoles اور Quadrupoles نام کے مصلح مقناطیس ہندستانی کمپنیوں سے بھیجے گئے ہیں اور مقناطیسی چھلے جن سے پروٹون کا گزر ہوتا ہے انھیں سنبھالنے کے لیے جیکس (Jacks) محکمہ اٹامک انرجی (DAE) کے ذریعہ فراہم کیے گئے ہیں۔ ایسے جیکس کی ڈیزائننگ اندور میں واقع راجا رمنا سنٹر فار ایڈوانسڈ ٹکنالوجی نے کی ہے اور انھیں بنگلور واقع کرلوسکر الیکٹرک کمپنی لمیٹڈ اور بھوپال کی کرامپٹن گریوس لمیٹڈ نے بنایا ہے۔ عاجل (Accelerator) کے حفاظتی نظام کے لیے Quench Heater، Quench Detection، Power Supplies، Electronics، Circuit Breaker اور Local Protection Units بھی فراہم کیے ہیں۔ ان کے علاوہ بھابھا اٹامک ریسرچ سنٹر (ٹرامبے)، ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامنٹل ریسرچ (ممبئی)، بنارس ہندو یونیورسٹی (وارانسی)، ساہا انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیئر فیزکس (کولکاتا) اور دہلی، پنجاب، وجے پور کی یونیورسیٹیاں بھی اس پروجکٹ کا حصہ ہیں۔

اس تحقیق و تجربہ کے قطعاً یہ مقصد نہیں ہے کہ دریافت شدہ ذرہ خدا کا متبادل ہے یا اس کا کوئی حصہ ہے یا یہ خالق کے وجود سے انکار ہے، بلکہ اس تحقیق کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس تجربہ سے طبیعیات کے ایک اہم مفروضے اسٹینڈرڈ ماڈل کے لاپتہ ٹکڑے کی کمی پوری ہو جائے۔ اس مفروضے کے ذریعے دیگر ذرات کا پتہ لگ چکا ہے۔ اب اس لاپتہ ہگس بوسون کی دریافت سے کائنات کے دوسرے معمے مثلاً ڈارک میٹر، ڈارک انرجی، اینٹی میٹر، ماورائی تناسب اور ہم آہنگی (Supersymmetry) کے علاوہ کشش ثقل (Gravitation) کو بھی بہتر طریقے سے سمجھا جا سکے گا۔ یہ ذرہ خدا کی تخلیق کردہ اس کائنات کا بہت چھوٹا مگر نہایت اہم ذرہ ہے۔ لہٰذا یہ مناسب ہوگا کہ ہم اس پر اشتعال انگیز تحریر و تقریر سے گریز کریں اور علمی گفتگو کو راہ دیں تا کہ غلط فہمیوں کا شکار نہ ہو پائیں۔ جب یکساں طور پر بے حرکت پھیلے ہوئے ذرات میں خلل سے ارتقا اور کائنات کا آغاز ہوا اور مختلف صورتیں پیدا ہوتی چلی گئیں، ٹھیک اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کا انجام بھی کسی خاص وقت ضرور ہوگا۔ مگر کب اور کیسے، کیا کسی سائنسی تجربے سے یا قادر مطلق کے اشارے سے؟ یہ پورے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کائنات کسی انسان کی تخلیق ہے اور نہ ہی اسے کوئی انسان ختم کر سکتا ہے۔ ہاں، اس کے اسباب و اسرار تک رسائی کی تڑپ عقل روحانی سے سرشار ہر انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ ہمارا مقصد اس کائنات کی مکمل تشریح ہے جس میں ہماری بود و باش ہے۔

(مضمون نگار انڈین جرنل آف ایگریکلچرل سائنسز کے مدیر ہیں)

□

Dr. Obaidur Rahman, B 31, Shaheen Bagh, Lane 7, opp. Six Ten General Stores, Jamia Nagar, New Delhi-110 025

ادارہ

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ نئی دہلی 110025

ایگزیکیوٹیو بورڈ کی XXXIV ویں میٹنگ کی روداد

تاریخ: 18.06.2012 وقت: 03.00 بجے سہ پہر مقام: کانفرنس روم، فروغ اردو بھون، جسولہ، نئی دہلی

میٹنگ میں موجود قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی، ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، پرنسل پبلی کیشن آفیسر جناب نسیم احمد، ایگزیکیوٹیو بورڈ کے ممبر شیخ علیم الدین اسعدی، پروفیسر اختر الواسع، پی کے حسین مداور اور سید وقار الدین

حاضرین:

1 پروفیسر وسیم بریلوی (وائس چیئرمین، قومی اردو کونسل) : صدر مجلس

2 پروفیسر اختر الواسع : ممبر

3 جناب سید وقار الدین : ممبر

4 جناب شیخ علیم الدین اسعدی : ممبر

5 ڈاکٹر پی ایس حسین مداوور : خصوصی مدعو

6 ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، ڈائرکٹر، قومی اردو کونسل : ممبر سکریٹری

وزارتی نمائندگان

1 جناب نوین سوائی، ڈائرکٹر (آئی ایف ڈی)

آغاز میں ڈائرکٹر، قومی اردو کونسل نے وائس چیئرمین اور ایگزیکیوٹیو بورڈ کے ممبروں کا خیر مقدم کیا۔ جس کے بعد ایجنڈا آئٹموں پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔

آئٹم نمبر XXXIV.1: روداد کی توثیق

ایگزیکیوٹیو بورڈ کی XXXIII ویں میٹنگ کی روداد، جو 24 جنوری 2012 کو منعقد ہوئی تھی، کی تصدیق کی گئی اور اس کو ریکارڈ کیا گیا۔

آئٹم نمبر XXXIV.2: روداد سے متعلق کارروائی کی رپورٹ

24 جنوری 2012 کو منعقد ہوئی ایگزیکیوٹیو بورڈ کی میٹنگ کی روداد سے متعلق کارروائی کی رپورٹ کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اور اس کو ریکارڈ کیا گیا۔

آئٹم نمبر XXXIII.6 پر تبادلۂ خیال کے دوران اس بات پر آمادگی ظاہر کی گئی کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ملازمین کے لیے طبی سہولیات سے متعلق تجاویز کو ہیلتھ انشورینس اسکیمس (Health Insurance Schmes) کے توسط سے نافذ العمل بنایا جاسکتا اور ہیلتھ انشورینس اسکیمس (Health Insurance Schmes) کے تحت ان کو یہ سہولیات بہم پہنچائی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ قومی کونسل کے سبکدوش اور موجودہ ملازمین کو اس کی بابت مطلع کیا جائے۔

آئٹم نمبر XXXIII.7 سے متعلق۔ کونسل کی مطبوعات کو اسٹور کرنے کے لیے پٹے پر جگہ حاصل کرنے سے متعلق تجویز کے سلسلے میں یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ آفس کے نزدیکی علاقہ اوکھلا میں کرایے پر جگہ حاصل کرنے کی غرض سے اردو اخبارات میں اشتہار دیا جائے۔

آئٹم نمبر XXXIII.9 سے متعلق: ذیلی کمیٹیوں / پینلوں کی تشکیل۔ اراکین (ممبران) نے خواہش ظاہر کی کہ ذیلی کمیٹیوں کا مکمل طور پر جائزہ لیا جائے اور انھیں معقول طریقے سے ازسرِنو تشکیل دیا جائے۔ فیصلہ کیا گیا کہ ذولسانی پینل (bilingualpanels) بھی بنائے جائیں۔

ممبران نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ ایگزیکیوٹیو بورڈ کے کم سے کم دو ممبران کو فائننس کمیٹی (FinanceCommittee) کے خصوصی مدعوئین کی حیثیت سے شامل کیا جائے۔

آئٹم نمبر XXXIV.3: کونسل کی سالانہ رپورٹ برائے سال 2011-12 کے مسودے پر غور کرنا اور توثیق کرنا۔

ایگزیکیوٹیو بورڈ نے کونسل کی سالانہ رپورٹ برائے سال 2011-12 کی توثیق کی اور اسے منظور کیا۔

آئٹم نمبر XXXIV.4: نظرثانی شدہ تخمینہ برائے سال 2012-13 اور بجٹ تخمینہ برائے 2013-14 کا جائزہ اور توثیق۔

وزارت کی طرف سے سال برائے 2012-13 کے لیے مختص کیے گئے 2800 لاکھ

روپے کے بجٹ پر بحث کی گئی جو گذشتہ سال وزارت کی طرف سے دستیاب کرائے گئے کل بجٹ 3300 لاکھ روپے سے بھی کم ہے۔ ممبران نے اتفاق کیا کہ کونسل نے 3250 لاکھ روپے کی وزارت کے تجدید شدہ بجٹ کے حساب سے MoU پیش کرتے ہوئے بجٹ کا جو مجوزہ 5000 لاکھ روپے کا بجٹ پیش کیا تھا اس پر قائم رہا جائے اور RE مرحلے پر 1750 لاکھ روپے کی اضافی رقم کے لیے کوشش کی جائے۔ اور اگر ممکن ہو تو ایگزیکیٹو بورڈ کے ممبران اضافی رقم کے مطالبے پر زور دینے کے لیے مناسب سطح پر کوشش کریں۔

اس لیے بورڈ نے منظور کیا ہے کہ:

(الف) نظر ثانی شدہ تخمینہ سال 13-2012 کے لیے 5000 لاکھ روپے اس امید کے ساتھ کہ وزارت گرانٹ ان ایڈ (grant-in-aid) کی رقم 4750 لاکھ روپے مہیا کرے گی اور باقی ماندہ 450 لاکھ روپے داخلی آمدنی سے پورا کیا جائے گا۔

(ب) بجٹ تخمینہ 14-2013 کے لیے 7500 لاکھ روپے کا مطالبہ بارھویں 5 سالہ منصوبے کے تخمینے کے تناظر میں اس امید کے ساتھ ہے کہ وزارت 7000 لاکھ روپے فراہم کرے گی اور باقی 500 لاکھ روپے داخلی آمدنی سے فراہم کیے جائیں گے۔

آئٹم منصوبے کے لحاظ سے اخراجات سال برائے 12-2011، آر ای (RE) برائے 13-2012 اور بی ای (BE) سال برائے 14-2013 حسب ذیل ہیں:

آر۔ای 13-2012 اور بی۔ای 14-2013

	اصل	بی۔ای	آر۔ای	بی۔ای
آمدنی	2011-12	2012-13	2012-13	2013-14
1. گرانٹ ان ایڈ	3350.00	2800.00	4550.00	7000.00
2. آمدنی داخلی ذرائع سے	433.00	450.00	450.00	500.00
مجموعی	**3783.00**	**3250.00**	**5000.00**	**7500.00**
منصوبہ کا نام-اخراجات				
	اصل	**بی ای**	**آر ای**	**بی ای**
	2011-12	**2012-13**	**2012-13**	**2013-14**
انتظامی اور آفس اخراجات				
الف۔انتظامی	210.56	210.00	212.00	350.00
ب۔آفس اخراجات	142.62	103.00	143.00	200.00
ج۔دوسرے اخراجات	100.60	90.00	207.00	460.00
د۔راس المال اخراجات	14.56	10.00	14.00	20.00
(Capital Expendt)				
مجموعی	**468.34**	**413.00**	**576.00**	**1030.00**
اردو کے فروغ کے لیے سرگرمیاں/پروجیکٹ				
الف۔ CAMDTP مراکز	1351.52	1200.00	1800.00	2200.00
کا قیام				
خطاطی اور گرافک ڈیزائن	54.24	54.00	201.00	225.00
گرانٹ ان ایڈ	121.88	152.00	199.00	300.00
مجموعی	**1527.64**	**1406.00**	**2200.00**	**2725.00**
طباعت، کتابوں کا فروغ اور تعلیمی پروجیکٹ				
a) کتابوں کی طباعت	98.39	50.00	100.00	150.00
b) میگزین کی طباعت	129.23	75.00	125.00	175.00
c) طباعت کے لیے امداد	43.89	0.00	0.00	50.00
d) کتابوں کا فروغ	84-43	60.00	60.00	80.00
e) سیمینار، سمپوزیم، ورکشاپ	12.69	20.00	20.00	30.00
f) تعلیمی منصوبے/اشتراک	36.73	40.00	63.00	80.00
g) اردو صحافت کے لیے قلیل مدتی نصاب	0.29	6.00	6.00	12.00
h) ٹی وی پر اردو دنیا کا پروڈکشن اور نشریات	34.37	60.00	60.00	80.00
i) پیشہ ورانہ نصاب	0.00	50.00	237.00	500.00
مجموعی	**440.02**	**361.00**	**671.00**	**1157.00**
فاصلاتی تعلیم (اردو)	**678.33**	**558.00**	**811.00**	**1100.00**
عربی/فارسی کے فروغ کے لیے سرگرمیاں/پروجیکٹ				
الف۔ گرانٹ ان ایڈ	2.93	3.00	3.00	6.00
ب۔ ڈپلوما ایجوکیشن عربی میں	387.39	297.00	439.00	700.00
ج۔ سرٹیفکیٹ فنکشنل عربی میں	211.00	200.00	278.00	650.00
د۔ ڈپلوما فارسی میں	0.00	0.00	0.00	100.00
مجموعی	**601.32**	**500.00**	**720.00**	**1456.00**
قرض اور پیشگی	**36.10**	**0.00**	**10.00**	**20.00**
آفس عمارت کی تعمیر	**1.14**	**12.00**	**12.00**	**12.00**
انسلا کی خدمت/سیکوریٹی ادائیگی	**0.47**	**0.00**	**0.00**	**0.00**
کل	**7353.36**	**3250.00**	**5000.00**	**7500.00**

کونسل کے ممبران نے سال 12-2011 میں مجموعی مختص رقم 3350 لاکھ روپے میں آفس اخراجات کو 20% اجازت ہونے کے باوجود مثالی طور پر 15%-14 تک ہی رکھے جانے کی ستائش کی۔

آئٹم نمبر XXXIV.5: 20/ مارچ 2012 کو منعقدہ مالیاتی کمیٹی کی میٹنگ کی روداد کا جائزہ

بورڈ نے مالیاتی کمیٹی کی 20 مارچ 2012 کو منعقدہ میٹنگ کی روداد کو منظور کیا اور اس میٹنگ میں لیے گئے فیصلوں کی توثیق کی۔

آئٹم نمبر XXXIV.6: مورخہ 04/ اپریل 2012 سے ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کی بحیثیت ڈائرکٹر تقرری کی توثیق کی گئی

بورڈ نے ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کو بحیثیت ڈائرکٹر NCPUL استقبال کیا اور میمورنڈم آف ایسوسی ایشن (MoA) کے تحت حاصل انتظامی اور مالی اختیار کی تصدیق کی۔ بورڈ نے اردو کے فروغ کے لیے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر ایم حمید اللہ بھٹ کی خدمات کو مستحسن قرار دیا۔

آئٹم نمبر XXXIV.7: سابق ڈائرکٹر NCPUL، ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کے 23 فروری 2012 کو ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد NCPUL کی جانب سے واجب الادا پنشن کی بابت عارضی پنشن جاری کرنے پر غور۔

بورڈ نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ اس معاملے کو وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کو اس تجویز پر جلد از جلد کارروائی کرنے کے لیے کہا جائے تاکہ ڈاکٹر بھٹ کے لیے عارضی پنشن جاری کی جا سکے۔

آئٹم نمبر XXXIV.8: NMCME اور اس کی ذیلی کمیٹیوں کی میٹنگ کے لیے NMCME کو ضروری سہولیات کی فراہمی سے متعلق تجویز

بورڈ نے پانچ ذیلی کمیٹیوں اوران کی اسٹینڈنگ کمیٹی کو کونسل کی طرف سے ضروری سہولیات فراہم کیے جانے کی توثیق کردی ہے۔

آئٹم نمبر XXXIV.9: کونسل کوایسے طلبا کے اندراج، محاکمہ اورمصدقہ لیاقتوں سے نوازنے سے متعلق غورکرنے اوراس کے مقاصد کے لیے بااختیار بنانا تاکہ اس کے تحت اردو زبان کے پری ڈگری سطح کے کورس میں اور پیشہ ورانہ کورسز میں درج طلبا کو وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے ادارہ نیشنل ووکیشنل ایجوکیشن کوالیفکیشن فریم ورک (National Vocational Education Qualification Framework) سے جوڑنا اورانھیں میمورنڈم آف ایسوسی ایشن (Memorandum of Association) میں شامل کرنا

بورڈ نے عزم کیا ہے کہ مندرجہ ذیل اہداف کومیمورنڈم آف ایسوسی ایشن (MoA) کے پیراگراف 25 میں ضابطہ نمبر 3 کے تحت شامل کیے جانے کے سلسلے میں مذکورہ وزارت سے رابطہ کیا جائے۔

1. کونسل کو اردو زبان کے پری ڈگری سطح کے کورس اور پیشہ ورانہ کورسز میں درج طلبا کے اندراج، محاکمہ اور انھیں متعلقہ اسناد سے نوازنے اوران کورسز کووزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے ادارہ نیشنل ووکیشنل ایجوکیشن کوالیفکیشن فریم ورک (National Vocational Education Qualification Framework) سے جوڑنے کے لیے بااختیار بنانا۔
2. عام، پیشہ ورانہ اور جاری تعلیم کے مقاصد کے لیے مطالعہ کے وسیع اور مختلف النوع نصابات تیار کرنا یا مشورہ دینا۔ خواہ وہ پری ڈگری سطح تک کے کورسز (بہ شمول سرٹیفکیٹس/ڈپلوما) ہوں یا اردو کی تعلیم کے ذریعے بنا سرٹیفکیٹ زندگی اور ملازمت کی بہتری کے لیے ہوں۔
3. طلبا کے لیے NVEQF کے تناظر میں اردو میں پیشہ ورانہ کورسز پیش کرنا یا تیار کرنا اور انھیں اس سلسلے میں صلاح دینا۔
4. پرنٹ میڈیا اور غیر پرنٹ میڈیا استعمال کرتے ہوئے اردو میں مطالعہ کے لیے مواد تیار کرنا۔
5. لرننگ سپورٹ یا اسٹڈی سنٹرس کے صحیح طریقے سے مصروف کار رہنے کے لیے علاقائی مراکز کا قیام کرنا۔
6. اردو زبان کے ذریعے ملک میں رسمی/غیر رسمی/پیشہ ورانہ تعلیم کے مربوط نظام تیار کرنے میں مرکزی اور نمایاں کردار ادا کرنا اور ریاستوں کو نصابی مواد سے مطابقت/مواخذت کرنے اور اردو زبان میں کورسز تیار کرنے میں مدد دینا۔
7. ایسی ایجنسیوں اور ایسے اداروں سے تعلق پیدا کرنا اور ایسے سپورٹ سنٹرس یا اسٹڈی سنٹرس کو تسلیم کرنا جو طلبا کو تعلیمی تعاون دینا چاہتے ہوں۔
8. طلبا کے اندراج، امتحانات میں شامل ہونے کے لیے ان کی اہلیت، اداروں کے طرز عمل اور دوسرے ضابطے سے ہم آہنگ اور تدریسی، استعدادی معائنہ اور تصدیق کے لیے مجاز اتھارٹی جو سوسائٹی میں مضمر ہے، کی مناسب سرانجام دہی کے لیے ضروری ہے، کے لیے قواعد وضوابط طے کرنا۔
9. فیس اور دوسرے مطالبات کے لیے جو قواعد کے اعتبار سے طے کیے گئے ہوں یا ان میں وقتاً فوقتاً ترمیم کی گئی ہو، کا مطالبہ کرنا۔
10. کونسل کے مقاصد واہداف کے تناظر میں مطالعات، تحقیق اور سروے کرنا۔
11. اردو میڈیم کے ذریعے باضابطہ یا بے ضابطہ (اوپن)/فاصلاتی نظام تعلیم کے معیار کی نشاندہی کرنا اور فروغ دینا جسے تحقیق اور ترقی کے ذریعے ملک کے مختلف علاقوں میں قائم کیا جاسکے نیز اپنی شناخت قائم رکھتے ہوئے باضابطہ نظام تعلیم کے مطابق تعلیم کا معیار برقرار رکھنا۔
12. ریسرچ اور لرننگ ریسورس لائبریری (Research and Learning Resources Library) کا قیام جو کتابوں کے علاوہ دیگر ذرائع میں بھی دستیاب ہو۔
13. ایسے تمام جائز کام اور چیزیں کرنا خواہ وہ مندرجہ بالا اختیارات کے مطابق ہو یا نہ ہولیکن سوسائٹی کے اغراض ومقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری ہوں۔
14. ان اغراض ومقاصد کا حصول سوسائٹی کے مشن کی تکمیل میں معاون ہوگا، جس کا مقصد عمومی قومی پالیسی دستاویزات کے تناظر میں عوامی امنگوں/اردو کے ذریعے اسکول کی سطح سے پری ڈگری سطح تک برمحل، مسلسل اور تعمیری تعلیم باضابطہ/اوپن/فاصلاتی نظام تعلیم کو فروغ ملے گا اور جو درج ذیل معاملات میں بھی معاون ہوگا:

☆ تعلیم کی آفاقیت ☆ سماج میں عدل ومساوات کا فروغ
☆ ایک تعلیم یافتہ سماج کی ترقی

بورڈ نے آمادگی ظاہر کی کہ وزارت سے درخواست کی جائے کہ وہ سی بی ایس ای (CBSE) کے چیئرمین سے اس کورس کے جواز کے لیے رابطہ قائم کرے۔

آئٹم نمبر XXXIV.10: کمیٹی برائے تکنیکی تعلیم (Committee on Technical Education) کی XXXI ویں میٹنگ منعقدہ 03 مئی 2012 کی روداد کا جائزہ

بورڈ نے کمیٹی برائے تکنیکی تعلیم کی XXXI ویں میٹنگ منعقدہ 03 مئی 2012 کی روداد کومنظور کیا اوراس کی توثیق کی اوراس کے تحت لیے گئے فیصلوں کو منظور کیا اور سفارش کی کہ معائنہ کرنے والی ٹیم میں ایک ریجنل ایگزیکیٹیو بورڈ ممبر شامل کیا جائے۔

1. کمیٹی نے سفارش کی کہ ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی جائے جو CABA-MDTP مراکز کو بتدریج ترک کیے جانے سے متعلق ضابطوں کا جائزہ لے۔
2. ذیلی کمیٹی غیر سرکاری تنظیموں/اداروں کی درخواستوں کا جائزہ لے کر نئے کمپیوٹر مراکز کے قیام کے لیے منتخب کرے گی۔
3. ٹیکنیکل ایجوکیشن کمیٹی کی میٹنگ منعقدہ 14 مئی 2012 میں NIELIT چنڈی گڑھ کو پیشکش/اسٹیٹس رپورٹ دینے کے لیے کہا گیا تھا۔

آئٹم نمبر XXXIV.11: ٹیکنیکل ایجوکیشن کمیٹی کی XXXII ویں میٹنگ منعقدہ 14 مئی 2012 کی روداد کا جائزہ

بورڈ نے ٹیکنیکل ایجوکیشن کمیٹی کی XXXII ویں میٹنگ منعقدہ 14 مئی 2012 کی روداد کومنظور کیا اوراس کی توثیق کی اوراس موقع پر کیے گئے فیصلوں کی توثیق کی۔

NIELIT کے ساتھ میمورنڈم آف انڈر اسٹینڈ نگ (MoU) کی تجدید معائنہ اور باہمی ربط، امتحان، اساتذہ کی تنخواہ کی ادائیگی وغیرہ کے لیے NIELIT کی طرف سے تحریری طور پر مطمئن ہوجانے کے بعد کمیٹی برائے ٹیکنیکل ایجوکیشن غور کرسکتی ہے۔

آئٹم نمبر XXXIV.12: ذیلی کمیٹی برائے ٹیکنیکل ایجوکیشن کی میٹنگ منعقدہ 14 مئی 2012 کی روداد کا جائزہ

بورڈ نے ذیلی کمیٹی برائے ٹیکنیکل ایجوکیشن کی میٹنگ منعقدہ 14 مئی 2012 کی روداد منظور کیا اوراس موقع پر لیے گئے فیصلوں کی توثیق کی۔

1. 32 غیرسرکاری تنظیمیں جو تمام شرائط پر پوری اترتی تھیں انھیں معائنہ کے لیے منتخب کیا گیا۔
2. 32 غیرسرکاری تنظیموں میں سے 7 کو جولائی سیشن 13-2012 سے CABA-MDTP کھولنے کے لیے منتخب کیا گیا بشرطیکہ ان کی رپورٹ مثبت ہو۔
3. ذیلی کمیٹی نے سفارش کی کہ دس سال کے بعد بتدریج ترک کرنے کے عمل کو موجودہ ضوابط کے مطابق جاری رکھا جائے۔
4. ذیلی کمیٹی نے مزید سفارش کی کہ انڈمان اور نکوبار جزیروں اور گوا کے مراکز کو مخصوص کیس مانتے ہوئے مالی تعاون جاری رکھا جائے۔

آئٹم نمبر XXXIV.13: کونسل کے سالانہ اکاؤنٹس برائے 12-2011 پر غور کرنا اور اس کی توثیق کرنا

ایگزیکیوٹیو بورڈ نے کونسل کے سالانہ اکاؤنٹس برائے 12-2011 کو منظور کیا۔

آئٹم نمبر XXXIV.14: آفس سے باہر کے افراد کو نئے تعلیمی منصوبوں کے لیے معاہدے کے تحت رکھنے کی تجویز پر غور کرنا

بورڈ نے آمادگی ظاہر کی ہے کہ ایک اکسپرٹ کمیٹی (Expert Committee) مندرجہ ذیل تعلیمی منصوبوں کے لیے درکار افرادی قوت اور بجٹ کے تخمینے کا جائزہ لے اور اس کی رپورٹ ایگزیکیوٹیو بورڈ کی اگلی میٹنگ میں پیش کی جائے۔

منصوبوں کے نام	مطلوبہ تجربے کی نوعیت	افرادی قوت کی تعداد
اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے تعاون سے انگلش، انگلش-اردو ڈکشنری کا منصوبہ	کمپیوٹر آپریٹران پیج اردو کی جانکاری ہو	ایک (1)
آئی ٹی آئی پروجیکٹ کے مسودے کو حتمی شکل دینا	کمپیوٹر آپریٹران پیج اردو کی جانکاری ہو	ایک (1)
NCPUL کی ویب سائٹ کی نگرانی اور تجدید	پوسٹ گریجویٹ اور ویب کو تیار کرنے اور لے آؤٹ ڈیزائن کا تجربہ	ایک (1)
نئے منصوبے		
اردو وکی انسائکلوپیڈیا: موجودہ ڈاٹا کو یونی کوڈ میں تبدیل کرنا اور انہیں ویب پورٹل پر پوسٹ کرنا	یونی کوڈ میں تبدیل کرنے کا تجربہ اور اردوان پیج کی جانکاری ہو	دو (2)
بچوں کی میگزین	ایڈیٹر: ایم اے (اردو) انگلش گریجویشن سطح تک، ایڈیٹنگ اور کمپوزنگ کا تجربہ ہو	دو (2)
	کمپوزر: کمپیوٹر آپریٹر جسے ان پیج کی جانکاری ہو	ایک (1)
	آفس اٹینڈنٹ: دفتری اور کثیرالجہات کام کا تجربہ ہو	دو (2)
ای-کلاس روم اور ای-کونسلنگ NCPUL کے تمام مراکز کو ای کلاس روموں میں تبدیل کرنا اور طلبا کو کونسلنگ فراہم کرنا تاکہ وہ اپنے تعلیمی کیریئر اور ایجوکیشن کے سلسلے میں معلومات حاصل کر سکیں	کمپیوٹر سسٹم کو آپریٹ کرنے کی جانکاری، نیٹ ورکنگ اور ای-کونسلنگ صلاحیت	دو (2)

اسکرپٹ رائٹنگ، ڈائیلاگ رائٹنگ اور سینی میٹوگرافی کا کورس اردو کے رشتے کو میڈیا سے مضبوطی سے جوڑنے کے لیے	یہ منصوبہ تیاری کے مرحلے میں ہے	اس منصوبے کو اسٹڈی مراکز / NGOs / مدارس کے ذریعے چلایا جائے گا
اردو OCR (آپٹیکل کیریکٹر ریکگنیشن) منصوبہ اس میدان کے ماہر مثلاً ReadIris اور Abby کو اپنا شریک کار بنانا تاکہ وہ ہمیں اردو OCR تیار کرنے میں مدد کر سکیں۔	یہ منصوبہ تیاری کے مرحلے میں ہے	
آن لائن ڈیجیٹل لائبریری پروجیکٹ NCPUL کی بیشتر مطبوعات کو ای بک کی مختلف ہیئتوں میں ڈیجیٹل فارم میں مثلاً pdf، epub، اور djvu میں منتقل کرنا	یہ منصوبہ حالیہ دنوں میں جاری ہے	
NCPUL کے پروگرام کی نشریات دوسرے ٹی وی چینلوں پر NCPUL، 'اردو دنیا' ٹی وی پروگرام کو دوسرے چینلوں پر نشر کرنا تاکہ ملک کے دور دراز علاقے تک رسائی ہو۔	چینلوں سے تجاویز طلب کی گئی ہیں۔	
ٹرنسلیشن کورس اردو سے انگریزی ترجمہ، انگریزی سے اردو، عربی سے انگریزی، عربی سے اردو اور اردو سے عربی ترجمہ سیکھنا	یہ منصوبہ تیاری کے مرحلے میں ہے۔	یہ منصوبہ اسٹڈی مراکز / NGOs / مدارس کے ذریعے چلانا

بورڈ کو فائنینس کمیٹی کی میٹنگ منعقدہ 10 رفروری 2012 کے فیصلوں سے مطلع کیا گیا کہ جس کے تحت افرادی قوت کو ایجنسیوں کے توسط سے کام پر رکھنے اور اس عمل کو جاری رکھنے کا عزم کیا گیا۔

آئٹم نمبر XXXIV.15: یو.جی.سی. کے طرز پر ریسرچ پروجیکٹس کو ضروری ترمیمات کے ساتھ NCPUL کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ضوابط پر غور کرنا

بورڈ نے آمادگی ظاہر کی ہے کہ اس منصوبہ پر آئی سی ایچ آر، آسی ایس ایس آر اور یو.جی سی کے ساتھ مشاورت کی جائے، کارروائی ایگزیکیوٹیو بورڈ کی اگلی میٹنگ میں پیش کی جائے۔

اکیڈمک منصوبے سے متعلق ضوابط کے ایجنڈے پر بہت سے پینلوں اور ذیلی کمیٹیوں میں تبادلہ خیال کیا گیا۔ پینلوں اور ذیلی کمیٹیوں کے اراکین اس بات پر متفق تھے کہ یو.جی سی کے ضوابط کو من وعن اختیار نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ NCPUL کے منصوبوں کے مطابق ہونے چاہئیں۔ NCPUL کے منصوبوں کی نوعیت اور اس کے اختیار کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے یو.جی سی کے ضابطوں میں چند ترمیمات مطلوب ہیں۔ مختلف پینلوں اور ذیلی کمیٹیوں کے اراکین کے مشورے کے مطابق، چند ترمیمات کے ساتھ خاکہ تیار کیا گیا ہے۔ اِس شق ضمیمہ کے ساتھ منظوری کے لیے منسلک کر دیا گیا ہے۔ ترمیمات کو نمایاں کرنے کے لیے ان کے نیچے لکیریں کھینچی گئی ہیں۔

صدر کے اظہار تشکر کے ساتھ میٹنگ اختتام پذیر ہوئی۔

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)
ڈائرکٹر، قومی اردو کونسل

(پروفیسر وسیم بریلوی)
وائس چیرمین، قومی اردو کونسل

درس بلاغت

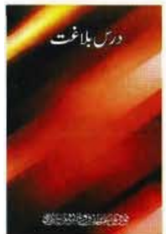

مصنف: ادارہ

صفحات: 205، قیمت: 55 روپے

ناشر: قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر عبدالرشید، A-187/3، شاہین باغ نئی دہلی

قومی اردو کونسل کی مطبوعات کی اہمیت، وقعت اور مقبولیت کا اندازہ اس کی تعداد اشاعت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ 'درسِ بلاغت' کی پہلی تاریخ اشاعت 1981 ہے۔ اس وقت سے اب تک شائقین ادب کی مانگ وطلب کا لحاظ کرتے ہوئے چوتھی بار 2012 میں طبع ہوئی۔ چار بار شائع ہونے کے بعد یہ تصنیف کونسل کے سلسلۂ مطبوعات کی دوسو چھبیسویں کڑی ہے۔

بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

''بلاغت کسی علم کا نام نہیں ہے۔ بلکہ بلاغت ایک تصور ہے۔ بلاغت اس صورتحال کی تصوراتی شکل کو کہا جاتا ہے جو زبان کو حسن اور خوبصورتی کے ساتھ استعمال کرنے سے ظہور میں آتی ہے۔ بلاغت کی کیفیت کلام میں کس طرح پیدا کی جائے، اس سوال کا جواب حاصل کرنے میں بعض علوم کارآمد ہیں۔ ان علوم کو عام طور پر علوم بلاغت کہا جاتا ہے۔''

تصنیف 'درس بلاغت' ان جملہ علوم اور ان کے اقسام و جہات کو محیط ہے جن کے التزام سے کلام میں حسن وخوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔ مذکورہ تصنیف میں ان علوم کو باقاعدہ، بیان، بدیع، عروض اور قافیہ کے تحت بالتفصیل تحریر کیا گیا ہے اور ہر ایک کو باب کی حیثیت دی گئی ہے۔ کل بارہ ابواب ہیں۔ اس کے علاوہ 'کتابیات' اور 'اشاریہ' کا نمبر شمار الگ ہے۔ نصف درجن ابواب ادیب وناقد، شاعر وفکشن نگار شمس الرحمٰن فاروقی کے رشحات قلم کے نمونے ہیں۔ باقی نصف درجن ڈاکٹر صادق، ماہر قصیدہ ابوالفیض سحر، ڈاکٹر یعقوب عامر، شمیم احمد اور انوار رضوی کے تحریر کردہ ہیں۔ مزید مطالعے اور قارئین کی سہولت کے لیے فاروقی صاحب نے 'کتابیات' اور 'اشاریہ' بھی فراہم کر دیا ہے جن کی طوالت پندرہ صفحات کو محیط ہے۔

کتاب کا باب اوّل 'بلاغت کیا ہے؟' کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ سردست دو اقتباس نطشہ کے ہیں۔ بعد ازاں ان دونوں اقتباس کا فاروقی صاحب نے ایک جامع فکری تجزیہ کیا ہے اور بلاغت کے جملہ التزامات وانسلاکات کی تصریحات نیز تصور بلاغت پر مع مثال اپنا محاکمہ پیش کیا ہے۔ فاروقی صاحب نے لفظ 'بلاغت' اور اس کے لغوی ومجازی معانی پر بڑی فصیح گفتگو کی ہے۔

عرب، غیر عرب کو عجمی (گونگا) تصور کرتے تھے۔ کیونکہ عرب شعرا وادبا مافی الضمیر کی ادائیگی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کے کلام وشہ پارے بلاغت کے اعلیٰ نمونے ہوتے تھے۔ نحویوں نے زبان وادب اور اس کی باریکیوں ونکات کی تفہیم وترسیل کے لیے متعدد پیمانے (ابواب) وضع کیے ہیں جسے اصطلاح میں 'صرف' کہتے ہیں۔ 'صرف' کا اطلاق افعال پر ہوتا ہے۔ افعال کی صرفی تحلیل اور معمولی فعلی تغیر سے جملے معروف، مجہول، لازم اور متعدی کے ابواب میں داخل ہو جاتے ہیں جس کے سبب جملے کی تشکیلی ہیئت وساخت اور معانی میں غیر معمولی تبدیلی پیدا ہوتی ہے جو انسانی نفسیات، جذبات اور ماحول کو ملتزم ہوتی ہے۔ اصول وقواعد کے مطابق وہ بامعنی جملے جس میں کم سے کم الفاظ استعمال ہوئے ہوں، جمالیات کے حامل ہوتے ہیں۔ عربی مقولہ خیرالکلام ماقل و دل (مختصر ومدلل کلام حسین ہوتا ہے) اور کلام میں حسن وخوبصورتی بلاغت سے پیدا ہوتی ہے۔

بلاغ، بلاغت، بلوغ، بلوغت اور ابلاغ کا مادّہ ب ل غ (بلغ، پہنچنا) ہے جو موضوعہ مختلف ابواب میں داخل ہو کر مذکورہ بالا الفاظ کی صورت میں ڈھلتے اور مختلف الجہات معنی پیدا کرتے نیز مختلف مضامین میں استعمال ہو کر تفہیم وترسیل کا ذریعے بنتے ہیں۔ بلاغ وابلاغ فن صحافت میں داخل ہو کر باقاعدہ اصطلاح کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ بلوغ وبلوغت عمر کی ایک مخصوص منزل کا اشاریہ ہے۔ بلاغت زبان وادب کی ایک معروف اصطلاح ہے جس کی حیثیت ایک علم کی ہے گرچہ ایک تصور ہے۔ بلاغت کے عمل دخل سے کلام میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ کلام بلیغ، پر تاثیر وسریع الفہم ہوتا ہے۔ قاری یا سامع کے دل ودماغ پر خوشگوار اثر مرتب ہوتا ہے۔ بلاغت کی مثال میں غالباً نظیر اکبرآبادی کا شعر ہے:

روح کی تازگی تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

شعر میں نہ تو کہیں پیاس کا ذکر ہے نہ پانی کا اور نہ گرمی کی حدت وشدت کا۔ تاہم پھر بھی تفہیم وترسیل میں کہیں بھی رکاوٹ نہیں۔ یہ بلاغت کا مرتبۂ کمال ہے۔ فاروقی صاحب نے غالب کا ایک شعر نقل کیا ہے:

جب مے کدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

''جس عمل (شراب پینے) کے بارے میں یہ شعر ہے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ شراب کا نام لینا تو دور رہا پینے کا لفظ بھی استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح پورا شعر بلاغت کی اعلیٰ مثال بن جاتا ہے کیونکہ مراد کلام پوری واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن ساری بات اشاروں میں ہے۔ یا ایسے الفاظ کی مدد سے جو اپنے قرینے اور طرز استعمال اور انسلاک Association کے ذریعے ہمیں شعر کے مافی الضمیر تک پہنچاتے ہیں۔''

'درس بلاغت' تفہیم بلاغت کی بہترین کتاب ہے جو طلبا و اساتذہ دونوں کے لیے کارآمد ہے۔ پروف کی غلطیاں شاذ ونادر ہیں۔ معقول قیمت پر کونسل میں دستیاب بھی ہے۔

آزادی

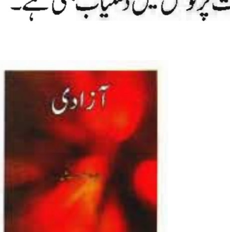

مصنف: جان اسٹوراٹ مِل

مترجم: سعید انصاری

صفحات: 184، قیمت: 60 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر مجیب احمد خان، ای 62 ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

'آزادی' جان اسٹوراٹ مل کی ایک اچھی اور اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کے مترجم

سعید انصاری ہیں۔ کتاب کا آغاز پیش لفظ سے ہوتا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نے چند برسوں میں بے حد اہم کتابیں مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد اور تراجم کے ذریعے قارئین کو دستیاب کرائی ہیں۔ ادارہ اس کے لیے قابل ستائش ہے۔ پروفیسر محمد مجیب کے مقدمہ سے اس کتاب کی اہمیت وافادیت میں اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔ انھوں نے 'آزادی' سے متعلق مِل کے نظریات اور عقائد کو مثبت اور منفی نظر سے دیکھا ہے۔ ان کے مثبت پہلو کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے اور جہاں منفی معاملات در آئے ہیں اس کی بے باکی سے تردید کی ہے۔ مزید برآں انھوں نے مل کی سوانح پر روشنی ڈالی ہے۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پیش لفظ اور مقدمہ کے بعد باب اوّل میں دیباچہ، باب دوم میں آزادیِ خیال اور مباحثہ، باب سوم میں انفرادیت بہبود انسانی کا ایک ذریعہ ہے، باب چہارم میں فرد پر جماعت کے اختیارات کی حدود اور باب پنجم میں مثالیں شامل ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مل دیباچہ میں رقم طراز ہیں:

''ہر شخص اپنی صحت کا آپ مالک ہے، خواہ وہ صحت جسمانی ہو یا ذہنی۔ نوعِ انسان کا زیادہ فائدہ اس صورت میں ہے کہ سب لوگ آپس میں ایک دوسرے کو اپنے اپنے طریقے پر چلنے دیں جو انھیں اچھا معلوم ہوتا ہو۔ نہ یہ کہ وہ ہر ایک کو اس طریقہ پر مجبور کریں جو باقی لوگوں کو بھلا لگتا ہو۔'' (ص 54)

مل نے یہ فرض کیا ہے کہ قوم آزاد اور خودمختار ہے اور وہ اس کتاب میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انسان کے لیے محض سیاسی آزادی کافی نہیں اور قومیں اسی وقت ترقی کرسکتی ہیں جب وہ آزادی فرد کا پورا خیال رکھیں اور اگر اس معاملے میں انھوں نے کچھ کمی کی تو بادشاہت اور جمہوریت میں کوئی فرق نہیں اور سیاسی آزادی ایک بے معنی شے بن کر رہ جائے گی۔ مل معاشرے کو اس کا قائل کرنا چاہتا ہے کہ وہ ہر شخص کو وہ آزادی دے جو اس کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔

مل کے خیالات اور ان کی کتاب کا لب لباب ہے کہ جو آزاد نہیں وہ انسان نہیں جس کو ہم پوری آزادی دینے سے انکار کرتے ہیں اُس کو ہم مکمل انسان نہیں سمجھتے ہیں۔ اگرچہ آدمی کو جانور بنا دینا دوسروں کے لیے ممکن ہے گو انسان صرف اپنی ذاتی کوشش اور فطرت کی دی ہوئی قابلیت کے استعمال سے بن سکتا ہے۔

مل نے فرد کو آزادی اسی وجہ سے دلائی ہے تاکہ وہ پوری طرح سے ترقی کرسکے۔ گو اس نے ہر فرد کو اس قدر خودمختار بنا دیا کہ اُس کی آزادی کا کوئی عام مقصد نہیں رہا۔ مل اس کے جواب میں کہتا ہے کہ کوئی پرواہ نہیں بلکہ یہ بہت اچھا ہے۔ اس طرح سماج کو اس کا موقع نہیں ملے گا کہ وہ لوگوں کو اپنے خیالات پر ایمان لانے کے لیے مجبور کرے۔ حالانکہ مل کا یہ جواب بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے مگر اس میں دو بڑی خامیاں ہیں۔ ایک یہ کہ اگر انسان کو آزادی دے دی گئی تو ضروری نہیں کہ وہ اس کا بہترین استعمال کرے گا اور دوسرے یہ اگر سماج یا ریاست اپنے لیے کوئی آدرش یا نصب العین مقرر کرے تو وہ خود بہ خود ظلم اور زبردستی کا ذریعہ بن جائے گا۔ گویا تاریخ میں کچھ بھی ہو مگر تہذیب وتمدن کا راز اسی میں ہے کہ معاشرہ شخصیتوں سے محبت کرے اور شخصیتیں معاشرے کی خدمت انجام دیں۔

ارسطو کا نظریۂ آزادی مل سے مختلف ہے۔ ارسطو کا قول ہے ''انسان ایک سماجی جانور ہے۔'' یعنی فرد کبھی اکیلا نہیں رہ سکتا۔ تنہائی اس کے لیے موت کی مانند ہے۔ وہ معاشرے میں مل جل کر اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی تکمیل کرتا ہے۔ وہ معاشرے اور ریاست پر کسی نہ کسی طرح منحصر ہوتا ہے۔

یوروپین فلسفیوں، افلاطون، ارسطو، روسو، نپولین، جیمز مل، رکارڈو، بینتھم، ایڈم اسمتھ، ہربرٹ اسپنسر، کانٹ، پروشا، ہیگل، ہوبز، اسپنوزا، گرین، بوسان کے وغیرہ نے فرد، معاشرہ، مذہب، قوم اور ریاست کے معاملات اور رشتوں پر نہایت سنجیدگی اور بالیدگی سے گفتگو کی ہے۔ 'آزادی' سے متعلق بحثیں موثر معنی خیز اور مدلل ہیں جن کی اہمیت وافادیت سے نفی ناممکن ہے۔

'آزادی' موضوع کے لحاظ سے بے حد دلچسپ اور معلومات افزا کتاب ہے۔ یہ افہام وتفہیم میں معتدل رویے سے اور بھی مؤثر اور افادی ثابت ہوجاتی ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس کتاب کو پڑھ کر اپنی آزادی سے متعلق معلومات میں اضافہ فرمائیں گے۔

شکاری، شکار اور جنگل سے پیار

مصنفہ: رضیہ تحسین، مترجم: حضور احمد شفق

صفحات: 132، قیمت: 20 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ابرار احمد، معرفت عرفان احمد، فارس روڈ، بوری کی چال، روم نمبر 35، گراؤنڈ فلور، نمکر مارگ، ممبئی 400008

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا اشاعتی دائرہ کافی پھیلا ہوا ہے۔ کونسل ادبی، تاریخی، سیاسی اور سماجی موضوعات سے لے کر معاشیات، نفسیات، عام فنون لطیفہ اور ادب اطفال پر بھی بڑے اہتمام سے کتابیں شائع کرتی ہے۔

زیر نظر کتاب ''شکاری، شکار اور جنگل سے پیار'' بچوں کی طفلانہ نفسیات کو رہ نما بنا کر لکھی گئی ہے۔ مصنفہ رضیہ تحسین نے یہ کہانیاں اپنے والد تفضّل حسین تحسین (باپو) کی معیت میں شکارگاہوں کے ذاتی مشاہدے اور شکار پر مبنی ان کی یادداشت کو مرکز نظر میں رکھ کر ترتیب دی ہیں۔ یہ صرف شکار اور جنگلی جانوروں کی سنسنی خیز کہانیاں ہی نہیں، ان کے والد کی سیر وتفریح اور شکار کی داستان حیات بھی ہے۔

132 صفحات کی یہ مختصر کتاب عرض مصنف اور تعارفی مضمون 'کتاب کے بارے میں' کے علاوہ 11 مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی اکثر شکاریہ کہانی میں تینندوے کی ایک خصوصی نسل بگھیرے (جس کی اس وقت میواڑ کے جنگل میں بڑی افراط تھی) کے شکار کا خصوصی ذکر آیا ہے، اس لیے کتاب کے شروع میں ہی اس جانور سے متعلق ایک تعارفی مضمون 'جنگل اور بگھیرا' اضافی طور پر شامل کیا گیا ہے۔ یہ اضافی مضمون مصنفہ کے بھائی رضا تحسین کی کاوش قلم کا نتیجہ ہے۔ رضا انڈین وائلڈ لائف، پروٹیکشن انسٹی ٹیوٹ دہرادون کے لائف ممبر ہیں۔ مضمون نگار کو تینندوے اور چیتے میں مشابہت اور غلط فہمی کے پیدا ہونے کا احتمال تھا، اس لیے انھوں نے اس مضمون میں دونوں کے فرق کو واضح کردیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''یہاں بگھیرے (تینندوے) اور چیتے میں امتیاز کرلینا ہی بہتر ہوگا، کیوں کہ عموماً لوگ تینندوے کو ہی چیتا سمجھ بیٹھتے ہیں۔ مگر چیتا الگ جانور ہے جسے انگریزی میں Hunting Leopard کہا جاتا ہے۔ یہ سنہرا کم اور سیاہی مائل زیادہ ہوتا ہے، تینندوے سے کچھ چھوٹا اور پتلا ہوتا ہے، مگر یہ دنیا کا سب سے تیز جانور مانا گیا ہے۔ بدقسمتی سے اس پرکشش جانور کی نسل کو بچایا نہیں جاسکا ہے، اس لیے بگھیرے یا تینندوے کو چیتا کہنا غلط ہوگا۔'' (ص: 28)

بگھیرے تینندوے کے بارے میں عام لوگوں کی معلومات تو یہی ہوتی ہیں کہ یہ ایک خون خوار جانور ہے، جو شکار کردہ جانوروں کے گوشت پر گزر بسر کرتا ہے، جنگل میں شکار نہ ملنے پر انسانی آبادیوں کا بھی رخ کرتا ہے اور گاؤں والوں کے پالتو مویشیوں، گائے، بکرے بکریوں، کتوں، اونٹ، بیل اور بھینسوں کو بھی اپنی خوراک بنا لیتا ہے، لیکن یہ کتنوں کو معلوم ہوگا کہ بگھیرا ضرورت سے زیادہ شکار نہیں کرتا، وہ جانوروں کا تعاقب کرکے شکار کرنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ اس کتاب کے پہلے مضمون 'جنگل اور بگھیرا' میں بگھرے کے

سارے پیدائشی اوصاف درج ہیں۔

گلہری ہم میں سے اکثر نے دیکھی ہے، لیکن اڑن گلہری ہم میں سے شاید ہی کسی کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو۔ اس کتاب کا مطالعہ کیجیے تو الفاظ وحروف کی وساطت اور چشم تصور کے ذریعے اس نایاب گلہری کا آپ مشاہدہ کرسکتے ہیں اور اس کے مابہ الامتیاز اوصاف سے بھی باخبر ہوسکتے ہیں۔ ضلع اودے پور کے جنگلات کی شکار یہ روداد بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں: ''دوسرے روز اسی مقام پر ہم نے دو اڑن گلہریاں اڑان بھرتی ہوئی دیکھیں، جو ایک درخت سے دوسرے درخت پر پہنچ رہی تھیں۔ وہ ہوا میں تیرتی ہوئی ایک اڑان میں کم وبیش 80 میٹر فاصلہ طے کرسکتی تھیں۔ جسم پر ملائم گھنے بال ہوتے ہیں، اس کی اگلی اور پچھلی ٹانگوں کے درمیان ایک جھلی ہوتی ہے جو کہ عام حالت میں سمٹی ہوئی رہتی ہے اور پرواز لینے پر پھیل جاتی ہے۔... یہ زمین پر شاذ ونادر ہی آتی ہے۔'' (ص: 117)

جنگلات مناظر فطرت کے بہترین مظہر ہوتے ہیں۔ قدم قدم پر فطرت کا حسن دامن گیر ہوتا ہے اور ان خوب صورت قدرتی مناظر کو دیکھ کر ہمارے جسم وروح میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ رضیہ تحسین نے ان مناظر کی عکاسی میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

رضیہ تحسین نے اپنے والد کی یہ شکار یہ روداد ہندی ہفتہ وار دھرم یگ کے لیے وقفے وقفے سے لکھی تھی، جس کو حضور احمد شفق نے اردو کا لباس عطا کیا ہے۔ مترجم نے بڑا ہی سلیس اور رواں ترجمہ کیا ہے۔ ایسے ہی ترجمے کو باز تخلیق کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ترجمے میں عربی فارسی کے ثقیل اور نامانوس الفاظ کے بجائے، ہندی الاصل آسان اور زود فہم الفاظ کو ترجیح دی گئی ہے۔

کتاب میں پروف کی غلطیاں در آئی ہیں۔ مٹھ بھیڑ، (مڈھ بھیڑ) ص: 52۔ مکین گاہ (کمین گاہ) ص: 60۔ واقف (واقفیت) ص: 80۔ بہت سے الفاظ کونسل کی املائی سفارشات سے متصادم نظر آتے ہیں۔ جیسے۔ پیش گی، ص: 34۔ پے چیدہ، ص: 40۔ لپ کے، ص: 77۔ رینگ نے ص: ۱۰۱۔ طباعت زیادہ صاف نہیں ہے۔ بہت سے الفاظ کٹے پٹے ہیں۔ اب آنکھیں کمپیوٹر کتابت سے مانوس ہوگئی ہیں۔ کمپیوٹر کتابت کرالی جاتی، تو طباعت بھی صاف رہتی۔ امید ہے کہ یہ کتاب اردو کے قارئین کو جنگل کی تحیر خیز زندگی اور وہاں کے سحر انگیز مناظر سے متعارف کرانے میں کامیاب رہے گی۔ اور انھیں قدرت، سماجی عوامل اور حسن فطرت سے قریب کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

بصارت سے بصیرت تک

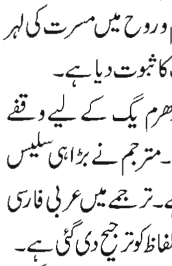

مصنف: پروفیسر محمد علی اثر

صفحات: 400، قیمت: 175 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی 6

مبصر: فاروق اعظم قاسمی مشکی پوری، روم نمبر 20، ٹاپ فلور، A-117، شبراتی اپارٹمنٹ، اوکھلا، مین مارکیٹ، جامعہ نگر، نئی دہلی

اردو ادب اور حیدرآباد دکن کا تعلق جسم وروح کا ہے، قلی قطب شاہ سے ولی تک اور ولی سے آج تک اس سرزمین کے آسمانِ علم وادب اور تحقیق وتدقیق پر بے شمار جگمگاتے ماہ وانجم طلوع ہوئے اور دنیا بھر کو روشن ومنور کیا۔ عادل شاہی وقطب شاہی دبستان کی ادبی خدمات سے کون واقف نہیں، شمس اللہ قادری، ڈاکٹر حمید اللہ، محی الدین قادری زور اور نصیر الدین ہاشمی، سے اردو ادب کا ہر فرد باخبر ہے۔

معروف شاعر، محقق اور ماہر دکنیات پروفیسر محمد علی اثر کا تعلق بھی اس سرزمین سے ہے۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے ان کا 35 سالہ مضبوط خوشگوار تدریسی رشتہ رہا ہے۔ اس دوران انھوں نے تدریسی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ شعر وسخن پر بھی نظر التفات ڈالی، مختلف اصناف شعری میں مختلف ہیئتی تجربے بھی کرتے رہے اور معنیٰ وموضوع کے حوالے سے اس کے دامن کو وسعت بھی بخشتے رہے۔ اسی طرح وقت کے جبر تلے دبے اردو ادب کے گم شدہ اوراق کی بازیابی کی جدوجہد بھی کرتے رہے اور ساتھ ہی ہماری کوتاہیوں کی دیمک کے شکار، مستور فنکاروں کی تلاش وجستجو کو بھی پروفیسر اثر نے اپنے شب وروز کا وظیفہ بنایا، اپنے ہاتھوں کو میلا کرکے اور دماغ کو جلا کے اردو ادب کے بہت سے لعل وجواہر سے اردو دنیا کو روشناس کرایا۔ اس طرح سے تحقیق وتدوین ان کی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن گئی، وہ نقاد کم، شاعر زیادہ اور محقق بہت زیادہ ہیں۔ تحقیقی نقوش، نوادرات تحقیق، مقالات اثر، تحقیقات اثر، تحقیقات وتاثرات اور انکشافات پروفیسر اثر کی خالص تحقیقی تصنیفات ہیں۔ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی زیر نظر کتاب 'بصارت سے بصیرت تک' ہے۔

یہ کتاب مختلف مواقع پر ان کے قلم سے نکلے ہوئے تحقیقی وتنقیدی اور تبصراتی مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس میں کل انتیس مضامین ہیں، ان میں بیشتر ہندو پاک کے معروف و معتبر ادبی وتحقیقی رسائل میں شائع ہوچکے ہیں، بعض مقالات مختلف سمیناروں میں پڑھے گئے، کچھ مختلف کتابوں پر لکھے گئے مقدمے ہیں اور چند مضامین ایسے بھی ہیں جو مختلف جامعات کی فاصلاتی تعلیم کے منصوبوں کے تحت ان کے ضابطوں کے مطابق تحریر کیے گئے ہیں۔

موضوعاتی حوالے سے اکثر مقالات دکنی ادب کی تحقیق وتدقیق اور تدوین پر مشتمل ہیں۔ اردو کی پہلی تقریظ اور اس کا خالق، دکنی اردو کا اولین ہندو شاعر اور اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑے اچھوتے، محقق، ذہن کشا اور معلومات افزا مضامین ہیں، حرف حرف سے فاضل مصنف کی قوتِ اخذ وادراک اور عرق ریزی ودماغ سوزی کا احساس ہوتا ہے۔ کتاب کے محتویات سے بھی صاحب کتاب کا دکنی ادب وتحقیق سے بے پناہ شغف پوری طرح سے واضح ہوجاتا ہے۔

پروفیسر اثر کی 'اولیت' کی کھوج بھی قابل مطالعہ ہے۔ مثال کے طور پر خواجہ بندہ نواز گیسودراز اردو کے پہلے شاعر، اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر، اردو کی پہلی تقریظ... اردو کی پہلی نثری تصنیف، دکن کا پہلا ادبی مؤرخ، دکنی اردو کا اولین شاعر... اور اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ جیسے موضوعات بھی پروفیسر اثر کی جدت طبع اور انفرادیت کا سراغ دیتے ہیں۔

وہ نہ صرف ماہر دکنیات سے اور بڑے محقق کے طور پر جانے جاتے ہیں، بلکہ اپنے پیش رو محققین کے عظیم کارناموں کا منھ بھر اعتراف بھی کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کی فروگزاشتوں پر انگشت نمائی کو اپنی ذمہ داری بھی سمجھتے ہیں۔

زیر نظر کتاب کی ظاہری ومعنوی خوبیوں کے باوجود حوالے کے سلسلے میں انتشار اور تصنیفی اصول سے ذرا ہٹا ہوا رویہ ہمیں مایوسی میں ڈالتا ہے۔ جدید اصول کو اختیار کرتے ہوئے مصنف نے اکثر مقالوں کے اخیر میں حوالے کا اہتمام تو کیا ہے لیکن اس میں تنظیم کے بجائے انتشار ہے، کہیں تو مکمل رعایت ہے، کہیں سرسری انداز اختیار کیا گیا ہے اور کہیں سے ندارد۔

منطقی نہج پر اگر کتاب کے اخیر میں انڈیکس/ اشارات کا اندراج ہوتا تو شاید کتاب کی قدر قیمت مزید بڑھ جاتی۔ ایسے ہی متعدد مقامات پر پروف کی غلطیاں، قدیم کتابوں، خاص طور پر عربی کتب کے ناموں کے اندراج (مصباح الغات نہ کہ مصباح اللغت/ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب نہ کہ الاستعیاب فی معارفت الاصحاب ص: 23/24) میں عدم توجہ، عربی عبارات کا بغیر اعراب کے نقل کرنا (ص 29) اور قرآنی آیات کی نقل (ص 187) میں بے احتیاطی عجلت واندیشے کو ظاہر کرتی ہے۔ ان تسامحات کی طرف بطور خاص توجہ دینے اور اصلاح کی ضرورت ہے۔

کتاب کے نام سے جہاں پروفیسر اثر کے ابتدائی دور سے پختہ شعوری کے دور تک کے درجہ بدرجہ سفر سے آگہی ہوتی ہے وہیں اس نکتے کی طرف بھی لطیف اشارہ ملتا ہے کہ

اگر ادب کا کوئی طالب علم تنقید و تحقیق کے میدان میں بصارت سے بصیرت تک رسائی چاہتا ہے تو وہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرے۔ مجموعی طور پر ادب و تحقیق؛ بلکہ دکنی تحقیق و ادب کے طلبہ کے لیے یہ مجموعہ ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔

خدا کے سائے میں آنکھ مچولی

مصنف: رحمٰن عباس
صفحات: 124، قیمت: 200 روپے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: سکندر مرزا، فلیٹ نمبر 03/B، چندریش ٹیریس، پرشوانگر، نزد اولڈ پٹرول پمپ، میرا روڈ، تھانے (مہاراشٹر)

یوں تو زندگی کا کسی مقام پر ٹھہراؤ نہیں ہے لیکن اس بہاؤ میں وقت نئے نئے واقعات کو جنم دے رہا ہے اور ہر واقعہ انسانی زندگی پر مثبت و منفی اثرات مرتب کر رہا ہے اور اکثر و بیشتر یہ رویے انسانی زندگی پر غالب آ کر معاشرے میں بگاڑ کا باعث بن جاتے ہیں اہلِ دل اس صورتِ حال پر کڑھ رہے ہیں اور تخلیق کار اسے موضوع بنا رہے ہیں۔

رحمان عباس کا ناول 'خدا کے سائے میں آنکھ مچولی' روشن خیالی اور جمالیات سے عبارت ہے۔ رحمان عبّاس نے اپنے ناول میں کمال خوبی سے ہمارے آج کو منعکس کیا ہے۔ کرداروں کی زبان، بے ساختگی اور تخلیقی والہانہ پن لیے ناول اپنے متن میں نغمہ اور جمالیات کی کیفیت لیے ہوئے ہے۔ جس سے مسرت اور آسودگی حاصل ہوتی ہے۔

'نخلستان تلاش' اور 'ایک ممنوعہ محبت کی کہانی' کے بعد رحمان عباس کا یہ تیسرا ناول ہے۔ بلا شبہ رحمان عبّاس اپنے ناول میں، کرداروں کو کہیں کہیں غیر پختہ زبان سے کمزور ضرور کرتے ہیں لیکن ہم بخوبی واقف ہیں کہ ہر تخلیق کار کا تخلیقی عمل اس کے خیالات پر مبنی ہوتا ہے اچھے خیالات نہ صرف اس کی عملی زندگی کو بلند کرتے ہیں بلکہ اس کے کرداروں کو بہتر بناتے ہیں۔

رحمان عباس نے اپنے ناول 'خدا کے سائے میں آنکھ مچولی' میں کمال خوبی سے ہماری نارسائی اور ہماری بے حسی کو اُجاگر کیا ہے۔ رحمان عبّاس کا یہ ناول ہمارے عہد کی زندہ تصویر ہے جس میں مصنف نے اسرار زندگی کو بیان کیا ہے۔ بے شک رحمان عبّاس کا ناول 'خدا کے سائے میں آنکھ مچولی' ہمارے گرد و پیش کا احوال لیے ہوئے ہے جس میں کرداروں کی زبان بہت عمدہ ہے زندگی کی اقدار اس ناول کی اساس ہے جس میں خوبی کے ساتھ معاشرے کی حبس، گھٹن اور بے حسی کو اُجاگر کیا ہے ناول کو جس نفاست اور خوبی سے رحمان عبّاس نے پیش کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ زبان و بیان، اسلوب اور ماجرا بیان کرنے کا ملکہ رحمان عبّاس کو حاصل ہو چلا ہے۔ دراصل سچی اور بے باک تحریر ہمیشہ زندہ و پائندہ رہتی ہے۔ رحمان عبّاس نے ناول 'خدا کے سائے میں آنکھ مچولی' میں اپنے کردار، روزمرہ کے واقعات و مشاہدات کو اپنے مخصوص و منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ رحمان عبّاس کا قاری اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ ان کے ناول میں واقعات کی بھر پور موجودگی ہمیشہ رہتی ہے لیکن تخیّل کی اُڑان تیز نہیں ہوتی۔ مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ رحمان عبّاس نے کسی ٹونے، ٹوٹکے یا کسی معجزے کا سہارا نہ لیتے ہوئے براہ راست اپنے قاری سے گفتگو کی ہے۔ میرے خیال میں یہ سب غالبًا زندگی کے آگے بے بسی کی کیفیت کو کم کر دیتے ہیں، رحمان عبّاس کا ناول عصری تقاضوں کے تحت چیختے انسانی رشتوں کے المیے پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالتا ہے اور کچھ سوالوں کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جس پر نئے سرے سے آمنے سامنے بیٹھ کر بحث کی ضرورت کو محسوس کیا گیا ہے۔ رحمان عبّاس بخوبی واقف ہیں کہ ہر افسانے، ناول یا کہانی کی پہلی ضرورت اس کا پلاٹ اور مضبوط کردار ہے جسے اس صنف میں بنیادی حیثیت حاصل ہے کیونکہ واقعات اور اس کے متعلق تفصیلات کے بغیر ناول لکھنا ممکن نہیں۔

ناول کا مرکزی کردار عبدالسلام بے پناہ طور پر اپنے ہی عقیدے میں اُلجھا ہوا ہے، اور ہمہ وقت کشمکش و پیچ میں مبتلا رہتا ہے وہ ہر ذی شعور سے، اپنے سوالات کا جواب چاہتا ہے، کہ ملک ہی میں قوموں کی آپسی جنگ، صوبائی جنگ، رنگ و نسل کی جنگ، نظریاتی جنگ، زبان کی جنگ، انسانی سوالات، معاشرتی سوالات، تہذیبی و تمدنی سوالات، ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کے درمیان کے اختلافات، کتابوں کی اخلاقیات سے بھر پور دنیا، بظاہر مسلسل تکلیف و آزار والی دنیا، مذہبی کتابوں کا درس کچھ اور، اس کی تفسیر بیان کرنے والے کچھ اور، وغیرہ وغیرہ۔ اس کی نظر میں مکر و فریب سے بھر پور سیاست ہی انسانی تباہی کا باعث ہے غریب ملکوں کے حکمرانوں کی آرام دہ زندگیاں، اسلحوں کی دوڑ، سرحدی کشیدگی، وہ بھوک و افلاس جواب انسانی زندگی کا کھلا درد بیان کرتی ہیں، میدانِ جنگ میں بازی لگانے والے عام سپاہی کو کبھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اصل میں یہ جنگ کیوں لڑ رہا ہے بالکل اسی طرح ہم جیسے ملکوں میں رائے دہندگان کو معلوم نہیں ہوتا وہ کسے ووٹ دے رہے ہیں۔

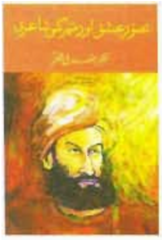

تصور عشق اور میر کی شاعری

مصنف: ظفر انصاری ظفر
صفحات: 151، قیمت: 272 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: اخلاق احمد آہن

میر کی وفات کو دوسو برس گذر گئے۔ اس دوران اردو شاعری کئی تبدیلیوں سے گذری ہے، ان میں مثبت بھی ہیں اور منفی بھی؛ اور اس دوران اردو شاعری نے کئی مدارج اور منازل طے کیے، کئی بڑے شاعروں کو مرغوب و محبوب رہی، اور نہ جانے کتنے ہی نام تاریخ ادب کے صفحات میں گم ہو گئے، لیکن حیرت انگیز طور پر جو شاعر ہمیشہ اہل نقد و نظر کے نزدیک معتبر و محبوب رہا اور جسے تمام شعرا نے استادِ فن مانا، وہ صرف میر ہیں۔ بجا طور پر انھیں 'خدائے سخن' کہا گیا۔ اس طویل عرصے میں میر کے خلاف کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ جب کہ اس دوران کوئی بڑے سے بڑا شاعر بھی معاندانہ تنقید و تنقیص سے نہ بچ سکا۔ غالبًا اس کی سب سے بڑی اور بنیادی وجہ میر کا اسلوب ہے اور انسانی احساسات اور لطیف داخلی کیفیات کو بڑی سادگی و پرکاری سے بیان کرنے کا ان کا ملکہ ہے۔ اس لحاظ سے وہ شاعری کی جس بلندی پر مستقر ہیں، وہاں کسی کا پہنچنا جوئے شیر لانے کے مساوی ہے، چنانچہ انھوں نے بجا طور پر یہ اعلان کیا کہ:

جس بار نے سب پہ گرانی کی   اسے یہ ناتواں اٹھا لایا

میر کے بیان اور ان کے شعری کینوس کی خوبیوں اور کمالات کو اگر ایک لفظ میں مجتمع کیا جائے تو وہ غالبًا 'عشق' ہوگا۔ عشق ان کی شاعری کا محور بھی ہے اور منبع بھی اور عشق ہی اپنے وسیع معنوں میں ان کی زندگی کا ماحصل بھی ہے۔ اسی لیے غالبًا ناقدین میر کی توجہ کا مرکز بھی عموماً یہی رہا ہے۔ ظفر انصاری کی کتاب 'تصور عشق اور میر کی شاعری' اس لحاظ سے اہم ہے کہ موصوف نے اس حوالے سے باضابطہ ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے، اور کلامِ میر میں عشق کی معنویت سے پہلے خود 'عشق' کی اصطلاح سے بھی مفصل بحث کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب پانچ ابواب کے علاوہ اقبال شناس ڈاکٹر منظر اعجاز کے مفصل مقدمہ اور مصنف کے دیباچے پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر اعجاز نے اپنے مقدمے میں تفصیل سے اس موضوع اور ظفر کے کام کا جائزہ لیا ہے۔ ساتھ ہی کتاب کا فلیپ معروف ناقد و محقق پروفیسر وہاب اشرفی کے توصیفی کلمات سے بھی مزین ہے۔ پہلا باب بعنوان 'میر تقی میر:

احوال و آثار' ہے، جس میں میر کی زندگی اور ان کی علمی باقیات کا اجمالی البتہ تحقیقی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے باب بعنوان 'عشق کا تصور' میں متعدد ذیلی عناوین کے تحت عشق کے ابعاد معنوی اور مطالب کے ساتھ ساتھ مختلف مکاتب فکر کی آرا سے بحث کیا گیا ہے۔ ان ذیلی عناوین میں عشق کے لغوی معنی، اس کے بنیادی عناصر، اقسام، مدارج، اور مکاتب فکر ہیں۔ اس توضیح وتفسیر میں مختلف لغات سے لے کر امام غزالی جیسے شارح تصوف وعرفان کی رائے سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، لیکن اس حصے میں عشق کی تفہیم کے حوالے سے مشرقی منابع کے بجائے مغربی مآخذ پر قدرے اضافی انحصار بھی دکھائی دیتا ہے۔ تیسرے اور چوتھے باب میں بالترتیب میر کی غزلوں اور مثنویوں کے حوالے سے تصور عشق کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ظفر نے بجا طور پر صنف غزل کو اردو شاعری میں اظہار عشق کا موزوں ترین صنف بتایا ہے اور غالباً اسی سبب غزل اردو کی شعری روایت میں مقبول ترین صنف سخن ہوئی، لیکن ساتھ ہی میر جس طرح مثنویوں میں مطالب عشق کو برتا ہے، وہ فارسی مثنویوں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ البتہ یہ بھی پیش نظر رہے کہ فارسی مثنویاں اس لحاظ سے عالمی ادب میں بے نظیر ہیں، لیکن اردو میں یہ روایت اپنے ابتدائی مرحلے تک محدود رہ گئی۔ اس کتاب کا سب سے اہم حصہ پانچواں اور آخری باب ہے، جس میں میر کی عشقیہ مثنویوں کا خصوصی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ذیل میں میر کی نو عدد مثنویوں کے حوالے سے سیر حاصل بحث ملتی ہے۔ جن میں خاص طور سے خواب وخیال، معاملات عشق، دریائے عشق، شعلۂ عشق، جوش عشق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ظفر کی یہ کتاب اس اعتبار سے بھی قابل توجہ ہے کہ انھوں نے مختلف حوالوں سے تقریباً تمام میر شناسوں کی آرا کو پیش نظر بھی رکھا ہے اور ان کے تطابق کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ ان میں خصوصی طور پر مجنوں گورکھپوری، عبدالباری آسی، نثار فاروقی، صفدر آہ، شمس الرحمٰن فاروقی، جمیل جالبی، گوپی چند نارنگ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اگرچہ مصنف نے اس کتاب میں کلام میر سے بڑی تعداد میں اشعار پیش کیے ہیں، لیکن ناقدین میر کے نزدیک میر کے اشعار کا انتخاب ہمیشہ ہی ایک اختلافی موضوع رہا ہے؛ جہاں ایک طرف '72 نشتر' کی بات کہی جاتی ہے تو دوسری طرف فراق نے میر کے ڈھائی سو اشعار کو اردو کا معیاری ترین شعر بتایا۔ چونکہ ظفر نے میر کے محبوب ترین موضوع کے حوالے سے کام کیا ہے، اگر اس کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر ایک انتخاب بھی پیش کرتے تو بہتر ہوتا۔ امید ہے یہ کام وہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں انجام دیں۔ کتاب کی چھپائی اچھی ہے، کاغذ معیاری ہے اور جلد خوبصورت ہے۔ کہیں کہیں کچھ غلطیاں بھی نظر آجاتی ہیں مثلاً معروف عالم اور مفسرِ قرآن فضلِ رحمٰن گنج مرادآبادی کا نام 'فضل الرحمٰن' لکھا گیا ہے۔

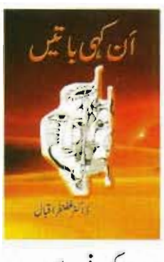

ان کھی باتیں

مصنف: ڈاکٹر غضنفر اقبال

صفحات: 254، قیمت: 200

ناشر: کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور

مبصر: جہاں گیر احمد، 104ای، برہم پترا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

انٹرویوز کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ کسی ہنگامی موضوع ومسئلے پر انٹرویو، کسی فن، آرٹ یا ادب پر انٹرویو یا محض ذات اور شخصیت پر انٹرویو۔ سب کی اپنی اہمیت ومعنویت ہے لیکن مجھے شخصیت سے متعلق انٹرویوز زیادہ پرکشش لگتے ہیں۔ انسانی زندگی کی تہ در تہ پرتیں کھولتے ذاتی انٹرویوز کسی فلم کے پردے پر چلتے مختلف مناظر کی طرح الگ الگ کیفیتیں پیدا کرتے اور گرہیں کھولتے ہیں۔

ڈاکٹر غضنفر اقبال کی کتاب 'ان کہی باتیں' مختلف انٹرویوز کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے دور جدید کے ادیبوں اور ناقدوں کے انٹرویوز کو بڑے سلیقے سے سجایا ہے۔ ان انٹرویوز کو انھوں نے 'فکشن شناس'، 'سخن شناس'، 'تنقید وتحقیق شناس' اور 'صحافت شناس' کے ذیلی عناوین کے تحت رکھا ہے۔ ہر ادیب وفنکار کا خود کا لہجہ اور اسلوب وانداز ہوتا ہے جو اس کی انفرادیت کو وا کرتا ہے۔ انٹرویوز کے مجموعوں کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری اس کو بخوبی محسوس کرتا اور محظوظ ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں بھی قاری کو یہ موقع خوب آئے گا۔ اس مجموعے کا سب سے پہلا اٹرویو مشہور ادیب وفنکار جناب جوگندر پال صاحب کا ہے۔ جوگندر پال کے انٹرویو میں ان کی گفتگو کا اچھوتا انداز اور لہجے کا کھرا پن خاصے کی چیز ہے۔ ان کا وطن سیالکوٹ ہے لہذا ان کی مادری زبان کا اثر ان کی گفتگو کو وہ انفرادیت بخش دیتا ہے جو کسی اور کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح اختر یوسف کا انٹرویو ان کے خاص لہجے کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان کی طبیعت کا نشاط اور شاعرانہ زبان پڑھنے والے کو فرحت وتازگی بخش دیتی ہے۔ نیز فن کی باریکیوں کی ان کی سمجھ قاری کو ایک نئی آگہی عطا کرتی ہے۔ اکرام باگ کا انٹرویو معلومات افزا ہونے کے ساتھ ساتھ گلبرگہ کی ادبی فضا پر ان کی گہری نظر کا غماز ہے۔ وہ اچھے ادیبوں، فنکاروں کی نمود کے نہیں ان کی عدم استقلالیت کے شکوہ گو ہیں اور یہی اردو زبان وادب کی وہ اصل بیماری ہے جس کی تشخیص بہت کم لوگ کر سکے ہیں۔ 1970 اور اس کے بعد کی دہائیوں کے اردو افسانہ نگاروں کے جھرمٹ میں ایک اہم نام شوکت حیات کا ہے۔ شوکت حیات کے انٹرویو سے نہ صرف ان کے خود کے فن پر روشنی پڑتی ہے بلکہ 70 اور اس کے بعد کے افسانوں پر ان کے اثر سے پڑنے والی انا م نسل، انامیت، نامیاتیت اور امکانیت پسندی جیسے مخصوص رجحانات اور تھیوریز سے بھی قاری بخوبی واقف ہو جاتا ہے۔ پروفیسر حمید سہروردی کا انٹرویو بھی قابل مطالعہ ہے۔ چونکہ یہ تمام لوگ وہ ہیں جنھوں نے ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے رجحانات کو قریب سے دیکھا، محسوس کیا اور برتا ہے اس لیے ان سے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے اور بطور خاص اس بارے میں سوالات پوچھے گئے ہیں۔

یہ تو تھی بات فکشن شناسوں کی مگر سخن شناسوں کے انٹرویوز بھی کم دلچسپ نہیں ہیں۔ اس ذیل میں ڈاکٹر غضنفر اقبال نے دس لوگوں کے انٹرویوز شامل کیے ہیں۔ اس میں پروفیسر صادق کا انٹرویو معلوماتی اور بے حد دلچسپ ہے۔ صادق صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں مثلا وہ آرٹسٹ ہیں، کارٹونسٹ ہیں، پیروڈی اور طنز ومزاح نگار ہیں۔ انھوں نے افسانے، ریڈیو ڈرامے لکھے ہیں اور تنقید وتحقیق کے میدان میں بھی کام کرتے رہے ہیں۔ چند خوبصورت اور یادگار ڈاکیومنٹری فلمیں بھی بنائی ہیں۔ کوئی واقعہ، کوئی حادثہ یا کوئی منظر کس طرح چپکے سے کسی تخلیق کار کے دل ودماغ کا حصہ بن کر برسہا برس تک اس کی تخلیق کے لیے محرک اور خام مواد بن جاتا ہے اس کی ایک بہترین مثال اور خوبصورت نمونے کے لیے پروفیسر صادق کے انٹرویو کا ایک اقتباس دیکھیے:

''دراصل ہوا یوں تھا کہ اپنے قیام اورنگ آباد کے دوران میں وہاں اکثر ایک مجذوب کو دیکھا کرتا تھا جو میرے گھر کے راستے میں مسجد کے پاس نیم برہنہ حالت میں پڑا رہتا تھا۔ جوگندر پال صاحب بھی اس زمانے میں اورنگ آباد میں ہی رہا کرتے تھے، انھوں نے بھی اس مجذوب کو دیکھا تھا اور اس پر ایک کہانی لکھی تھی۔ کچھ عرصے بعد اسی پر پھر ایک کہانی لکھی اور اس طرح وہ مجذوب ان کی کہانیوں میں جلوہ گر ہوا، میں جب تک اورنگ آباد میں رہا میں نے اس پر کچھ نہیں لکھا۔ لکھنا ضروری بھی نہیں تھا۔ بہرحال میرے دہلی آجانے کے کئی سال بعد ایک دن وہ مجذوب یکایک میرے ذہن کے کسی گوشے سے نمودار ہوا اور میرے تخلیقی اظہار کا حصہ بن گیا۔ یہ 1992 کی بات ہے، ان ہی دنوں

جب میں نے 'کشاد' نام سے اپنی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ مرتب کیا تو اس میں نظم مجذوب بھی شامل کر لی، چھپ گئی۔ کئی برس گذر گئے ایک مرتبہ تخلیقی ترنگ میں جب نظم لکھنے بیٹھا تو پھر وہی مجذوب ذہن میں آ گیا، چند سطریں لکھنے کے بعد میں نے اپنی وہ نظم نکال کر پڑھی۔ خیال آیا کہ کردار اور موضوع ایک ہی ہے تو کیوں نہ اسی نظم کو آگے بڑھایا جائے اس طرح پچھلی نظم کے حوالے اور تکرار سے بچا جا سکتا ہے۔ سو میں نے اس نظم کی توسیع کرنے کی سعی کی اور اس طور نظم مجذوب مکمل ہو گئی، مجذوب سے گلوخلاصی کے بعد میں نے تو چین کی سانس لی لیکن جوگندر پال صاحب کا پیچھا اس مجذوب نے اب تک نہیں چھوڑا، ان کی ایک اور کہانی 'کھودو بابا کو مقبرہ' میں وہ پھر آ موجود ہوا۔''

یہ اقتباس طویل ہے لیکن میں جس چیز کو قارئین تک پہنچانا چاہتا تھا اس کے لیے یہ ناگزیر تھا۔ تنقید و تحقیق شناس کے ضمن میں بارہ لوگوں کے انٹرویوز شامل ہیں۔ اخیر میں صحافت شناس کے تحت دو لوگوں، افتخار امام صدیقی اور سید ظفر ہاشمی کے انٹرویوز ہیں۔ ان انٹرویوز کے بارے میں کوئی بلند بانگ دعویٰ تو نہیں ہے ہاں اتنا وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ قاری کے ذوق مطالعہ کی سیرابی ضرور کریں گے اور قاری کو ان سے مایوسی نہیں ہوگی۔

آزادی کے بعد اردو سفرنامہ

مصنف: سعید احمد

صفحات: 280، قیمت: 154

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: عابد انور، ابوالفضل، انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

سفرنامہ ابتدائے آفرینش سے ہی معلومات، تہذیب و تمدن، کلچرل و ثقافت، آب و ہوا، رہن سہن، کھان پان، زبان و بیان، سماجی اور اقتصادی علم کی تحصیل کا ذریعہ رہا ہے۔ اس وقت جب معلومات کے ذرائع نہیں تھے اور نہ ہی آمد و رفت کے تیز رفتار وسائل تھے اور نہ ہی اطلاعات کے تبادلے کا کوئی ذریعہ تھا۔ لوگ ایک دوسرے کے بارے میں سفر کے توسط سے ہی جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سفر کرنے والا خواہ جاہل ہو یا عالم ان کے سفر سے واپس ہوتے ہی ان کے گرد لوگوں کا جھرمٹ لگ جاتا تھا اور لوگوں کو وہاں کے حالات، واقعات، رہن سہن، تہذیب اور دیگر چیزوں کے بارے جاننے کا شوق ہوتا تھا اور وہ جاننے کو بے تاب ہوتے تھے۔ سفر کرنے والا شخص دلچسپ انداز میں سفر کے بارے میں لوگوں کو بتاتا تھا کہ کیسے کیسے حالات سے دوچار ہوا، سفر میں کیا پریشانیاں درآئیں، وہاں کے لوگوں کا رویہ ان کے تئیں کیا تھا، وہ لوگ کیسے رہتے ہیں، ان کا کھانا پینا، رسم و رواج کیا ہے وغیرہ۔ یہ اس پر منحصر ہوتا تھا کہ سفر کرنے والا کون ہے، ان میں معلومات جذب کرنے کی صلاحیت کتنی ہے۔ وہ دوران سفر معلومات کو کس حد تک یکجا کرنے میں کامیاب ہوا ہے یا انھیں کتنی باتیں یاد رہتی ہیں۔ لیکن جب سے کاغذ قلم کا رواج بڑھا اور لوگوں نے اپنے سفر و حضر کو یادداشت کی شکل میں لکھنا شروع کیا تو بہت حد تک اس میں معتبریت پیدا ہوئی۔ اس طرح لوگوں نے اپنے سفرنامہ کے ذریعے وہاں کے حالات، واقعات اور تہذیب و تمدن کو دوسروں تک پہنچانے کا کام کیا۔

زیر تبصرہ کتاب 'آزادی کے بعد اردو سفرنامہ (تنقید و تجزیہ)' میں مصنف نے آزادی کے بعد لکھے گئے سفرناموں کا تنقیدی اور تجزیاتی جائزہ لیا ہے۔ سعید احمد نے اپنی تصنیف میں آزادی کے بعد لکھے گئے سفرناموں باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے جہاں سفرناموں پر لکھی گئیں مختلف تحریروں سے تعارف ہوتا ہے وہیں اس تحریر میں کیا کیا مندرجات ہیں اس سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ کہیں کہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ مندرجات زیادہ ہیں یا مصنف کی تحریر۔

زیر تبصرہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں مختلف زبانوں کے سفرناموں کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے اور سفرنامے کی تعریف، اقسام، محرکات اور اس کی خصوصیات بیان کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ اس باب میں قدیم سفرنامہ نگار فاہیان سانگ اور البیرونی وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب دوم میں آزادی سے قبل اردو سفرنامے کی تاریخی تسلسل بیان کیا گیا ہے۔ اردو سفرنامے کے ابتدائی نقوش، اردو سفرنامہ کا اولین سفرنامہ اور سفرنامے کے آغاز سے انیسویں صدی تک سفرناموں کی عہد بہ عہد ترقی کے اسباب، بیسویں صدی کے نصف اول میں خواتین سفرنامہ نگاروں کی شمولیت اور اس کے اسباب و عوامل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ باب سوم میں آزادی کے بعد اردو سفرناموں میں فکر و فن کا جو تنوع ہے اس کے اسباب و محرکات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ اس دور کے موضوعات، اسالیب، طرز تحریر اور مسائل پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ باب چہارم اور پنجم میں آزادی کے بعد ہندو پاک کے ادبا و شعرا کے منتخب اردو سفرناموں کا تنقید و تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

مصنف نے اردو سفرنامہ نگاری ایک نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے اور اردو کے بیشتر سفرناموں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ خاص طور پر آزادی کے بعد اردو سفرناموں کی فنی، فکری اور علمی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

مصنف نے کتاب کی شروعات سفرنامہ نگاری کے مفہوم، محرکات، موضوعات، فن، ہیئت تکنیک سے کی ہے۔ اس باب میں سفرنامے کی تعریف و توضیح، سفرنامہ کا فن کے بارے میں مختلف ادیبوں، مفکروں کے اقوال، اقتباسات اور سفرنامے کے پہلو سے بحث کی گئی ہے۔ مصنف اپنا نظریہ پیش نہ کرتے ہوئے زیادہ تر دوسروں کے نظریہ کو پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ سفرناموں کے بارے میں اہل علم کا نظریہ کیا تھا۔ سفرنامہ کے بانی کون تھے اور کس کو اولین سفرنامہ نگار کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں آنے والے پہلے سیاح کون تھے۔ ہندوستان کی سیاحت کرنے والے سیاحوں کے سفرنامے کی کیا اہمیت ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں اہم سفرنامہ نگاروں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ''اردو سفرنامہ نگاری (ابتدا اور تاریخی تسلسل 1947 تک) اس میں مصنف نے آزادی سے قبل تک سفرنامہ نگاروں اور سفرناموں پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اس باب میں انھوں نے اردو کے اولین سفرنامہ نگاروں پر بھی بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں اردو سفرنامہ پر لکھنے والے ادیبوں کے اقتباسات دیے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو سفرناموں کے بارے میں ادیبوں کے خیالات کیا ہیں اور اردو سفرناموں کے بارے میں وہ کیا سوچتے ہیں اور وہ فنی اعتبار سے کس مدارج پر ہیں۔ اسی کے ساتھ اس کتاب میں ''اردو سفرناموں میں فکری و فنی تنوع'' کے عنوان سے علاحدہ باب قائم کیا ہے۔ سفرناموں کے مندرجات، جنسی موضوعات، طنز و مزاح، ہیئت، تکنک اور اسلوب کے بارے میں کلام کیا گیا ہے۔ اس میں 1974 کے سفرناموں جائزہ لیا گیا ہے۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں شاعروں، ادیبوں، کہانی کاروں اور سفرنامہ نگاروں کے رویے اور موضوعات میں آئی تبدیلی کی طرف توجہ مبذول کی گئی ہے۔ کیوں کہ آزادی سے پہلے جہاں سفرنامہ نگاروں کا مطمح نظر کچھ اور تھا وہیں آزادی کے بعد اس میں تبدیلی آ گئی کیوں کہ دونوں ملکوں کی خاک خون سے آلودہ ہو چکی تھی۔

اس کتاب میں اقتباسات کی فراوانی ہے لیکن اس سے دلچسپی کم نہیں ہوتی۔ مصنف کے بارے میں کوئی تعارف نہیں ہے اور نہ ہی اس کتاب میں تقریظ یا مقدمہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مصنف نے کسی کو اس لائق ہی نہ سمجھا ہو۔ کتابت، طباعت عمدہ ہے اور کاغذ بھی بہتر ہے۔ مجموعی طور پر یہ قابل ستائش تحریر ہے اور سفرنامہ میں دلچسپی رکھنے والے ہر قارئین کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ◘

اردو دنیا ٹیلی ایڈیشن

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ای ٹی وی اردو چینل کے پروگرام اردو دنیا کی نشریات کا آغاز ہوئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے۔ پروگرام کے دوران ناظرین کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ جنوری 2011 سے اب تک کل 56 ایپی سوڈ پیش کیے گئے ہیں۔ اس میں کونسل کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ کونسل کے اردو عربی مراکز کی سرگرمیوں کو بھی ملک و بیرون ملک کے اردو ناظرین کے لیے نشر کیا جاتا ہے۔ کونسل کی کتابوں پر تبصرے، اردو کی اہم اور مقتدر شخصیات اور ادبا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی تفصیلی جائزے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان کا پہلا اردو ٹی وی چینل ای ٹی وی اردو گزشتہ دس برسوں سے ٹیلی ویژن نشریات کی خدمات دیتا رہا ہے اور جنوری 2011 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی ادبی و ثقافتی سرگرمیاں بھی ٹیلی ویژن نشریات کا اہم حصہ بن گئی ہیں۔ ہفتہ وار اردو دنیا سنیچر کی شام آٹھ بجے اور اتوار کی صبح ساڑھے دس بجے نشر کیا جاتا ہے۔ ملک میں اردو کے تئیں بیداری اور حکومت کی پالیسیوں کو اردو عوام تک پہنچانے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ٹیلی ایڈیشن کا آغاز کیا جس کے مثبت نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ 'اردو دنیا ٹیلی ایڈیشن' پروگرام کا آغاز ہر ہفتے قومی اردو کونسل سے متعلق خبرنامے سے ہوتا ہے اور اردو کی ترقی و ترویج سے دلچسپی رکھنے والے ناظرین کے ان سوالات کا جواب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ذمے داران کے ذریعے دیا جاتا ہے جن کا تعلق قومی اردو کونسل کی اسکیموں اور ان کے نفاذ سے ہوتا ہے 'اردو دنیا ٹیلی ایڈیشن' کے ناظرین کی دلچسپی کے لیے ہر ایپی سوڈ میں اردو اور فلموں کے تعلق سے ایک سوال بھی کیا جاتا ہے اور اس کا صحیح جواب دینے والوں کا نام اگلے ایپی سوڈ میں دکھایا جاتا ہے۔ اسی طرح 'اردو دنیا' کے ہر ایپی سوڈ میں جہاں اردو زبان و ادب میں گراں قدر خدمات انجام دینے والی کسی ایک اہم شخصیت کا تعارف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے ادبی سفر پر تفصیلی رپورٹ پیش کی جاتی ہے وہیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی اہم کتابوں کا جائزہ بھی اردو ناظرین کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ ناظرین اپنے تاثرات بھیجنے کے لیے ان ای میل آئی ڈیز کا بھی استعمال کر سکتے ہیں: urducouncil@gmail.com, urduduniya@etv.co.in

اگست 2012 کی نشریات

4 اگست 2012 بروز ہفتہ

اگست کے پہلے ہفتے میں رات ساڑھے آٹھ بجے اردو دنیا میں پیش کیے جانے والے پروگرام میں صوبہ بہار کے ضلع دربھنگہ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے مدرسہ اسلامیہ کے زیر اہتمام چلنے والے ملٹی میڈیا ڈی ٹی پی سینٹر کی کارکردگی پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اس پروگرام میں ہی اندور، مدھیہ پردیش کے ممتاز ادیب پروفیسر عزیز اندوری کے فکر وفن پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ پروفیسر عزیز اندوری کا ادبی سفر چھ دہائیوں پر محیط ہے۔

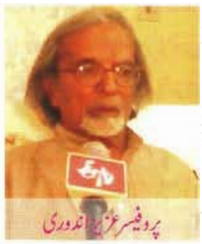
پروفیسر عزیز اندوری

11 اگست 2012 بروز ہفتہ

اگست کے اس رات کے ایپی سوڈ میں صوبہ جموں اینڈ کشمیر کے پلوامہ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے حیات ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام چلنے والے کمپیوٹر سینٹر حیات انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی کی کارکردگی پر رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اس ایپی سوڈ میں ہی دہلی کے ممتاز ادیب پروفیسر عبدالحق کے فن و شخصیت پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ پروفیسر عبدالحق کی مختلف موضوعات پر اب تک کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

پروفیسر عبدالحق

18 اگست 2012 بروز ہفتہ

اس رات کے ایپی سوڈ میں صوبہ اتر پردیش کے ضلع بارہ بنکی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے ارم ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام چلنے والے ارم کمپیوٹر سینٹر کی کارکردگی پر رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اس کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کی سابق چیئر پرسن اور ممتاز اردو اور فارسی ادیبہ پروفیسر آذرمی دخت صفوی کے فکر وفن پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ پروفیسر آذرمی دخت صفوی ہندوستان اور ہندوستان کے باہر فارسی ادب کی اہم ادیبہ اور مقبول اسکالر ہیں۔

پروفیسر آذرمی دخت صفوی

25 اگست 2012 بروز ہفتہ

اس رات کے ایپی سوڈ میں صوبہ مغربی بنگال کے ضلع اتر دینا جپور میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے اسلام پور رام کرشن پلی رورل ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام چلنے والے کمپیوٹر سینٹر ایس ٹی انفوٹیک اینڈ کمپیوٹر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کی کارکردگی پر رپورٹ پیش کی جائے گی۔ اس ایپی سوڈ میں ہی دہلی کے ممتاز ادیب و ناقد پروفیسر عتیق اللہ کے فکر وفن پر خاص رپورٹ پیش کی جائے گی۔ پروفیسر عتیق اللہ کا شمار اردو کے ممتاز ناقدین میں ہوتا ہے۔ اردو تنقید پر ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔

پروفیسر عتیق اللہ

عالمی اردو نامہ

امریکہ

ہرزبان کا ادب اپنی تہذیب کا زائیدہ ہوتا ہے: پروفیسر نارنگ

امریکہ: ہر زبان کا ادب اپنی تہذیب کا زائیدہ ہوتا ہے۔ کسی بھی ادب کو اس کی تہذیب سے ہٹ کر نہ دیکھا جا سکتا ہے نہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار امریکہ اور کنیڈا کے دورے پر گئے عالمی شہرت یافتہ نقاد و دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ٹورنٹو میں ڈاکٹر خالد سہیل کی فیملی آف ہارٹ کے اراکین کی تقریب 'نروان' میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی نئی بستیوں میں ہر چند کہ زندگی کے زبردست آثار ہیں لیکن بلند و پست ہر جگہ ہوتا ہے۔ جہاں ادب ہے وہاں اعلیٰ و ادنیٰ سب ہوگا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ادب میں رعایتی نمبر نہیں ہوتے۔ بقول منٹو 'ادب یا تو ادب ہے یا ایک بہت بڑی بے ادبی ہے'۔ ادب میں ڈالر نہیں خونِ جگر کی کشید کا سکّہ چلتا ہے۔ شاعری میں کھرا کھوٹا فقط ادبی قدر و قیمت سے طے ہوتا ہے۔ ٹورنٹو ہی میں انھوں نے اشفاق حسین کی اردو انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام پیرسن کنونشن سنٹر اور علی گڑھ المنائی ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام واشنگٹن، کراؤن پلازہ میں جاوید اختر کے تازہ مجموعۂ کلام 'لاوا' کی رسم اجرا کے موقع پر بطور مہمانِ خصوصی شرکت کی اور جاوید اختر کی شاعری و شخصیت پر اظہارِ خیال کیا۔ علاوہ ازیں اطہر رضوی کی کنیڈین غالب سوسائٹی کی جانب سے 'کوالٹی' میں ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا جس میں آج کے منظرنامے کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ ادھر کئی بڑی شخصیتیں یکے بعد دیگرے اُٹھ گئی ہیں۔ اور ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ خلا سا پیدا ہو گیا ہے۔ فیض احمد فیض، سردار جعفری، مجروح اور منیر نیازی کے بعد قرۃ العین حیدر، شہریار، صلاح الدین پرویز، مظہر امام اور ساجد رشید بھی نہیں رہے۔ دریں اثنا واشنگٹن میں سوسائٹی آف اردو لینگویج (ایس او یو ایل) کی طرف سے پروفیسر نارنگ کے اعزاز میں ایک استقبالیہ جلسے کا اہتمام کیا گیا جس میں سوسائٹی کے صدر ابوالحسن نغمی نے انھیں قطعۂ تہنیت کا پلاک پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 جولائی 2012

واشنگٹن میں S.O.U.L. کے صدر ابوالحسن نغمی، پروفیسر گوپی چند نارنگ کو نذرِ نارنگ کا پلاک پیش کرتے ہوئے۔

برطانیہ

یارکشائر ادبی فوم کے زیرِ اہتمام مشاعرہ

یارکشائر: یارکشائر ادبی فورم کے زیرِ اہتمام 2012 کے پہلے عالمی مشاعرہ کا انعقاد لیڈز میں ہوا، جس میں شاعری کے شہنشاہِ ظرافت پروفیسر انور مسعود، محبتوں کے امین شاعر و دانشور محترم امجد اسلام امجد اور نسائیت کے حوالے سے انتہائی معتبر و معروف شاعرہ و تحقیق نگار ڈاکٹر فاطمہ حسن نے پاکستان سے جب کہ ڈنمارک سے معروف شاعر و پیشکار صدف مرزا اور ادبی بی سی لندن کے عالمی شہرت یافتہ پیشکار و مصنف رضا علی عابدی نے خصوصی شرکت کی۔ یارکشائر ادبی فورم کی روح رواں معروف شاعرہ محترمہ غزل انصاری و محترم اشتیاق میر برطانیہ کی ادبی دنیا میں ایک معتبر مقام رکھتے ہیں۔ اردو ادب کے فروغ اور اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے انھوں نے اپنی تنظیم کو ڈاکٹر مختار الدین، ڈاکٹر نسیم الحق انصاری، محترم باصر کاظمی، محترمہ تسنیم حسن اور محترمہ سمیہ ناز و دیگر ممبران کی ہمراہی میں محنت، لگن و ٹیم ورک کے ذریعے تیز رفتاری سے آگے بڑھایا ہے، یہ شاندار مشاعرہ یورپ و پاکستانی ادبی دنیا کے معزز و معتبر ناموں سے مزین تھا جس میں مقامی کے علاوہ کل برطانیہ کے شعرا و شاعرات نے بھی شرکت کی۔ اِس محفل کی صدارت یارکشائر ادبی فورم کے محترم ڈاکٹر مختار الدین مختار نے کی، جب کہ پاکستان سے تشریف لائے ہوئے مہمانانِ خصوصی پروفیسر انور مسعود، محترم امجد اسلام امجد، محترمہ ڈاکٹر فاطمہ حسن، ڈنمارک کی صدف مرزا اور برطانیہ کے عالمی شہرت یافتہ براڈ کاسٹر و کئی کتابوں کے مصنف محترم رضا علی عابدی اسٹیج پر تشریف فرما ہونے والوں میں شامل تھے۔ مشاعرے کا باقاعدہ آغاز کرتے ہوئے ناظم محترم اشتیاق میر نے اپنے پر لطف اندازِ بیاں سے حاضرین کو محظوظ کیا، اس دوران معروف شاعرہ تسنیم حسن نے نظامت میں ان کی معاونت کی اور غزل انصاری صاحبہ بھی وقتاً فوقتاً مائیک پر آتی رہیں، ڈاکٹر انصاری کی دلربا شخصیت نے حسب روایت آغاز میں کچھ اپنے اور کچھ چنیدہ اشعار کے ہمراہ محفل کو مسکراہٹیں بخشیں۔ اس مشاعرے کے شعرا طلال انصاری، ڈاکٹر نسیم الحق انصاری، یعقوب رضی، نعیم حیدر، یشب تمنا، ڈاکٹر قیصر زیدی، فاروق ساغر، اسد ضیا، اقبال ستار، ڈاکٹر اعظم، باصر کاظمی، گلناز کوثر، تسنیم حسن، غزل انصاری، راحت زاہد، فرزانہ خان، صدف مرزا اور ڈاکٹر فاطمہ حسن تھیں جنھوں نے محفل کو اپنے کلام سے نوازا۔ اس محفل میں حصہ لینے والے تمام شعرا کو لیڈز کے سابق لارڈ میئر اقبال صاحب نے ایوارڈ ز بھی تقسیم کیے، ڈاکٹر مختار الدین اور رضا علی عابدی کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ دیا گیا۔ ان محفلوں کے انعقاد سے مختلف افکار و خیالات انسانی زندگی کے مختلف رنگوں کی علامتیں دکھاتے ہیں اور جب ایک ہی مکتبۂ فکر کے لوگ یکجا ہو جائیں تو یہ رنگ و فکر مزید نکھر آتے ہیں۔

پریس ریلیز، یارکشائر، 2012

دوحہ قطر

بزمِ اردو قطر کا ماہانہ طرحی مشاعرہ

قطر: قطر کی قدیم ترین ادبی تنظیم 'بزمِ اردو قطر' کا جون 2012 کا ماہانہ طرحی مشاعرہ 22 جون کو دکن ہال دوحہ میں منعقد ہوا۔ اس کی صدارت بزم کے چیئرمین اور سترہ کتب کے خالق محمد ممتاز راشد نے کی۔ مہمانِ خصوصی ہندوستان سے تشریف لائے ہوئے نامور ادیب و شاعر ڈاکٹر غضنفر علی اور انجمن محبان اردو ہند قطر کے خازن سید سیف اللہ تھے۔ ڈاکٹر غضنفر علی ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے خالق ہیں جن میں 9 ناول، افسانوں کے مجموعے، تنقیدی کتاب، و دیگر کتابیں شامل ہیں۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ڈائریکٹر اردو اکادمی برائے فروغِ استعداد اور ادو میڈیم اساتذہ کے عہدے پر فائز ہیں۔ ابتدائی نظامت بزم کے سکریٹری اشفاق احمد قلق نے اور باقاعدہ نظامت صدرِ بزم امجد علی سرور نے کی۔ مصرع طرح مومن خاں مومن کے کلام سے دیا گیا: ع 'چلمن سے اُس پری کا نظارہ ہوا نصیب' حسب روایت پہلے مختلف ملکوں سے ای میل کے ذریعے آئی ہوئی طرحی غزلیں پیش کی گئیں۔ فاروق احمد (لندن) کی غزل امجد علی سرور، راشد کنڈی (پشاور) کی غزل شاہد اختر، احمد علی برقی اعظمی (دہلی) کی غزل جاوید اختر نے ترنم سے، مظفر ظفر عظیمی (کراچی) کی غزل فیروز خان، ڈاکٹر آفتاب احمد (اعظم گڑھ) کی غزل رویس ممتاز، عالیہ تقوی (الہ آباد) کی غزل اشفاق احمد قلق، رضیہ کاظمی (امریکہ) کی غزل عبدالقدیر شاکر، مہتاب قدر (جدہ) کی غزل انجینئر شمس الدین رحیمی، شان صاحبہ (فیصل آباد) کی غزل محمد غفران صدیقی اور جلیل نظامی (دوحہ) کی غزل جمشید انصاری نے پڑھ کر سنائی۔ پھر محفل میں حاضر شعرا نے اپنی اپنی طرحی غزلیں سنائیں۔ اِن میں صدرِ مشاعرہ محمد ممتاز راشد، مہمانِ خصوصی ڈاکٹر غضنفر علی، امجد علی سرور، منظر زیدی، یوسف کمال، عزیز نبیل، افتخار راغب، منصور اعظمی، سعادت علی سعادت، حبیب حیدر آبادی اور ریاض اعظمی شامل تھے۔ صدرِ مشاعرہ نے صدارتی کلمات میں مشاعرے کے معیار کو سراہا البتہ دو ایک لسانی لغزشوں کی طرف توجہ دلائی۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر غضنفر علی نے کہا کہ قطر میں یہ چوتھی ادبی محفل ہے جس میں وہ شرکت کر رہے ہیں۔ انھوں نے بزم کے اس کردار کو سراہا کہ طرحی مشاعروں کی دم توڑتی ہوئی روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ نمایاں شرکا میں انجمن محبانِ اردو ہند قطر کے صدر خالد داد خاں، بزم کی سرپرست کمیٹی کے رکن شمس الحق آزاد، سید رضا، جاوید احمد، اظہر ربانی، حافظ سیف اللہ، حافظ فخر الدین رازی، عبدالرحمٰن فرید ندوی، سید عبداللطیف اور عبدالرحیم نوید شامل تھے۔

پریس نوٹ، بزم اردو قطر، جون2012

ماسکو

جنوبی ایشائی زبان وادب کی بین الاقوامی کانفرنس

ماسکو: ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی اور ایشین اسٹیٹ یونیورسٹی فار ہیومینٹیس کے اشتراک سے جنوب ایشیائی زبان وادب کے موضوع پر ایک سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ روس میں ہندوستان کے سفیر اجے ملہوترہ نے ہندوستان اور روس کے درمیان تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ روس کے تعلیمی اداروں میں ہندوستانی زبانوں کی تعلیم وتدریس پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ ماسکو یونیورسٹی میں ایشین اور فرنچ زبان کے ڈائریکٹر پروفیسر ایم ایس میئر نے تمام شرکا کا خیر مقدم کیا۔ ایشین اسٹیٹ یونیورسٹی کے ڈائریکٹر سرگئی سیر یبرینی نے کانفرنس کے انعقاد کے مقاصد پر تفصیلی گفتگو کی۔ دسویں بین الاقوامی کانفرنس میں ہندوستانی قدیم وجدید ادب اور لسانیات پر مقالات پیش کیے گئے۔ کانفرنس میں ہندوستان میں ہندی کی معروف ناول نگار مردولا گرگ، اورم کارکول، پروفیسر ابن کنول اور پروفیسر چند پانڈے، امریکہ سے ہنس ہینز یک اور پروفیسر ہیٹر ٹیوک، جرمنی سے پروفیسر ایلماریز اور رینڈ کمنگ، اٹلی سے پروفیسر تنزیانہ پونٹیلو، جاپان سے پروفیسر مکی نیشاکو، پولینڈ سے کرز ٹیوف، فرانس سے پروفیسر جین لک چیویلا رڈ کے علاوہ ماسکو سے ڈاکٹر لڈمیلا، اورلگا وچرینا، الیکذ نڈر ڈبیانسکی، نتالیا کورینوا، گوزل اسٹر ریکووا، ایکٹرینا، ویلد میر ایوونوا، اندرا غازیوا، ارینا میکسی، مینکو، ای سوی، پانیا وغیرہ نے مقالات پیش کیے۔ ہندوستانی زبان وادب کے مسائل پر مباحثہ میں بھرپور طریقے سے لوگوں نے شرکت کی۔ اختتامی اجلاس میں اردو کی نمائندگی کرتے ہوئے دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ابن کنول نے اردو اور روس کے رشتوں کے حوالے سے پر مغز گفتگو کی، اور ایک غزل بھی پیش کی۔ اختتام پر ایشین مطالعات کے ڈائریکٹر پروفیسر ایم ایس میر اور پروفیسر سرگئی سیر یبرینی نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، ماسکو، 12 جولائی 2012ء

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

قومی اردو کونسل جلد ہی پیشہ ورانہ کورسیز شروع کرے گی: خواجہ اکرام الدین

نئی دھلی: قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام نے مرکزی حکومت کی منشا کو سمجھتے ہوئے قومی پیشہ ورانہ تعلیمی لیاقت کے خاکہ میں رنگ بھرنے کی تیاری شروع کر دی ہے۔ قومی اردو کونسل نے پیشہ ورانہ تعلیم کو اپنے Mandate میں شامل کر لیا ہے۔اس سلسلے میں پیشہ ورانہ تعلیم کے متعلقہ ماہرین کی سال 2011 کی یہ اپنی نوعیت کی پہلی میٹنگ ہے، جس میں یہ طے پایا کہ اقلیتوں کے کثیر آبادی والے ریاستیں مثلاً یوپی، بہار اور آندھرا پردیش پر Focus ہوگا اور مرکزی

حکومت کی جانب تیار کردہ 90 اضلاع کی فہرست میں خاص کر مرادآباد، خرجہ، فیروز آباد، علی گڑھ، بریلی کو پائلٹ اسٹڈی کے طور پر چنا گیا ہے۔

کونسل جلد ہی جموں و کشمیر میں پیپر میشی (PaperMashi) کی صنعت سے متعلق ووکیشنل کمیٹی کی ایک میٹنگ کرنے جا رہی ہے۔کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ ایک میٹنگ میں پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ زردوزی، نقاشی، برتن سازی اور دستکاری جیسی صنعت و حرفت سے جڑا مزدور طبقہ محنت کی تھوڑی ہی اجرت پاتا ہے اور گمنامی کی زندگی جی رہا ہے۔ پرنسپل آئیڈیل آئی ٹی آئی، نوئیڈا، کے جناب آفاق حسین نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں مرادآباد سے وابستہ پیتل کی سامان سازی، صنعت سے متعلق ووکیشنل کمیٹی بنانے کی تجویز پیش کی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کی اسسٹنٹ پروفیسر محترمہ سنیتا ریڈی نے خواتین کے روزگار کے حوالے سے House Keeping کی Training کی تجویز پیش کی۔ میٹنگ میں کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر جناب نسیم احمد، ریسرچ آفیسر جناب کلیم اللہ اور اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر اجمل سعید نے شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 20 جون 2012

اقلیتوں سے متعلقہ اسکیموں کا نفاذ مرکزی حکومت کی اہم ترجیح ہونا چاہیے: مولانا ولی رحمانی

نئی دھلی: مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل نے 2006-07 کی قومی نگراں کمیٹی کی سالانہ رپورٹ کی سفارشات کو مدنظر رکھتے ہوئے پانچ ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی ہیں۔ملک کے اقلیتی اضلاع میں اسکیموں کے نفاذ اور اقلیتوں کی تعلیم سے متعلق شکایات کا حل تلاشنے کے لیے ایک اہم ذیلی کمیٹی کا بھی قیام کیا گیا ہے۔اس کمیٹی کا مقصد اقلیتوں سے متعلق تعلیمی اور فلاحی اسکیموں کے نفاذ کے سلسلے میں درپیش زمینی سطح کے مسائل کے حل تلاش کرنا اور حکومت کی مدد سے ہر ایک اقلیت کو اس کے حقوق سے متعلق جانکاری دینا اور اسکیموں کی عمل آوری کو بہتر بنانا ہے۔

آج قومی اردو کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں مولانا ولی رحمانی کی صدارت میں قومی نگراں کمیٹی کی ذیلی کمیٹی جو اقلیتوں کی اسکیموں کے نفاذ کے سلسلے میں بنائی گئی ہے اس کی ایک اہم میٹنگ ہوئی۔ جس میں سماجی کارکنان، دانشوروں نے حصہ لیا۔خاص طور پر کمیٹی کے ممبران پروفیسر محمد حلیم خان (اندور)، محترمہ تیستا سیتلواڑ (ممبئی)، جناب خالد انور (نئی دہلی)، ایس او مائناریٹی سیل جناب نندن سنگھ نے بھی شرکت کی۔ کمیٹی کے ممبران کے آپسی مشورے اور گزشتہ میٹنگ کے حوالے سے یہ طے کیا گیا کہ جلد ہی کمیٹی کی جانب سے مرکزی حکومت کو انٹریم رپورٹ (Intrim Report) پیش کی جائے گی۔اس رپورٹ میں اقلیتوں کی اسکیموں کے نفاذ سے متعلق حقائق پر مبنی سفارشات پیش کی جائیں گی تاکہ اسکیموں کا نفاذ آسان ہو اور ہر ایک ضرورت مند تک اس کا حق پہنچے۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ اب تک یونیورسٹیوں میں ایس سی، ایس ٹی کے لیے Equal opportunity Cell موجود ہیں، ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ سیل اقلیتوں کے لیے بھی ہوں۔ پروفیسر محمد حلیم خان، چیئرمین مولانا آزاد ٹیکنیکل ووکیشنل سوسائٹی (اندور) نے کمیٹی کے ممبران سے اتفاق کرتے ہوئے

کہا کہ CBSE, NIOS, UGC, NCTE, AICTE اور NCERT کے چیئرمین کو ایک خط لکھا جانا چاہیے، جس کا مواد یہ ہو کہ کمیٹی کی جانب سے یہ سوال رکھا جائے کہ یہ ساری تنظیمیں اقلیتوں کی اسکیموں کے نفاذ کے سلسلے میں کیا کر رہی ہیں۔ کمیٹی کے سبھی ممبران نے اس بات سے اتفاق کیا کہ قومی اردو کونسل کی جانب سے چل رہی CABA-MDTP اسکیم اقلیتوں کے حق میں ایک اہم رول ادا کر رہی ہے۔اس لیے کمیٹی حکومت سے یہ سفارش کرے گی کہ NCPUL کی کمپیوٹر سینٹر اسکیم روزگار کے حوالے سے ایک کارگر اسکیم ہے اس کو اور مضبوطی فراہم کرنے کے لیے بجٹ میں اضافہ کیا جائے۔ دوسری اہم بات یہ کہ NCPUL کے CABA-MDTP سینٹر جو مدرسوں اور مسلم لڑکیوں سے جڑے ہوئے ہیں انھیں Phase-out نہیں کیا جائے اور مزید نئے سینٹر کھولے جائیں۔

کمیٹی کے ممبران نے یہ فیصلہ لیا ہے کہ جولائی کے دوسرے ہفتے میں ریاستی سطح پر اقلیتوں کی اسکیموں کے نفاذ سے متعلقہ افسران سے ملاقات کریں گے۔ یہ دورہ یوپی، بہار، مغربی بنگال، مدھیہ پردیش اور کیرالہ پر مبنی ہوگا۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 23 جون 2012

اردو صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندستانیوں کی زبان ہے: کپل سبل
کہ اردو دنیا کے لئے آج ایک روشن باب کھلا ہے۔ پروفیسر وسیم بریلوی

قومی اردو کونسل کے آن لائن اردو لرننگ پروگرام، آن لائن ڈجیٹل اردو لائبریری اور ڈیجیٹل کمپیوٹر لرننگ پروگرام ان اردو کا افتتاح

نئی دہلی: قومی اردو کونسل آغاز سے ہی اردو زبان و ادب کے فروغ میں نمایاں کارنامے انجام دیتی رہی ہے۔ کونسل جہاں مختلف موضوعات پر ہزاروں کتابوں کی اشاعت کرچکی ہے وہیں اردو زبان و ادب کے دائرے کو وسیع کرتے ہوئے اسے کمپیوٹر اور جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے میں بھی پیش پیش رہی ہے۔ اپنی خدمات کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے کونسل نے آن لائن اردو کورس شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آن لائن کورس سی آئی آئی ایل میسور کی مدد سے تیار کیا گیا ہے جو کونسل کی ویب سائٹ پر مفت دستیاب ہوگا اور کوئی بھی شخص جو انٹرنیٹ اور کمپیوٹر جانتا ہے وہ اس ویب سائٹ کے ذریعے آسانی سے اردو سیکھ سکے گا۔ اسی کے ساتھ ساتھ کونسل کی شائع شدہ 1200 سے زیادہ کتابوں کو ڈجیٹلائز کرنے کا کام بھی مکمل کرلیا گیا ہے۔

سیکولرزم کے اصل معنی کو جاننے کے لئے اردو زبان کا جاننا لازمی ہے کیونکہ اردو مکمل طور پر ایک سیکولر زبان ہے اور قومی تہذیب اور ثقافت کو جاننے کے لئے اردو کا جاننا اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کو اس زبان کے بغیر ہم آگے نہیں لے جاسکتے۔ مرکزی وزیر وزیر برائے فروغ اردو زبان کپل سبل نے آج یہاں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) کے زیر اہتمام منعقدہ ایک پروگرام میں ان خیالات کا اظہار کیا۔ آج ایوان غالب میں ایک شاندار تقریب میں وزیر ترقی انسانی وسائل جناب کپل سبل نے قومی اردو کونسل کے آن لائن اردو لرننگ پروگرام، آن لائن ڈجیٹل اردو لائبریری اور ڈیجیٹل کمپیوٹر لرننگ پروگرام ان اردو کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر مرکزی وزیر نے کہا کہ قومی اردو کونسل اور خواجہ اکرام الدین کی ٹیم نے یہ بہت اہم کارنامہ انجام دیا ہے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس زبان کے کورسوں کو تفریحی صنعت سے جڑے لوگوں تک پہنچایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے اردو کونسل جو گراں قدر خدمات انجام دے رہی ہے اس کے لئے فنڈ کی کوئی کمی نہیں ہونے دی جائے گی اور اردو کی نفاست اور اس کی نزاکت کو برقرار رکھا جائے گا۔ مسٹر سبل نے کہا کہ این سی پی یو ایل کے زیر اہتمام چلائے جانے والے کورسیز کے سرٹیفکیشن کے سلسلے میں کہا کہ نیشنل ووکیشنل فریم ورک کے تحت ایک نصاب تیار کیا جارہا ہے۔ متعلقہ اداروں سے سے صلاح کرکے اردو کونسل کے معرفت چلائے جانے والے مجوزہ ووکیشنل کورسیز کرنے والے بچوں کو حکومت کی طرف سے ڈگری بھی دی جاسکتی ہے۔

مرکزی وزیر برائے فروغ زبان اردو کے مشیر اور معروف صحافی عزیز برنی نے کہا کہ اب تک اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی بات کی جاتی رہی لیکن این سی پی یو ایل نے آج اسے عملی جامہ پہنادیا ہے۔ میسور کے سی آئی آئی ایل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ایل راما مورتھی نے قومی اردو کونسل کی کوششوں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اس سے پہلے بنگلہ کنڑ اور تمل کورس آن لائن چلارہے تھے لیکن کونسل کے اردو کورس کی تیاری میں ہم نے تعاون دیا ہے اور یقیناً یہ اردو زبان کے لیے بہت خوش آئند بات ہوگی جو مستقبل میں اس زبان کو مزید کامیابیوں سے ہمکنار کرائے گی۔

قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین اور نامور شاعر پروفیسر وسیم بریلوی نے اپنے خاص انداز میں کونسل اور خواجہ محمد اکرام الدین کی سنجیدہ کوششوں کو سراہا اور کہا کہ آج اردو زبان کی مضبوطی میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اردو دنیا کے لیے آج ایک روشن باب کھلا ہے اور اس کے ذریعہ اردو زبان نے عالمی سطح پر ایک نئی شناخت قائم کی ہے۔ انہوں نے کپل سبل کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ وہ اردو زبان کا تحفظ کرتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ وہ ہندوستانیت کے محافظ ہیں۔ خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ اس سافٹ ویئر کے ذریعہ ایک ماہ کے اندر اردو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اور بولنا سیکھا جاسکتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ رواں برس اکتوبر تک اردو زبان کا پہلا وکی پیڈیا تیار کرنے کا عمل شروع کردیا جائے گا۔

اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے اس موقع پر کپل سبل کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان و ادب کا مزاج سیکولر ہے اور کپل سبل یہاں وزیر یا رہنما کی حیثیت سے نہیں بلکہ اردو کے محافظ اور اردو کے وکیل کی حیثیت سے تشریف فرما ہیں۔ اس پروگرام کے اہم شرکا میں وزارت برائے فروغ انسانی وسائل میں جوائنٹ سکریٹری امت کھرے، راشٹریہ سہارا اردو کے سید اسد رضا نقوی، کونسل کے ممبران قاری محمد فیروز بخت احمد، حافظ مطلوب کریم، علیم الدین اسعدی، فرید احمد، شفیع دہلوی، فاروق انجینیئر، معصوم مرادآبادی، قاری میاں مظہری، سردار پشپندر سنگھ، ابن کنول، ڈاکٹر شمیم احمد، اے رحمان، آر کے بھٹ، محمد اعظم، نسیم احمد، کمل سنگھ، ڈاکٹر کلیم اللہ، آبگینہ نظر اور دیگر افراد کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبا و طالبات شامل تھے۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 جون 2012

فن خطاطی اپنی اصل شکل میں قائم ودائم رہنا چاہیے: ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین

نئی دھلی: قومی اردو کونسل نے ہندوستانی روایات اور اردو، عربی و فارسی زبانوں سے جڑے بیش قیمتی تمدن کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے اپنی مخصوص اسکیم کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن، دوسالہ کورس کے نصاب پر نظر ثانی کے لیے فن خطاطی کے ماہرین کی ایک میٹنگ کا اہتمام کیا۔ گزشتہ 4 اپریل کو ٹیکنیکل کمیٹی کی میٹنگ میں Animation کی تکنیک کے حوالے سے ماہرین کے ذریعے کچھ اہم تجویزات سامنے آئیں۔ اس میٹنگ میں ان تجاویز پر بھی غور کیا گیا۔ اس کے علاوہ فن خطاطی میں استعمال ہونے والے قلم اور

دیگر سامان پر بھی گفتگو ہوئی اور یہ طے پایا کہ ابتدائی سال میں سرکنڈے کے قلم سے مشق کرائی جائے گی، جبکہ دوسرے حصے میں خطاطی کے لیے قلم کی تراش اور خط دینا شامل ہے۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے اس کورس کے مقصد کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ خطاطی اپنی اصل شکل میں قائم ودائم رہنا چاہیے۔ روایتی قلم اور روشنائی کی Originality کے ساتھ فن خطاطی کو برقرار رکھا جائے۔ خطاطی میں استعمال ہونے والے قلم، روشنائی اور دیگر سامان کی خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے ماہرین نے بیرون ہندوستان کی خطاطی کا بھی ذکر کیا اور یہ طے کیا گیا کہ فن خطاطی میں استعمال ہونے والے روایتی ساز وسامان اور تکنیک کے لیے ایران کلچر ہاؤس کے علاوہ دوسری ایجنسیوں سے بھی رابطہ کیا جائے گا اور کونسل اساتذہ کے لیے جلد ہی ایک ورکشاپ کا اہتمام کرے گی۔ اس موقع پر قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ اردو کی اسی ادا شناسی کے صدقے میں خطاطی جیسے نادر فن کے امکانات روشن رکھنے اور عصر حاضر کا حصہ بنانے کے خیال سے قومی اردو کونسل نے ملک کی 11 ریاستوں میں 35 کیلی گرافی اینڈ گرافک ڈیزائن سینٹر قائم کیے ہیں تاکہ اردو داں طلبہ و طالبات خطاطی کے معیاری زاویوں کو جانیں اور کمپیوٹر گرافک کرافٹ کے ذریعے اس فن کو فردوسِ نظر بنانے کے ساتھ ہی معیار بازار کی طلب میں بھی تبدیل کرسکیں۔

ماہرین کی رائے کے مطابق رائج طریقوں کا تعارف بہت ضروری ہے۔ پرانے طرز کے نمونوں کی اہمیت کے پیش نظر فن کیلی گرافی پر کونسل جلد ہی ایک کتاب شائع کرے گی۔

اس میٹنگ میں پروفیسر جی جی واگمارے (ممبئی)، جناب انیس صدیقی (نئی دہلی)، پروفیسر تنویر، (نئی دہلی)، جناب مشتاق احمد (دہلی)، جناب وسیم احمد (دہلی)، محترمہ قمر ڈاگر (دہلی) اور جناب ابوبکر قاسمی اور کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر جناب نسیم احمد نے بھی شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 3 جولائی 2012

کونسل کی مالی تعاون کی اسکیموں کا مقصد تخلیق کار کو براہ راست فائدہ: وسیم بریلوی

قومی اردو کونسل کی اسکیم برائے تھوک خریداری کتب ورسائل کے تحت 25 لاکھ کی خریداری کو منظوری: ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین

نئی دھلی: قومی اردو کونسل کی اسکیم برائے تھوک خریداری کتب و رسائل (Bulk Purchase) کی کمیٹی کو اس طرح وسعت دی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اردو مصنفین اس کا فائدہ اٹھا سکیں اس لیے کونسل نے اپنے ایک اہم فیصلے کے تحت تخلیقی ادب کو براہ راست خریدنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے رواں مالی سال 13-2012 کی Bulk Purchase کی پہلی میٹنگ میں کیا۔ اس میٹنگ کی صدارت کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے کی۔ اس میٹنگ میں رواں مالی سال 13-2012 میں اسکیم برائے تھوک خریداری کتب ورسائل کی متعلقہ کمیٹی نے تقریباً 200 عنوانات کے تحت اردو، عربی اور فارسی کی کتابوں، رسائل وجرائد کی تقریباً 25 لاکھ کی خریداری کو منظوری دی۔

اس موقع پر قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین جناب وسیم بریلوی نے کہا کہ ہمارے پیش نظر وہ تخلیق کار وہ محقق وہ افسانہ نگار اور شاعر ہے جو اردو کے لیے ایک سرمایہ ہے، ہمارا مقصد ہے کہ فائدہ براہ راست قلم کار کو پہنچے۔ معیاری کتابوں کی خریداری کونسل کی پہلی ذمے داری ہے جس کو پورا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے۔

یہ میٹنگ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ فروغ اردو کی پالیسی کے مدنظر کمیٹی کے ممبران کے مشوروں سے بہت سے اہم موضوعات مثلاً آرٹ اور تمدن، خودنوشت، خطاطی، بچوں کا ادب، ڈکشنریاں، تعلیم، تاریخ، ادب اور تنقید، مذہب اور سیرت، سائنس اور سوشل

سائنس جیسے عنوانات سے متعلق 190 کتابیں، عربی و فارسی کی 6 کتابیں اور 6 تعلیمی رسائل وجرائد کی خریداری کی گئی۔ اس خریداری کے وقت تمام تکنیکی ضابطوں کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔

فروغ اردو بھون میں منعقد کی گئی اس میٹنگ میں آزرمی دخت، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر سید علی محمد نقوی، جناب فیروز بخت احمد، پروفیسر فضیل احمد قادری، جناب غلام نبی خیال، ڈاکٹر پی کے ماداور، جناب وی ایس اسماعیل بیگ، پروفیسر عزیز اندوری، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر صغیر افراہیم اور قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر جناب نسیم احمد، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب اجمل سعید، لائبریرین محترمہ ساجدہ بیگم اور محترمہ فرح ادیبہ نے بھی شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 5 جولائی 2012

جناب وارث علوی، محمد علوی اور مظہر الحق علوی کو قومی اردو کونسل کی جانب سے استقبالیہ

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں اردو کی تین مایہ ناز ادبی شخصیتوں، جناب سید وارث حسین علوی، مظہر الحق علوی اور سید محمد علوی کو استقبالیہ دیا گیا۔ 16 جولائی کو اردو اکادمی دہلی کی جانب سے ایک اعزازی تقریب میں وزیر اعلیٰ محترمہ شیلا دکشت نے سید وارث علوی اور مظہر الحق علوی کو ان کی مجموعی علمی ادبی خدمات کے اعتراف 'کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ 2011 اور سید محمد علوی کو ان کی ادبی و شعری خدمات کے لیے 'کل ہند بہادر شاہ ایوارڈ' سے نوازا تھا۔

استقبالیہ میں کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے معزز مہمانوں کا استقبال کیا اور ان کی خدمات کا مختصراً جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ ان تینوں عظیم علوی نے اردو زبان و ادب کی بہت زیادہ خدمات انجام دی ہیں اور آج کونسل میں ان کی تشریف آوری ہمارے لیے ایک اہم موقع ہے۔ انھوں نے تینوں کو گلدستے اور کونسل کی مطبوعات بھی پیش کیں۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے بھی اس موقع پر اظہار خیال کیا اور کونسل کے اسٹاف اور دیگر حاضرین سے ان کا تعارف کرایا اس موقع پر جناب وارث علوی نے پروفیسر اختر الواسع اور ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ کونسل اردو زبان و ادب کے فروغ میں گراں قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔

وارث علوی کو غالب ایوارڈ اور عالمی اردو ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا جا چکا ہے۔ ندا فاضلی، شہر یار اور کمار پاشی جیسے جدید شعرا کی ایک کڑی میں اہم نام محمد علوی کا ہے، خالی مکاں، چوتھا آسماں، تیسری کتاب اور آخری دن کی تلاش ان کے شعری مجموعے ہیں۔ مظہر الحق علوی کا شمار اردو کے نامور مترجمین میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے رالڈر ہیگرڈ اور دیگر مغربی جیسے ناول نگاروں کے ناولوں کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ (رابطۂ عامہ سیل)

سعادت حسن منٹو کے وکیل ہیر العل سبل کی 98 ویں سالگرہ منائی گئی

17 جولائی کو عالمی اُردو ٹرسٹ اور قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان کے زیر اہتمام منٹو صدی تقریبات کے سلسلے میں منعقد ایک خصوصی تقریب میں ملک کے بین الاقوامی شہرت یافتہ بزرگ وکیل مسٹر ہیر العل سبل کی 98 ویں سالگرہ کے موقع پر انھیں ''عالمی وکیلِ اُردو'' کا خطاب پیش کیا گیا۔ مرکزی وزیر برائے فروغِ انسانی وسائل مسٹر کپل سبل کے والد ہیر العل صاحب کا اُردو زبان و ادب سے گہرا تعلق رہا ہے۔ اُردو کے لافانی افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے خلاف لاہور کی عدالت میں چلائے گئے مقدمات میں ان کی کامیاب پیروی کر کے منٹو کو قانونی شکنجے سے بچانے کے لیے ہیر العل سبل کا نام اُردو تاریخ میں ہمیشہ احترام سے لیا جاتا رہے گا۔ اس موقع پر عالمی اُردو ٹرسٹ کے چیئرمین اے۔ رحمان اور قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان کے ڈائریکٹر خواجہ محمد اکرام نے مشترکہ سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے مسٹر ہیر العل سبل کی اُردو دوستی اور منٹو سے ان کے دوستانہ تعلق کے لیے خراجِ تحسین پیش کیا۔ عالمی اُردو ٹرسٹ کی جانب سے ہیر العل صاحب کی شال پوشی اور خصوصی نشانِ اعزاز بھی پیش کیا گیا۔ مسٹر ہیر العل سبل نے عظیم افسانہ نگار منٹو سے اپنے تعلق اور محبت سے متعلق یادوں کو تازہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ اُردو زبان کو دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی کیونکہ یہ ہندوستان کی ہزاروں سال پرانی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کی زندہ علامت ہے۔ حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ اُردو سے محبت ہمارے وزیر محترم مسٹر کپل سبل صاحب کو یقیناً اپنے والد محترم سے وراثت میں ملی ہے، سبل صاحب دل و جان سے اُردو زبان اور اُردو تہذیب کے فروغ کے خواہاں ہیں۔ مسٹر

اے۔ رحمان نے اپنے مختصر خطاب میں کہا کہ عالمی اُردو ٹرسٹ اور قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان کے زیر اہتمام ممبئی میں فلم، ٹی وی اور پرنٹ میڈیا میں اُردو کے کردار کے موضوع پر ایک عالمی کانفرنس کے انعقاد کی تیاریاں تقریباً مکمل ہو چکی ہیں، اس پر وزیر موصوف نے یقین دلایا کہ ان کی جانب سے اس تاریخ ساز کانفرنس میں ان کا پورا تعاون شامل رہے گا۔ انھوں نے کہا کہ آج آپ لوگ میرے والد صاحب کی جشن سالگرہ میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں، یہاں میں مہمان نہیں بلکہ میزبان ہوں، آپ سب اُردو دوستوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے مجھے دلی مسرت ہو رہی ہے۔

نامور صحافی جناب عزیز برنی نے اپنی تقریر میں سینئر سبل صاحب کی عظیم الشان قانونی، علمی اور سماجی خدمات کا ذکر کیا۔ انھوں نے اُردو کے فروغ کے لیے قومی کونسل اور عالمی اُردو ٹرسٹ کے ساتھ تعاون کا یقین دلایا۔ اس موقع پر عالمی اُردو ٹرسٹ کی دعوت پر دانشور و ادیب پروفیسر خالد اشرف اور جامعہ ماس کمیونی کیشن کے پروفیسر ڈاکٹر شکیل اختر بھی چنڈی گڑھ تشریف لائے تھے۔ دونوں اصحاب نے مسٹر ہیر العل سبل کی صحت و درازیٔ عمر کے لیے نیک خواہشات کا اظہار اور ان کے لائق صاحبزادے کپل سبل صاحب کی اُردو دوستی اور انصاف پسندی کی تعریف کی۔ (پریس سکریٹری، عالمی اُردو ٹرسٹ)

قومی کونسل کے تعاون سے عبدالحکیم کالج، میل وشارم میں تقسیمِ اسناد

میل وشارم: عبدالحکیم کالج میل وشارم تامل ناڈو میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کا علاقائی مرکز قائم ہے جس میں امسال 125 طلبا و طالبات نے ڈپلوما اردو لینگویج اور 80 طلبا و طالبات نے ڈپلوما ان فنکشنل عربک کی اسناد حاصل کیں۔ اس سلسلے میں ایک شاندار اجلاس بروز شنبہ 17 جون 2012 کالج آڈیٹوریم میں منعقد کیا گیا تھا۔ جلسے کی صدارت جناب ایس زیڈ ابرار احمد کرسپانڈنٹ سی عبدالحکیم کالج نے کی۔ جناب مولانا انعام احسن صاحب استاد این سی پی یو ایل نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر ایس محمد یاسر صاحب صدر، شعبۂ اردو اور کوآرڈی نیٹر این سی پی یو ایل نے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر ایس محمد افضل علی ضلع ویلور کے ڈپٹی ڈائرکٹر آف میڈیکل سروس نے جلسے سے خطاب فرمایا اور مہمان اعزازی ڈاکٹر فریدہ نینا سیل وم پرنسپل ایم ایم ای ایس کالج فار ویمن نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ جب کہ جناب ایم محمد عارف الدین استاد این سی پی یو ایل نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ پریس ریلیز میل وشارم، 17 جون 2012

قومی کونسل کے تعاون سے

سری نگر میں قومی اردو کونسل کا اردو صحافیوں کے لیے سات روزہ ورکشاپ

سرینگر: ہندوستان میں اردو صحافت کے مستقبل کو روشن بتاتے ہوئے سینئر صحافی اور سہارا کی اردو اشاعتوں کے سربراہ اسد رضا نے کہا ہے کہ آنے والے برسوں میں اردو اخبارات کے پھل پھولنے کے کافی امکانات اور امیدیں ہیں۔ تاہم اردو صحافت کے فروغ کے لیے اردو صحافیوں کو صحافت کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر پیشہ ورانہ طریقے اپنانے ہوں گے اردو صحافت کے فروغ سے متعلق کشمیر یونیورسٹی میں کونسل برائے فروغِ اردو زبان اور یونیورسٹی مذکورہ کے شعبہ فاصلاتی تعلیم کے اشراک سے جاری، سات روزہ ورکشاپ سے خطاب کرتے ہوئے اسد رضا نے اخبارات میں صفحہ سازی کے عنوان سے ایک مدلل تقریر کی۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا کے سربراہ نے کارروائی کے پہلے سیشن کی صدارت کی اور اخبارات میں مختلف خبروں کی پیش کش کے حوالے سے تکنیکی امور اور مختلف صفحات کی اہمیت و پیش کش کے بارے میں رہنما اصول بیان کیے اور شرکا کے ساتھ اپنے تجربات

بانٹے۔ انھوں نے کہا کہ جوں جوں اردو اخبارات کا معیار بلند ہوتا جا رہا ہے ان اخبارات کو بڑی کمپنیوں کی جانب سے اشتہار بھی ملتے ہیں جو کہ اردو صحافت کی بقا و فروغ کے لیے نہایت ہی اہم ہے۔ ہندوستان میں اردو صحافت کو نئی زندگی دینے کے لیے سہارا پریوار کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ سہارا پریوار کے مینیجنگ ورکر و چیئرمین عالی جناب سہارا شری سبرت رائے سہارا نے اردو صحافت و زبان کے فروغ کا بیڑہ اٹھا کر ایک ایسا کام کیا ہے جس کے لیے تاریخ انھیں ہمیشہ یاد رکھے گی جب کہ سہارا انڈیا میڈیا کے ایڈیٹر و نیوم ڈائرکٹر جناب اوپیندر رائے کی قیادت میں آج بھی سہارا اردو پبلی کیشنز، ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ چنانچہ ان کی جانب سے سکھائے گئے باریک تکنیکی نکات کو لے کر شرکا نے اطمینان کا اظہار کیا اور کہا کہ انھیں کافی کچھ سیکھنے کو ملا ہے۔ ورکشاپ سے روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹوریل انچارج ڈاکٹر افضل مصباحی نے بھی خطاب کیا اور صفحہ سازی کی تکنیک پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ سرینگر سے شائع ہونے والے ایک اخبار کے سینئر رپورٹر امتیاز خان نے بتایا کہ انھیں ورکشاپ سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا ہے۔ اس نمائندے کے ساتھ بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا ''سہارا جیسے بڑے اخبار کے سربراہ کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ایک بڑی بات ہے اور اس موقعہ کی فراہمی کے لیے ہم کشمیر یونیورسٹی اور اردو کونسل کے مشکور ہیں۔'' عارف نیاری نامی ایک اور نوجوان صحافی نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ اردو صحافیوں کو یونہی مستقبل میں بھی نامور صحافیوں کے روبرو کرا کے ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جانا چاہیے۔'' کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ فاصلاتی تعلیم کے اسسٹنٹ پروفیسر اور ورکشاپ کے منتظم ڈاکٹر عرفان عالم اور اردو کونسل کے زعما نے بھی ورکشاپ کی کامیابی سے متعلق اطمینان کا اظہار کیا اور کہا کہ ابھی تک کی کارروائی توقعات سے کہیں زیادہ اطمینان بخش رہی ہے۔ شعبۂ فاصلاتی تعلیم کی ڈائریکٹر پروفیسر نیلوفر خان نے بھی ورکشاپ کو کامیاب بتاتے ہوئے مستقبل میں اس طرح کے اقدامات جاری رکھے جانے کی امید دلائی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 11 جولائی 2012

'حکومت ہند کا تعلیمی منصوبہ اور ہماری ذمے داریاں' کے موضوع پر اجلاس عام

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، سماجی تنظیم الہند پلگرمس ہیلپنگ ہینڈ ایسوسی ایشن اور تعلیمی تنظیم الاصلاح ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام 14 جولائی کو پرانی دہلی کے ترکمان گیٹ علاقے میں واقع حج ہاؤس منزل میں مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی بدحالی و پسماندگی دور کرنے کے لیے اٹھائے گئے اقدامات اور شروع کی گئی پالیسیوں کے سلسلے میں مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کپل سبل کو شاندار استقبالیہ دیا گیا اور اقلیتوں کی تعلیمی اور خود کفالت کے لیے ''وزیر تعلیم کے انقلابی اقدامات کی روشنی میں حکومت ہند کا تعلیمی منصوبہ اور ہماری ذمے داریاں'' کے موضوع پر ایک اجلاس عام کا انعقاد کیا گیا جس میں این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع، دہلی اسٹیٹ حج کمیٹی کے صدر ڈاکٹر پرویز میاں، مقامی کونسلر سیما طاہرہ، مجاہد آزادی شوکت علی ہاشمی، سابق کونسلر محمد ضیا، حکومت ہند کی اقلیتی تعلیمی کمیٹی کے قومی نگراں شفیع دہلوی، ماسٹر فرید احمد، جمیل انجم دہلوی، پروفیسر عزیز احمد صدیقی، محمد الیاس سیفی، سیما عابد، شاہجہاں بیگم، زلیخا فرزانہ، حافظ مطلوب کریم، مہ جبیں، نصیر الحسن جھنجھانوی، عابد ایرانی، سلمان فاروقی و دیگر سرکردہ علمی، ادبی و سماجی عوامی اور سیاسی شخصیات سمیت بڑی تعداد میں لوگوں نے

حج منزل میں اجلاس عام کے دوران ڈاکٹر پرویز، پروفیسر عزیز صدیقی، پروفیسر اختر الواسع، کپل سبل خواجہ محمد اکرام الدین، شوکت علی ہاشمی، فرید احمد اور سیما طاہرہ وغیرہ

شرکت کی اور اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر عزیز احمد صدیقی نے مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کو ضروری بتایا کہ جب کہ خواجہ اکرام الدین نے تعلیمی پالیسی بنانے کے لیے عالمی و قومی منظر نامہ کو سامنے رکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ پروفیسر اختر الواسع نے مسلم بچیوں کو تعلیم یافتہ اور ہنر مند بنانے کی اپیل کی اور اس کے لیے والدین کو بھی آگے آنے کو کہا اس موقعے پر کپل سبل نے کہا کہ انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کے وکالت نامے پر دستخط کر دیے ہیں اور وہ اس سلسلے میں سنجیدہ اور ٹھوس اقدام کر رہے ہیں۔ اس موقعے پر پرانی دہلی میں تعلیمی بیداری مہم چلانے کے لیے ٹیم ایجوکیشن فار کپل سبل کی 31 ممبران پر مشتمل ٹیم تشکیل دی گئی ہے۔ پروگرام کے آخر میں مقامی کونسل سیما طاہرہ نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

رومنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی، 16 جولائی 2012

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

شخصیت سازی ورکشاپ

نئی دہلی: انسان کی ظاہری شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کی باطنی شخصیت بھی پروقار اور موثر ہونی چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار راشٹریہ سہارا کی اردو اشاعتوں کے سربراہ اور معروف صحافی سید اسد رضا نے یہاں انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں نوبل ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے اشتراک سے جاری پرسنالٹی ڈویلپمنٹ ورکشاپ کے مشاہدہ کے بعد طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ انسان کی شخصیت محض قیمتی کپڑے زیب تن کرنے سے نہیں بنتی بلکہ اس کے لیے اعلیٰ اخلاق، خوش معاملگی اور دیانت داری جیسے اوصاف کا حامل ہونا بہت ضروری ہے۔ انھوں نے اس پر اطمینان کا اظہار کیا کہ اسلامک سینٹر میں ساڑھے تین سو سے زائد طلبہ و طالبات کو صرف کمیونی کیشن کی ہی تربیت نہیں دی جارہی ہے بلکہ ان کی باطنی شخصیت کو سنوارنے کے لیے انھیں اعلیٰ اخلاق و اقدار سے بھی روشناس کرایا جارہا ہے۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 جون 2012

کپل سبل سے مداخلت کی اپیل

نئی دہلی: قومی اقلیتی کمیشن کی رکن سیدہ امام بلگرامی نے دہلی میونسپل کارپوریشن کے ذریعے 200 اردو اساتذہ کی تقرریاں کرنے کا اعلان کرنے کے بعد تقرریوں کے عمل کو التوا میں ڈال دیے جانے کی شکایتیں ملنے کے بعد مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کپل سبل سے شاستری بھون واقع ان کے دفتر میں ملاقات کرکے انھیں تمام صورتِ حال سے آگاہ کرایا اور تقسیم شدہ ایم سی ڈی کے ذریعے اردو کے تعلق سے جانبدارانہ رویہ اختیار کیے جانے کی مذمت کی ہے۔ ان کے ہمراہ کانٹریکٹ ٹیچر ویلفیئر اردو ایسوسی ایشن کے نگراں شمس الدین، جنرل سکریٹری محمد ارشد اور محمد نعیم وغیرہ بھی موجود تھے۔ اس موقعے پر وفد کے اراکین نے ایم سی ڈی کی تقسیم سے قبل دہلی میں پرائمری اسکولوں کے لیے 200 اردو اساتذہ کی تقرریوں کا اعلان کا گیا تھا لیکن ایم سی ڈی کو تین حصوں میں تقسیم کردیے جانے کے اور ان کی باقاعدہ تشکیل ہوجانے کے بعد اب ایم سی ڈی کے اسکولوں کے لیے اردو ٹیچروں کی تقرری کے عمل کو التوا میں ڈال دیا گیا اور ان کے ٹیسٹ اور انٹرویو وغیرہ کی کوئی تاریخ نہیں دی جارہی ہے وہیں تقرری کے ضوابط میں 6 ستمبر 2011 کو ہوئی تبدیلی میں اردو کو ختم کردیے جانے کے بعد اب اردو ٹیچروں کی تقرری کا معاملہ اور پیچیدہ بنا دیا گیا ہے۔ کانٹریکٹ ٹیچر ویلفیئر اردو ایسوسی ایشن کے نگراں شمس الدین نے روزنامہ راشٹریہ سہارا کو بتایا کہ انھوں نے کپل سبل سے مطالبہ کیا کہ وہ اس معاملے میں فوری طور سے مداخلت کرتے ہوئے ایم سی ڈی میں اردو ٹیچروں کی تقرری کو یقینی بنائیں۔ کپل سبل نے انھیں یقین دہانی کرائی ہے کہ وہ اس معاملے پر سنجیدگی سے غور کریں گے اور جلد ہی اس کا کوئی حل نکالا جائے گا۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا'، دہلی 4 جولائی 2012

مشترکہ ثقافت اور فارسی

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرشین ریسرچ سینٹر (انسٹی ٹیوٹ برائے تحقیقات فارسی) کے زیراہتمام 'ہندوستان کی مشترکہ ثقافت پر فارسی زبان و ادب کے اثرات' موضوع پر سالانہ خطبہ پیش کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر سید شاہد مہدی نے کہا کہ فارسی زبان نے ہندوستانی ثقافت کو کافی متاثر کیا ہے اور ہندوستان کی علاقائی زبانوں پر بھی فارسی کا کافی اثر رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پشتو، سندھی، کشمیری اور اردو زبانوں کا رسم الخط فارسی میں ہے۔ انھوں نے کہا کہ فی الوقت پٹنہ میں واقع خدابخش لائبریری، رام پور کی رضا لائبریری اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں فارسی کتب اور مخطوطات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ملک کا واحد ایسا تعلیمی ادارہ ہے جہاں آج بھی فارسی کی کتابوں اور مخطوطات پر تحقیقی عمل جاری ہے۔ ایران کلچر ہاؤس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی دہقانی نے کہا کہ ہندوستان اور ایران کے ثقافتی رشتے کافی قدیم ہیں اور ان دونوں ممالک کی ثقافت نے ایک دوسرے کو متاثر کیا ہے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائر) ضمیرالدین شاہ نے کہا کہ ان کے گھر میں فارسی مادری زبان کے طور پر بولی جاتی تھی۔ علی گڑھ میں آج بھی فارسی تہذیب زندہ ہے اور وہ اس کے فروغ میں بھرپور تعاون پیش کریں گے۔

روزنامہ'ہمارا سماج' دہلی، 8 جولائی 2012

اردو خواندگی مراکز کے سالانہ جلسے کا انعقاد

نئی دہلی: اردو اکادمی دہلی گزشتہ 24 سال سے ہر سال دہلی کے مختلف علاقوں میں تقریباً 200 اردو خواندگی مراکز قائم کرتی رہی ہے، جن میں ان بچوں نوجوانوں اور بزرگوں کو اردو سکھائی جاتی ہے اور اردو کے ذریعے حساب وغیرہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ان مراکز میں تقریباً پانچ ہزار طالب علموں کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ کورس کے اختتام پر

وزارت برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند کے ادارے سینٹر ریسورس سینٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی نگرانی میں امتحان لیا جاتا ہے۔ اردو اکادمی نے اب تک تقریباً اسّی ہزار افراد کو اردو سکھائی ہے۔ ایسے طالب علموں میں تقریباً نوے فیصد لڑکیاں اور ہر عمر کی خواتین شامل ہیں۔ 11 جولائی کو تالکٹورہ انڈور اسٹیڈیم کے وسیع و عریض ہال میں سالانہ جلسہ منعقد کیا گیا جس میں تقریباً چار ہزار خواتین و بچیوں نے شرکت کی۔ دہلی کی وزیر اعلیٰ محترمہ شیلا دکشت نے خواندگی مراکز کے ان انسٹرکٹرز کو اکادمی کی جانب سے شیلڈ، سرٹیفکیٹ اور نقد رقم پیش کی جن کے مراکز کے طالب علموں نے امتحانات میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان طالب علموں کو بھی انعامات دیے گئے جنھوں نے بہتر نتائج حاصل کیے تھے۔ وزیر اعلیٰ محترمہ شیلا دکشت نے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو اکادمی دہلی وہ کام کررہی ہے جس کی آج اشد ضرورت ہے ہم نے ان بچیوں کے دلوں میں علم کی شمع روشن کردی ہے اب اس کو جلائے رکھنا ان کا کام ہے۔ محترمہ

شیلا دکشت نے انعامات کی رقم میں اضافے کا اعلان بھی کیا سالانہ جلسے کی صدارت فرماتے ہوئے وزیر صحت اور خاندانی بہبود حکومت دہلی پروفیسر کرن والیہ نے کہا کہ اردو اکادمی میری سب سے پسندیدہ اکادمی ہے کیونکہ یہ تعلیم کے میدان میں اور خاص طور سے خواتین وبچیوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کام کررہی ہے وہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک نعمت ہے۔ پروفیسر کرن والیہ نے اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اخترالواسع اور سکریٹری انیس اعظمی کو مبارکباد دی کہ یہ دونوں حضرات اکادمی کوعوام کے روبرولانے کے لیے کوشاں ہیں اور اکادمی کے اغراض ومقاصد حاصل کرنے کے لیے نہ صرف سنجیدہ ہیں بلکہ عملی اقدامات بھی کررہے ہیں۔ جلسے کے آغاز میں اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اخترالواسع نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں کہا کہ وزیراعلیٰ دہلی اکادمی کے کاموں میں جس طرح دلچسپی لیتی ہیں اور وقت وقت پر ہماری رہنمائی کرتی ہیں اس سے ہمیں کام کرنے کا مزید حوصلہ ملتا ہے۔

پریس ریلیز، اردو اکادمی دہلی، 12 جولائی 2012

قومی یکجہتی کانفرنس ومشاعرہ

نئی دھلی: ملک کے نوجوان رہنما راہل گاندھی کی یوم پیدائش کے موقعے پر ایوان غالب ماتا سندری روڈ نئی دہلی میں آج قومی یکجہتی کانفرنس، مشاعرہ اور کوی سمیلن کا انعقاد کیا گیا جس کا اہتمام آل انڈیا انجمن آواز انسانیت اور مجاہد آزادی محمد یوسف میموریل سوسائٹی نے مشترکہ طور پر کیا تھا۔ اس موقعے پر راہل گاندھی کی شخصیت اور

ایوان غالب میں راہل گاندھی کی سالگرہ کے موقعے پر 'یوا راشٹر نائک راہل گاندھی' کتاب ریلیز کرتے ہوئے مرکزی وزیر کپل سبل اور ان کے ہمراہ محمد شیر خاں، خواجہ خلیل اللہ، اے رحمن، گلزار دہلوی، انیس درانی، عشرت جہاں، ڈاکٹر پرویز، چودھری متین احمد و دیگر

کارنامے پر ایک کتاب 'یوا راشٹر نائک' کا اجرا وزیر تعلیم کپل سبل کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس کتاب کے مصنف شیر خان ہیں جن کا تعلق راجستھان سے ہے۔ کانفرنس میں ملک کی معزز شخصیات موجود تھیں جن میں پدم شری بیکل اتساہی بلرام پوری، پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی، خواجہ خلیل اللہ، پروفیسر صادق، اسد رضا، اے رحمان ایڈووکیٹ، انجم عثمانی، فاروق ارگلی، جے پرکاش اگروال، چودھری متین احمد، انیس درانی وغیرہ بطور خاص موجود تھے۔ مہمان خصوصی وزیر تعلیم کپل سبل نے کہا کہ اردو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے اور یہ ہندوستان میں باقی رہے گی اور اس کی بقا وترقی کے لیے حکومت ہر ممکن قدم اٹھائے گی۔ قومی یکجہتی کے حوالے سے پروفیسر صادق نے کا کہ یکجہتی کائنات کے ذریں اصولوں میں سے ہے، اس کے بغیر کوئی بھی کام انجام نہیں دیا جاسکتا۔ راشٹریہ سہارا اردو کی تمام اشاعتوں کے سربراہ اسد رضا نے کہا کہ اس وقت جب زبان اور مذہب کے نام پر اس ملک کو تقسیم کرنے کی سازش ہورہی ہے ان حالات میں قومی یکجہتی کی ملک کو شدید ضرورت ہے۔ ممبر پارلیمنٹ جے پرکاش اگروال نے کہا کہ گنگا جمنی تہذیب کا دارومدار اب اس ملک کے نوجوانوں پر ہے۔ معروف شاعر گلزار دہلوی نے کہا کہ اردو اور مسلم اقلیت سے ملک کی سالمیت وابستہ ہے۔ کانگریس لیڈر مہندر جوشی، چودھری متین احمد اور رام نارائن مینا نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 جون 2012

اردو کی ترقی کے لیے ملک میں مزید 100 مراکز کا قیام: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

حیدر آباد: اردو زبان کی ترقی کے لیے قائم کی گئی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے ملک میں مزید

ایک سو مراکز قائم کیے جائیں گے۔ اردو کے لیے عصری تکنالوجی کا استعمال ڈجیٹل طریقہ کار اور کمپیوٹرس کے استعمال کو ترقی دی جائے گی۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے یہ بات بتائی۔ وہ یہاں اکیسویں صدی میں اردو کے موقف کے متعلق عنوان پر ایک قومی سمینار سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کوئی محدود علاقائی زبان نہیں بلکہ یہ بین الاقوامی زبان ہے۔ انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اردو تعصب کا شکار رہی۔ انھوں نے کہا کہ مرکزی حکومت اردو کی ترقی میں سنجیدہ ہے اور اس کے لیے کئی اقدامات کررہی ہے۔ اردو کے سافٹ ویئر کو کونسل کی جانب سے عام کیا جارہا ہے۔ پرنسپل سکریٹری ثانوی تعلیم مسٹر راجیشور تیواری آئی اے ایس نے سیمینار کا افتتاح کیا۔ انھوں نے کہا کہ حکومت نے تعلیم کو فروغ دینے 15 ہزار کروڑ روپے کا بجٹ مختص کیا ہے۔ اساتذہ کا تقرر تنخواہوں کی ادائیگی، اسکول کی عمارتوں کی تعمیر اور دیگر سہولتیں فراہم کی جارہی ہیں۔ تعلیمی کمیٹی کے صدر محمد جلیل پاشا نے اردو تعلیم کے مسائل کے بارے میں واقف کرایا۔ ناپملی ایجوکیشن کیمپس میں طالبات کے لیے ووکیشنل کورس کو متعارف کیا گیا۔

روزنامہ 'اعتماد' حیدرآباد، 18 جون 2012

ساحر کی یاد میں محفل نغمہ وموسیقی

نئی دھلی: ہندوستانی فلم صنعت کے 100 سال پورے ہونے پر صدی تقریبات کے سلسلے میں معروف شاعر اور فلمی نغمہ نگار ساحر لدھیانوی کی یاد میں منڈی ہاؤس کے نزدیک کمانی آڈیٹوریم میں معروف موسیقار کرشنا راگھو، ابھیمنیو پبلی کیشنز کے شکتی ملک اور اردو اکادمی دہلی کے اشتراک سے 'ساحر کے قلم سے' کے نام سے ایک شاندار شام نغمہ وموسیقی پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام میں سابق نائب وزیراعظم اور بی جے پی کے سینئر لیڈر لال کرشن اڈوانی نے اپنی اہلیہ کے ساتھ شرکت کی۔ پروگرام کے مہمان خصوصی سابق چیف الیکشن کمشنر آف انڈیا ڈاکٹر ایس وائی قریشی تھے، جب کہ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر اخترالواسع، وجیندر گپتا، مشہور صحافی وسابق ممبر پارلیمنٹ شاہد صدیقی نے شرکت کی۔ بعد ازاں میڈیا سے بات کرتے ہوئے اخترالواسع نے کہا کہ ساحر شاعر نہیں ساحر ہیں۔ وہ ایک مختلف انداز سے سوچتے تھے۔ انھوں نے فلمی دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنی ادبی شناخت کو کم نہیں ہونے دیا۔ وہ ان چند شعرا میں سے ہیں جن کی ادبی شاعری اور فلمی شاعری میں کوئی فرق نہیں ملے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 جون 2012

دھلی:

اردو مشاعرے گنگا جمنی تہذیب کے امین

نئی دھلی: قومی ایکتا پر منعقد اس معاشرہ میں ہر مذہب وملت کی شرکت یہ واضح کررہی ہے کہ ہم مشترکہ تہذیب کے وارث ہیں۔ ان خیالات کا اظہار شمال مشرقی ضلع دہلی سے ممبر پارلیمنٹ جے پرکاش اگروال نے دہلی اردو اکادمی کے زیر اہتمام قومی ایکتا مشاعرہ کے دوران کیا۔ جعفرآباد کے زینت محل اسکول میں منعقد اس مشاعرہ کی ابتدا جے پرکاش اگروال، ممبر اسمبلی و دہلی وقف بورڈ کے چیئرمین چودھری متین احمد اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اخترالواسع اور سکریٹری انیس اعظمی و جاوید برقی وغیرہ نے شمع ادب روشن کرکے کی۔ اگروال نے اپنے خطاب میں کہا کہ ایک زمانہ میں قدیمی دہلی میں میر مشتاق، عبدالستار، احمد علی قریشی، راجہ رمن، لالہ شیام

حسرت موہانی کی ادبی وقومی خدمات

نئی دھلی: مجاہد آزادی، صحافی، شاعر، ممبر پارلیمنٹ اور دانشور مولانا حسرت موہانی کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایک قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔'حسرت موہانی کی ادبی وقومی خدمات' کے موضوع پر منعقد اس 2 روزہ قومی سیمینار کا افتتاح پروگرام کے مہمان خصوصی وحکومت ہند نے سابق چیف الیکشن کمشنر ایس یعقوب قریشی نے کیا جب کہ پروگرام کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کی۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی۔ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے ایس یعقوب قریشی نے حسرت موہانی کی زندگی کے تعلق سے کہا کہ حسرت موہانی کی زندگی صعوبتوں میں گزری ایک مجاہد آزادی کی حیثیت سے انھیں جیل میں سخت سے سخت سزائیں دی جاتیں، روزانہ ان سے ایک من گیہوں پسوایا جاتا، گندے اور بدبودار کپڑے پہنائے جاتے اور انھیں خواہ مخواہ ایک جیل سے دوسری جیل میں منتقل کیا جاتا لیکن اُس کے باوجود انھوں نے ہمت نہ ہاری اور اپنے مشن سے وابستہ رہے۔ افتتاحی جلسے کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے معروف نقاد پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ حسرت موہانی محض شاعر ہی نہیں ایک عظیم انقلابی اور ماہر شعریات بھی تھے۔ انھوں نے حسرت کے اردوئے معلیٰ کی دانش ورانہ خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر قاسمی نے کہا کہ حسرت موہانی نے غالب ومیر سے الگ مقام بنایا اور غزلوں کو ایک نئی پہچان دی۔ اس سے قبل استقبالیہ تقریر میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے تمام مہمانان کا خیر مقدم کرتے ہوئے مولانا حسرت موہانی کی علمی، ادبی اور سیاسی زندگی کے تعلق سے کہا کہ وہ جرأت مند ادیب، صحافی اور مجاہد آزادی تھے۔ انھوں نے جس میدان میں بھی طبع آزمائی کی اس فن کو وقار عطا کیا۔ حیدرآباد میں ترقی پسند تحریک کے جلسے میں سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کی مخالفت اور انھیں ادب سے خارج کیے جانے کی تجویز کی حسرت موہانی نے سخت مخالفت کی تھی۔ سیمینار کی افتتاحی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے شاہد مہدی نے کہا کہ حسرت موہانی پر ابھی مزید تحقیق وتنقید کی ضرورت ہے اور ابھی تک حسرت موہانی کی کوئی بھی معیاری سیاسی سوانح حیات سامنے نہیں آپائی ہے۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر رضا حیدر نے مولانا حسرت موہانی کی سیاسی، سماجی وادبی خدمات اور پروگرام کے مہمانان کا تعارف پیش کیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر شاہد ماہلی نے تمام مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ کے استاد ضمیر احمد نے حسرت موہانی کی غزلوں سے سامعین کو محظوظ کیا۔ پروگرام میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار، پروفیسر عزیز الدین حسین، ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر خالد علوی، ڈاکٹر رضوان قیصر، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی، ڈاکٹر ادریس احمد، اقبال مسعود فاروقی، جاوید رحمانی، سلیم امروہوی کے علاوہ متعدد ادبی اور علمی شخصیات موجود تھیں۔

نئی دہلی غالب انسٹی ٹیوٹ میں دو روزہ حسرت موہانی سیمینار کی افتتاحی تقریب میں خطاب کرتے ہوئے ایس وائی قریشی اور بیٹھے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، شاہد مہدی اور شاہد ماہلی۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا' دہلی،15 جولائی2012

ناتھ، ایچ کے ایکل بھگت لالہ رام شرن اگروال جیسے لوگوں نے اردو اور اس سے وابستہ تہذیب کی حفاظت کی اور آج جمنا پار بھی اس کے امین علاقوں میں شمار ہورہا ہے جہاں چودھری متین احمد جیسے عاشق اردو موجود ہیں جو ہمیشہ اردو زبان کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ ممبر اسمبلی و دہلی وقف بورڈ کے چیئرمین چودھری متین احمد نے کہا کہ دہلی اسمبلی میں اردو اور اردو والوں کے تعلق سے سوال لگانے میں ہمیشہ آگے رہا ہوں جس کی مثال سیلم پور حلقہ کے لیے الگ سے اردو اسکول کا پاس ہونا ہے۔ اس موقعے پر چودھری متین احمد نے شعرا کرام کو اکادمی کی جانب سے دیا جانے والا نذرانہ بھی بڑھانے کی حمایت کی اور کہا کہ دہلی وقف بورڈ بھی اس میں مدد کرنے کو تیار ہے۔ اکادمی کے وائس چیئرمین اور اسلامی اسکالر پروفیسر اختر الواسع نے استقبالیہ خطبے میں کہا کہ ہمیں یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ اردو خواندگی مراکز یہاں قائم ہیں جو اردو اکادمی چلائی ہے۔ انھوں نے کہا آزاد ہندوستان میں جمنا پار دہلی کی اردو تہذیب کا مرکز بن کر سامنے آیا ہے۔ اردو مشاعرے ہمیں بہت کچھ سکھاتے ہیں۔ لہٰذا یہ مشاعرے صرف کلام سننے کے لیے نہیں بلکہ تہذیب وتمدن قائم رکھنے کے لیے بھی ضروری ہیں۔ اختر الواسع نے اردو میڈیم اسکولوں کی بات کرتے ہوئے کہا کہ سیلم پور میں نیا اردو اسکول کھولنے کی بات سرکار نے کی ہے لیکن اردو اسکول بنے ہیں تو وہاں اردو جاننے والے پرنسپل، اساتذہ بھی ہونے چاہئیں اور نصاب بھی وقت پر فراہم ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہماری بنیادی ضرورت ہے جس کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کا حق ہمیں ملک کے دستور کی دفعہ 50اے دیتی ہے جس میں والدین کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنی پسندیدہ زبان میں تعلیم دلوا سکتے ہیں۔ ہمیں اردو سے کوئی محروم نہیں کرسکتا ہے۔

روزنامہ'صحافت' دہلی،25 جون2012

اردو وراثت میلہ بہادر شاہ ظفر کو منسوب

نئی دھلی: اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع اور سکریٹری اردو اکادمی انیس اعظمی نے دہلی کی وزیر اعلیٰ شیلا دکشت کی رہائش گاہ پر ان سے ملاقات کی۔ سکریٹری نے اکادمی کی سرگرمیوں سے متعلق تفصیلات پیش کیں۔ وزیر اعلیٰ نے ایگزیکیٹو کمیٹی و دیگر ذیلی کمیٹیوں کی منظوری بھی دی۔ اردو وراثت میلے کے انعقاد پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اس بار یہ میلہ بہادر شاہ ظفر کے نام معنون کیا جائے کیونکہ اس سال اس عظیم فرمانروا کی وفات کو150 سال مکمل ہورہے ہیں۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی،15 جون2012

اردو اساتذہ کی تقرری دہلی حکومت کرے گی

نئی دھلی: دہلی کے وزیر تعلیم اروند سنگھ لولی نے کہا کہ اردو میڈیم اسکولوں سے تعلیم پوری کرنے کے متمنی طلبہ کی سہولت کو دھیان میں رکھتے ہوئے دہلی حکومت نے یہ فیصلہ لیا ہے کہ مشرقی دہلی کے سیلم پور میں ایک اردو میڈیم اسکول کھولا جائے گا۔ محکمہ تعلیم کے ذریعے دہلی میں تقریباً22 اسکول ہیں۔ سیلم پور میں اردو میڈیم اسکول کھلنے سے ان کی تعداد 23 ہوجائے گی۔ اس کے علاوہ 130 اسکول ایسے ہیں جہاں اردو میڈیم تعلیم کا انتظام ہے۔ لولی نے کہا کہ دہلی کے اسکولوں میں تقریباً100 اردو اساتذہ کا تقرر کیا جائے گا اس سے متعلق اشتہار جلد جاری کیا جائے گا۔ اردو اساتذہ کی تقرری اب دہلی حکومت کے محکمہ تعلیم کے ذریعے کی جائے گی نہ کہ اردو اکادمی کے ذریعہ۔ یہ فیصلہ آج دہلی سکریٹریٹ میں منعقد ایک میٹنگ کے دوران کیا گیا۔ غور طلب ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک حکومت نے ایک بھی اردو میڈیم اسکول قائم نہیں کیا

تھا لیکن آج کا فیصلہ ایک تاریخی فیصلہ ہے اور محبان اردو کے لیے خوش آئند ہے۔ دوسری جانب سیلم پور حلقہ کے رکن اسمبلی چودھری متین احمد نے اس فیصلہ کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک اچھا فیصلہ ہے اردو میڈیم اسکول کھل جانے سے ہمارے بچے اردو کی تعلیم لے سکیں گے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 جون 2012

اردو اکادمی، کی کارکردگی بہت بہتر ہوگی: اخترالواسع

نئی دهلی: کل شام اردو اکادمی، دہلی کی گورننگ کونسل کی تشکیل نو کے بعد ممبران کی پہلی غیر رسمی نشست کا اہتمام اردو اکادمی دہلی میں کیا گیا۔ اس کا مقصد ممبران کی ایک دوسرے سے ملاقات اور آئندہ اکادمی کے کاموں کو پرزور طور پر کرنے اور منصوبہ سازی سے متعلق تھا۔ سکریٹری اردو اکادمی نے اکادمی کے وائس چیئر مین اور گورننگ کونسل کے تمام ممبران کا خیرمقدم کرتے ہوئے اُن کا استقبال کیا اور بتایا کہ اکادمی کی روایت رہی ہے کہ اکادمی وائس چیئر مین کی سرپرستی میں اور فاضل ممبران کے

مشوروں پر عمل کرتے ہوئے تمام اسکیموں کو سرانجام دیتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ دلّی کی وزیر اعلیٰ اور اکادمی کی چیئر پرسن محترمہ شیلا دکشت نے وائس چیئر مین پروفیسر اخترالواسع کی بے لوث خدمات کے اعتراف میں انھیں دوبارہ اکادمی کا وائس چیئر مین منتخب کیا ہے۔ وائس چیئر مین نے تمام ممبران کا پھولوں کے گلدستے سے فرداً فرداً خیرمقدم کیا اور کہا کہ میں وزیراعلیٰ کا مشکور ہوں جنھوں نے اس بار بہترین اور نمائندہ علمی ادبی اور ثقافتی وصحافتی شخصیات کا انتخاب کرکے اردو زبان کے تئیں اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ آپ جیسے نامور وتجربہ کار اشخاص کے تعاون سے اکادمی کی کارکردگی یقیناً پہلے سے بہتر ہوگی۔

پریس ریلیز، اردو اکادمی، دہلی 20 جون 2012

امریکی اردو طلبا اینگلو عربک اسکول میں

نئی دهلی: امریکہ میں اردو کا مستقبل روشن ہے۔ وہاں اردو کا گراف اوپر جارہا ہے۔ امریکہ میں اردو لکھنے، پڑھنے اور اردو سیکھنے والوں کے لیے روزگار کے بھی کافی مواقع ہیں اور ان کے لیے درس وتدریس کے علاوہ انٹیلی جینس، بزنس اور این جی اوز میں ملازمت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار امریکہ سے آئے ہوئے طلبا کے ایک وفد کے ارکان نے اینگلو عربک سینئر سکنڈری اسکول کے دورے کے دوران کیا۔ اس وفد میں امریکہ کے ٹیکساس میں واقع نارتھ کیرولینا یونیورسٹی کے شعبہ ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کے 12 طلبا، فیرنک، لوکس، اسکول، کیٹلن، وین ڈان، آئی وی، کیرلی، مشیل، کمیل، جمیس، ادیتی اور کوٹنی کے علاوہ پروفیسر افروز تاج اور پروفیسر جان کالڈ ویل شامل ہیں۔ دورے کے دوران پروفیسر افروز تاج نے کہا کہ اردو زبان کا فروغ صرف سمیناروں کے انعقاد سے نہیں ہوگا بلکہ غیر اردو والوں کو اردو زبان سکھا کر ہوگا۔ افروز تاج نے مزید بتایا کہ امریکہ میں اردو اور ہندی میں زیادہ فرق نہیں سمجھا جاتا کیونکہ یہ دونوں زبانیں بولنے میں ایک جیسی ہیں اور اسی وجہ سے وہاں اسے اردو- ہندی یا ہندی-اردو کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پروفیسر جان کالڈ ویل نے امریکہ میں اردو ہندی کی درس وتدریس کے تعلق سے بتایا کہ وہاں ساؤتھ ایشین لینگویج اسٹڈی کے تحت بی اے کے کورس میں اردو-ہندی پڑھنا لازمی ہے اور 4 سالہ اردو کورس میں اس وقت تقریباً 200 طلبا زیر تعلیم ہیں۔ انھوں نے بتایا اگلے 5 سال کے اندر یہاں اردو میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کا کورس بھی شروع کردیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ان کی یونیورسٹی کی جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بات چیت چل رہی ہے۔ فیروز بخت احمد نے امریکی طلبا کے وفد کا یہ مکمل تعارف کراتے ہوئے وفد کے ارکان کو اسکول کی مکمل تاریخ بتائی اور کہا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے یہاں درس وتدریس کی خدمات انجام دی جارہی ہیں اور یہاں کئی انگریز پرنسپل کے عہدے پر فائز رہ چکے ہیں۔ فیروز بخت احمد نے امریکی طلبا سے کہا کہ اس اسکول سے مرزا غالب، سرسید احمد خان، مولانا ابوالکلام آزاد اور پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان سمیت کئی تاریخی شخصیات وابستہ رہ چکی ہیں۔ اسکول کے موجودہ قائم مقام پرنسپل ابرار احمد نے اسکول کی مکمل تاریخ بیان کرتے ہوئے کہا کہ 1692 میں مغل بادشاہ اورنگ زیب کے ایک جرنل غازی الدین خان نے فصیل بند شہر کے اجمیری دروازہ کے باہر اس مدرسہ (اسکول) غازی الدین خان کی بنیاد رکھی تھی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 جولائی 2012

اردو اسکولوں کو اَپ گریڈ کیا جائے گا

نئی دهلی: دہلی کے وزیر تعلیم اروند سنگھ لولی نے کہا کہ اردو میڈیم میں زیر تعلیم طلبا کی خواہشات پوری کرنے اور ان کی سہولیات کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ دہلی کے تمام اردو میڈیم اسکولوں کو بارہویں جماعت تک اپ گریڈ کیا جائے جس سے درمیان میں اردو میڈیم ترک کرنے والے بچوں کو انھی کی زبان میں اعلیٰ تعلیم کی سہولت حاصل ہو۔ وزیر تعلیم نے کہا کہ اردو دہلی کی دوسری سرکاری زبان ہے، اس کے مدنظر سرکار کی یہ ذمے داری ہے کہ اردو زبان کی زیادہ سے زیادہ ترقی ہوسکے۔ اردو زبان اور اردو میڈیم اسکولوں کے مسائل حل کرنے کے لیے دہلی سکریٹریٹ میں منعقدہ جائزہ میٹنگ میں حکومت دہلی کے توانائی اور خوراک ورسد وزیر ہارون یوسف کے علاوہ محکمہ تعلیم کے سکریٹری دیوان چند، محکمہ کے ڈائرکٹر امت سنگلا سمیت اردو میڈیم اسکولوں کے سربراہ، اساتذہ اور تمام متعلقہ افسران موجود تھے۔ وزیر خوراک ورسد ہارون یوسف نے اس موقعے پر کہا کہ اردو کی تعلیم اور اردو زبان کی ترقی کے لیے حکومت دہلی نے کئی مثبت قدم اٹھائے ہیں۔ اردو اسکولوں میں اساتذہ کے مسائل کو دور کرنے کے لیے اساتذہ کی بحالی کا عمل شروع کردیا گیا ہے جس سے اسکولوں کو جلد ہی اہل اساتذہ فراہم ہوجائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ سیلم پور اردو اسکول شروع ہوجانے کے بعد دہلی میں اردو سکولوں کی تعداد 22 ہوجائے گی۔ علاوہ ازیں 130 اسکول ایسے ہیں جہاں پر اردو زبان کی تعلیم کا انتظام ہے۔ انھوں نے کہا کہ دہلی کے اسکولوں میں لگ بھگ 100 اساتذہ کی بحالی جلد ہی کی جائے گی جس کے لے اشتہار جاری کردیا گیا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 10 جولائی 2012

آندھرا پردیش :

اردو کے مستقبل پر مذاکرہ

حیدرآباد: اردو کے فروغ کے لیے عملی انقلابی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ سرکاری اداروں پر تکیہ کرنے کے بجائے خود اردو والوں کو مشنری طرز کے اردو ماڈل پرائمری اسکولس محلّہ واری سطح پر قائم کرنا چاہیے اردو ایک تہذیبی ثقافتی اور مذہبی ورثہ ہے۔ اس کا تحفظ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار عابد علی خان اسسٹنٹ کمشنر نے میونسپل حیدرآباد 'اردو کا مستقبل' کے زیر عنوان 9 جون کو مسدوسی ہال مغل پورہ میں بزم جوہر

کے مذاکرے سے اپنے صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ ڈاکٹر مرق سلیم نائب صدر انجمن ترقی اردو نے کہا کہ اردو اکادمی آندھراپردیش کو چاہیے کہ اردو داں پن اسکولس اسکیم کو پھر سے شروع کرے۔ فروغ اردو کے لیے اردو کی ابتدائی معیاری تعلیم کا نظم کرتے ہوئے اردو ماڈل پرائمری اسکولس قائم کرے۔ محمد علی حسین سرپرست انجمن ترقی اردو نے کہا کہ اردو کو ایک خاص طبقے سے مخصوص کردیا گیا ہے جس کے باعث اردو تعصب کا شکار ہوگئی۔ حمید الظفر سابق پی آر او اردو اکادمی آندھراپردیش نے کہا کہ اردو کو غیر روزگار آمیز زبان سمجھ کر خود اردو والوں نے اسے نظرانداز کردیا۔ مسعود فضلی ادیب وصحافی نے کہا کہ اردو سارے ہندوستان میں بولی پڑھی لکھی جاتی ہے۔ اس موقعے پر مولانا نادر المسدوسی صدر بزم علم و ادب، ڈاکٹر بشیر احمد، ڈاکٹر راہی وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 12 جون 2012

اتر پردیش

نازش پرتاپ گڑھی کی شاعری پر سیمینار

پرتاپ گڑھ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور اشفاق اللہ خاں میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام نازش پرتاپ گڑھی کی ادبی خدمات کے موضوع پر رجت پیلس میں سیمینار منعقد ہوا جس کی صدارت بزرگ شاعر امتیاز

سیمینار میں ڈائس پر بیٹھے (دائیں سے) امتیاز الدین خاں، ایس ایم اے کاظمی اور ڈاکٹر علی احمد فاطمی

الدین خاں نے کی۔ سیمینار میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک سابق ایڈوکیٹ جنرل اور اقلیتی کمیشن کے چیئرمین ایس ایم اے کاظمی نے کہا کہ نازش کی قومی شاعری اور آج یوم مادر کے موقعے پر ان کو یاد کیا جانا ایک خوبصورت اتفاق ہے۔ انھوں نے کہا کہ نازش پرتاپ گڑھی کی شخصیت، افکار اور شاعری ترجمان ہیں اس حب الوطنی کی جس سے ہندوستان کے 20 کروڑ مسلم عوام اور سرشار ہیں۔ اس موقعے پر عبداللہ سلمان ریاض قاسمی ایڈیٹر ماہنامہ 'پیام انسانیت' عارف حسین جونپوری، امتیاز الدین خاں، ڈاکٹر علی احمد فاطمی، پروفیسر یعقوب یاور، ڈاکٹر عبدالباری نے نازش پرتاپ گڑھی کی شاعری کے مختلف گوشوں پر پُرمغز مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' 13 مئی 2012

آزادی کی لڑائی میں اردو کا اہم رول: اکھلیش

لکھنؤ: اترپردیش کے وزیراعلیٰ اکھلیس یادو نے کہا ہے کہ آزادی کی لڑائی سے لے کر ملک کی خوش حالی اور ترقی میں اردو کا بہت بڑا رول رہا ہے۔ مسٹر یادو 14 جولائی کو لکھنؤ میں سابق آئی اے ایس افسر انیس انصاری کے شعری مجموعہ 'ادھوری حکایت' کا افتتاح کر رہے تھے۔ مسٹر یادو نے کہا کہ اس ریاست کو خوش حال بنانے میں اردو کا خصوصی رول رہا ہے۔ اردو نے آزادی کی لڑائی کو مضبوطی فراہم کی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 جولائی 2012

اردو عربی فارسی یونیورسٹی کے نام کی تبدیلی

لکھنؤ: مانیہ ورکانشی رام اردو عربی فارسی یونیورسٹی کا نام تبدیل کرکے اب مشہور صوفی بزرگ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے نام پر رکھا جائے گا۔ سرکاری ذرائع نے یہ اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ خواجہ معین الدین چشتی ہر طبقے کے لیے نہایت محترم بزرگ ہیں۔ خواجہ غریب نواز کے نام سے مشہور بزرگ حضرت چشتی کا مزار اجمیر شریف میں مرجع خلائق ہے۔ خواجہ غریب نواز کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے کئی کتابیں تحریر کی ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ انقلاب نے گزشتہ 11 جون کو سب سے پہلے یہ خبر شائع کی تھی کہ یونیورسٹی کا نام تبدیل کرنے پر حکومت کی سطح پر غور وخوض کیا جارہا ہے اور اس سلسلے میں جلد ہی کوئی فیصلہ متوقع ہے جن ناموں پر غور ہورہا تھا ان میں امیر خسرو، خواجہ معین الدین چشتی، علامہ اقبال، مرزا غالب، شاہ ولی اللہ دہلوی سمیت 10 نام شامل تھے۔ ایک مطالبہ یہ بھی ہورہا تھا کہ یونیورسٹی کا نام صرف 'یوپی اردو عربی فارسی یونیورسٹی' رہنے دیا جائے۔ یونیورسٹی کا نام تبدیل کرنے کے لیے اب حکومت کو یونیورسٹی ایکٹ میں ترمیم کرنی ہوگی جس کا فیصلہ کابینہ کی میٹنگ میں ہوگا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 جولائی 2012

ہیلتھ اسکیموں کی تشہیر اردو میں بھی

لکھنؤ: اقلیتی علاقوں میں صحت سے جڑی اسکیموں کے اشتہاری پروگرام میں اردو زبان کا استعمال ہوگا۔ مسلم اکثریتی حلقوں میں اس بارے میں مہم چلائی جائے گی۔ این ایچ آر ایم کے اعلیٰ افسران نے فرمان جاری کر اس سے متعلق ہدایت جاری کی ہے ابھی تک صحت محکمہ میں سبھی کام کاج ہندی اور انگریزی میں ہوتے تھے۔ صحت اور کنبے سے جڑی اسکیموں کی جانکاری کو اردو میں بھی شائع کیا جائے گا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 19 جون 2012

الہلال صدی تقریبات

لکھنؤ: ہندستان کی صحافتی تاریخ میں 'الہلال' کی حیثیت مینارۂ نور کی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے ذریعے جہاں ہندستانی سماج کو بیدار کیا وہیں تحریک آزادی کے کارواں کو بھی اس سے مہمیز کیا۔ ان خیالات کا اظہار عالمی شہرت یافتہ ادیب اور نقاد پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی لکھنؤ کیمپس کے زیر اہتمام یوپی پریس میں منعقدہ الہلال صدی تقریبات کے موقع پر کلیدی خطبے کے دوران کیا۔ اس موقع پر انھوں نے یہ بھی کہا کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی اردو کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ انھوں نے مولانا آزاد کے سیاسی نظریات اور دوقومی نظریے پر بھی روشنی ڈالتے

ہوئے کہا کہ ملک مولانا آزاد کی خواہش کے برخلاف تقسیم ہوا۔ صدارت کے فرائض پروفیسر شارب ردولوی نے انجام دیے جبکہ نظامت ڈاکٹر عمیر منظر نے کی۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد الہلال کے ذریعے مسلمانوں کو احساس کمتری سے نکال کر قومی دھارے میں شامل کرنا چاہتے تھے اور پہلی ناکام جنگ آزادی کے بعد جو خوف وناامیدی تھی اسے خوش آئند مستقبل میں تبدیل کرنے کے خواہاں تھے۔ انھوں نے صحافت کے عام رویے کو جو صرف رپورٹنگ تک محدود تھا یکسر تبدیل کردیا۔ اس طور پر الہلال خبر کا نہیں بلکہ فکر کا اخبار تھا۔

پریس ریلیز لکھنؤ، اترپردیش، 12 جولائی 2012

اتراکھنڈ

اردو ہندوستانی تہذیب کا خوبصورت پیکر ہے: گورنر اتراکھنڈ

اتراکھنڈ: اردو زبان ہماری مشترکہ ہندوستانی

تہذیب کی زندہ علامت ہے اور جدید ہندوستانی زبان بھی۔ حضرت بابا فریدؒ، حضرت امیر خسروؒ جیسے صوفیا اور سنتوں کے ذریعے وجود میں آنے والی اردو زبان خود ہندوستانی تہذیب کا خوبصورت پیکر ہے۔ یہ بات جناب ڈاکٹر عزیز الدین قریشی گورنر اتراکھنڈ نے پروفیسر تنویر چشتی سجّادہ نشین درگاہ حضرت شاہ ولایت منگلوری کے ساتھ ایک ملاقات میں کہی۔ موصوف نے یہ بھی کہا کہ تعلیماتِ تصوّف اور بھکتی کو تعلیمی نصاب میں شامل کیا جانا چاہیے۔ گورنر نے پروفیسر تنویر چشتی کے ساتھ تصوّف، اتراکھنڈ میں اردو زبان و ادب کے منظر نامہ نیز پروفیسر عنوانؔ چشتی (مرحوم) کی خدمات پر مفصل گفتگو میں کہا کہ پروفیسر عنوان چشتی سے میں خوب واقف ہوں وہ میرے دیرینہ دوست تھے۔ پروفیسر عنوان چشتی کی تنقید و تحقیق کے بعد اردو والوں کو بعض فیصلے بدلنے پڑے اور کئی موقعوں پر اپنی رائے پر ازسرِنو غور کرنا پڑا۔

پریس ریلیز، ہری دوار، اتراکھنڈ، 22 جون 2012

پنجاب:

ہیرا لعل سبل کی اردو خدمات

چنڈی گڑھ: اردو ادب کی غیر معمولی خدمات کے لیے سینیئر وکیل ہیرا لعل سبل کو ان کی رہائش گاہ سیکٹر 5 میں پنجابی یونیورسٹی اور منٹو فاؤنڈیشن چنڈی گڑھ کی جانب سے 1 جون 2012 کو تہنیت پیش کی گئی۔ وکیل ہیرا لعل سبل نے مشہور و معروف افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کا تقسیم ہند سے قبل لاہور میں ان کے خلاف دائر مجرمانہ معاملات میں دفاع کیا تھا۔ نیوز لائن سے بات کرتے

ہوئے منٹو فاؤنڈیشن کی شاہدہ نے کہا کہ 1945 میں ایک اردو میگزین میں شائع ہونے والی ان کی دو تحریروں میں ان کے خلاف فحاشی کا الزام لگایا گیا تھا۔ وہ ہیرا لعل سبل ہی تھے جنھوں نے منٹو کے کیس کی پیروی کی اور کامیابی سے ان کا دفاع کیا اور یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ تحریریں تمام لوگوں کے مطالعے کے لیے آج دستیاب ہیں۔ پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ کے وائس چانسلر جسپال سنگھ نے کہا کہ یونی ورسٹی نے منٹو کی صد سالہ تقریبات کے موقعے پر ہیرا لعل سبل کو اعزاز سے نوازنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جناب سنگھ نے کہا کہ ہیرا لعل سبل نے منٹو اور عصمت چغتائی جیسے افسانہ نگاروں کا دفاع کر کے ادب کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ سبل صاحب نے منٹو کا کیس مفت میں لڑا تھا اور وہ منٹو اور ان کی تحریروں کے زبردست مداحوں کے درمیان آخری زندہ کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

انڈین ایکسپریس نیوز سروس، چنڈی گڑھ، 2 جون 2012

جموں کشمیر:

قرآن مجید کے قدیم نسخے کی نمائش

سری نگر: ریاست جموں وکشمیر کی راجدھانی سرینگر کے سنگر مال شاپنگ کمپلیکس میں ہزاروں لوگ ایک نمائش دیکھنے کے لیے آئے جن کی توجہ کا اصل مرکز آب زر سے لکھے ہوئے قرآن کریم کا ایک 400 سالہ قدیم مخطوطہ اور پانڈودور کے چار سو سال پرانے مٹی کے ظروف تھے۔ افسروں نے بتایا کہ یہ کمپلیکس 10 جون کو سیاحوں اور عوام کے لیے کھولا گیا تھا جسے دیکھنے کے لیے اب تک بیس ہزار سے زائد لوگ آئے ہیں۔ یہ نمائش 21 جون تک صبح دس بجے سے رات آٹھ بجے تک جاری رہی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 جون 2022

اردو یونیورسٹی کا سری نگر کیمپس آئندہ سال سے

حیدرآباد: سری نگر سٹیلائٹ کیمپس میں اگلے تعلیمی سال 14-2013 سے تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز ہوجائے گا۔ یونیورسٹی اسی سال ایم ایڈ کورس شروع کررہی ہے۔ بی ایڈ اور ایم ایڈ کورسز کی جانب دادی کے طلبہ بہت زیادہ راغب ہورہے ہیں۔ اسی کے پیش نظر اس سال سے ایم ایڈ کورس کا آغاز کیا جائے گا۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر محمد میاں، وائس چانسلر نے سری نگر میں پریس کانفرنس سے خطاب کے دوران کیا۔ انھوں نے کہا کہ ایم ایڈ کورس میں 35 نشستیں مخصوص رکھی گئی ہیں۔ وائس چانسلر نے کہا کہ یونیورسٹی کو کشمیر میں کیمپس قائم کرنے کے لیے حکومت نے بڈگام میں زمین فراہم کرنے کا فیصلہ کیا تو اس پر تعمیراتی کام شروع کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ انھیں امید ہے کہ تعلیمی سال 14-2013 سے کیمپس میں تدریسی سرگرمیوں کا آغاز ہوگا اور ابتدائی طور پر کئی پروفیشنل اور ووکیشنل کورسز کے علاوہ اردو، عربی، فارسی، انگریزی، اقتصادیات، سیاست اور اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے پروگرام شروع کیے جائیں گے۔ جب کہ کشمیر میں ہینڈی کرافٹس کے پیشے میں وسیع مواقع کو مدنظر رکھتے ہوئے کرافٹ ڈیزائن کورس متعارف کرانے کا بھی منصوبہ ہے۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 28 جون 2012

راجستھان:

کوٹہ یونیورسٹی کے لیے اردو نصاب کی تیاری

علی گڑھ: ''اردو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علامت اور نہایت شیریں زبان ہے۔ اسے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، جین، پارسی وغیرہ سبھی فرقوں نے اپنایا ہے۔ چندر بھان برہمن، خوب چند ذکا، لچھمی نارائن شفیق، للو لال جی، سے لے کر پنڈت دیاشنکر نسیم، منشی پریم چند، پنڈت برج نرائن، چکبست، جگت موہن لال رواں، راجندر سنگھ بیدی، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد سے ہوتے ہوئے جوگندر پال، دیویندر اسر، گیان چند جین، گوپی چند نارنگ، شیام لال کالڑا اور آج تک نہ جانے کتنے بڑے بڑے غیر مسلم دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں نے اپنے علمی، ادبی، تخلیقی و تحقیقی اور تنقیدی میدانوں میں اردو کی خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی وہ اس زبان کو سیکھنے، سکھانے، اور اس میں تخلیقی کاوشوں میں مصروف ہیں لہٰذا اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے گریجویشن کے نصابات تیار کرنے والوں کے لیے ضروری ہے زبان کی تدریس کے طریقہ کار کو سہل اور دلچسپ و دلکش بنانے کی کوشش کریں تاکہ یہ زبان ملک کے گوشے گوشے میں لکھی اور پڑھی جاسکے۔'' ان خیالات کا اظہار گزشتہ روز راجستھان میں کوٹہ اوپن یونیورسٹی کے گریجویشن کے اردو نصاب کی تیاریا کے سلسلے میں منعقد سیمینار اور ورکشاپ کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ دیتے ہوئے شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر سید محمد ہاشم نے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ آئندہ دور ریگولر ایجوکیشن کے مقابلے میں فاصلاتی تعلیم اور اوپن یونیورسٹی کا دور ہوگا۔ لہٰذا اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ روزگار سے جوڑنے والے دوسرے مضامین مثلاً ماس کام، ماس میڈیا، صحافت، ترجمہ وغیرہ کو شامل کر کے ادبی نصاب کو زیادہ وسیع و وقیع زیادہ مفید اور زیادہ معنی خیز، کثیر جہتی تعلیمی نظام کی سہولتوں کا حامل اور زیادہ سے زیادہ دلکش و جامع بنانا ہماری ذمے داری ہے۔ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروگرام کے سابق ڈائریکٹر اور شعبۂ تاریخ کے پروفیسر برجیش کمار شرما نے کہا کہ زبان ہی علم پھیلانے کا بہترین ذریعہ ہے اور اردو زبان اپنی شیرینی اور دلکشی کی وجہ سے ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے لہٰذا اس کا نصاب جس قدر پرکشش ہوگا اسی قدر طلبہ اس کی طرف متوجہ ہوں گے۔

روزنامہ 'خبر جدید' دہلی، 24 جون 2012

کرناٹک:

بیدر میں اردو صحافت

بیدر: بہتر سماج کی تعمیر وتشکیل میں صحافت کا اہم رول ہوتا ہے۔ بیدر شہر میں اردو صحافت کا ایک منفرد مقام ہے یہاں اردو کے صحافیوں کی خدمات کی وجہ سے سماجی، تعلیمی اور سیاسی میدانوں میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ جوایک مثال ہے۔ ان خیالات کا اظہار بیدر مسلم فرینڈس سرکل کے ذمے دار جناب محمد سیف الدین سہیل سے مسلم فرینڈس سرکل بیدر کی جانب سے بیدر کے نوجوان صحافی جناب محمد امین نواز نمائندہ اعتماد کو کرناٹک اردو اکادمی اور اردو جرنلسٹ فورم کرناٹک کی جانب سے ان کی صحافتی خدمات پر تہنیت اور (مومنٹو) ایوارڈ پیش کیے جانے پر تہنیتی تقریب کے انعقاد پر کام کیا۔ انھوں نے کہا کہ جناب محمد امین نواز تقریباً 20 سال سے زائد عرصے سے ریاست اور بیرون ریاست کے مختلف اخبارات اور قومی نیوز ایجنسیوں میں صحافتی خدمات انجام دیتے آرہے ہیں اور فی الحال حیدرآباد کا کثیر اشاعت اردو روزنامہ 'اعتماد' میں بطور نامہ نگار ضلع بیدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس موقع پر شجاعت علی خان، محمد اکبر گادگی، اور دیگر ذمے دارانِ سرکل نے بھی خطاب کیا۔ محمد سیف الدین سہیل نے جناب محمد امین نواز کی گلپوشی وشالپوشی بھی کی۔

روزنامہ 'انوارقوم' کانپور، 6 جون 2012

ریشمی رومال تحریک کے سو سال

گلبرگہ: ملک کی آزادی کے لیے مسلمانوں نے بالخصوص علمائے کرام نے بے شمار قربانیاں دی ہیں اپنا خون بہایا ہے، بے انتہا صعوبتیں برداشت کی ہیں تب جاکر ملک کو آزادی ملی ہے۔ مولانا حکیم الدین قاسمی سکریٹری جمعیت العلما دہند دہلی نے ان خیالات کے ساتھ شالیمار فنکشن ہال میں منعقدہ عظیم الشان جلسہ عام بعنوان تحریک (ریشمی رومال) شیخ الہند کے سو سال ملک کی آزادی میں اہم رول ادا کرنے والی تحریک کا صد سالہ جشن سے خطاب کیا مولانا نے تاریخ سے واقف کراتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں نے اس ملک پر 9 سو سال سے زیادہ حکومت کی مغل حکمراں رعایا کے ساتھ اس طرح پیش آتے جس طرح ماں باپ اپنی اولاد کے ساتھ پیش آتے ہیں فرانسیسی مورخین نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے۔ ہمارا ملک ہندوستان اپنے آپ میں ایک مثال تھا یہاں کا سوت، اون، ریشم اور صنعتیں دنیا بھر سے منفرد تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ 1866 میں دارالعلوم دیوبند قائم کیا گیا اور مولانا محمود الحسن نے ہی تحریک ریشمی رومال شروع کی لیکن یہ راز فاش ہوگیا اور بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں اور شیخ الہند کو گرفتار کرکے مالٹا میں قید کردیا گیا تین سال بعد جب رہا ہوئے تو گاندھی جی کو ساتھ لے کر جدوجہد آزادی میں شدت پیدا کی، ملک کی آزادی میں اہم رول ادا کرنے والی اس تحریک کو عوام نے بھی بھلا دیا اور حکومتوں نے بھی فراموش کردیا اس صد سالہ جشن کا مقصد اسی تاریخ کو یاد دلانا ہے اور نئی نسل کو واقف کرانا ہے ملک کی اکثریت بہت اچھی ہے محض چند فیصد لوگ ہیں جو نفرت کی بات کرتے ہیں اور بتایا کہ ملک بھر میں تحریک ریشمی رومال شیخ الہند کے سو پروگرام ہوں گے گلبرگہ میں یہ چوتھا پروگرام ہے۔

روزنامہ 'سالار' بنگلور، 26 جون 2012

مدھیہ پردیش:

بھوپال میں ادبی تقریب

بھوپال: خوشبو ایجوکیشنل اینڈ کلچرل سوسائٹی کے زیر اہتمام بتاریخ 9 جون کی شب مقامی روٹری کلب میں ایک شاندار اور معیاری نشست منعقد ہوئی جس میں محترم نصیر پرواز کو فخر خوشبو کے اعزاز سے نوازا گیا جس میں ان کو سپاس نامہ پیش کیا گیا جس کو قاضی ملک نوید نے پڑھ کر سنایا۔ اردو ایکشن کے مدیر اعلیٰ حاجی حافظ ماجد حسین نے پروگرام کی صدارت فرمائی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے محترم سلیم قریشی چیئرمین مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے شرکت فرمائی۔ جناب خلیل اللہ ایڈووکیٹ سابق چیئرمین انسانی حقوق کمیشن، دہلی سے تشریف لائے پروفیسر خالد محمود صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، دیوبند سے تشریف لائے مشہور ومعروف افسانہ نگار جناب انجم عثمانی نے شرکت فرمائی۔ اس خوبصورت موقع پر جناب سلیم قریشی اور مہمان افسانہ نگار انجم عثمانی کا استقبال شال اور مومنٹو پیش کرکے کیا گیا۔ صدر خوشبو جناب ساجد پریمی نے انجم عثمانی کا مختصر تعارف پیش کیا۔

روزنامہ 'اردو ایکشن' بھوپال، 11 جون 2012

مہاراشٹر:

ایک شام فیض وکیفی کے نام

میرا روڈ: جن وادی لیکھک سنگھ اور ڈی وائی ایف آئی کے اشتراک سے گزشتہ دنوں فیض احمد فیض اور کیفی اعظمی کی یاد میں گیتوں، نغموں اور غزلوں کی ایک منفرد محفل کا انعقاد نیا نگر میرا روڈ میں کیا گیا۔ اس جلسے کی صدارت مشہور افسانہ نگار سلام بن رزاق نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ آج ہمارے سماج کو دوبارہ انقلابی گیتوں، نظموں اور ایسی روشن تحریروں کی اشد ضرورت ہے۔ اس محفل میں مشہور گلوکارہ محترمہ سیما سہگل نے اپنی سریلی آواز میں فیض احمد فیض کی چنندہ غزلوں کو پیش کیا جسے سامعین نے بے حد پسند کیا۔ اس کے علاوہ اس موقع پر محترمہ کائنات کوثر، شمیم عباس، سکندر مرزا اور ارون مشرا نے بھی نظمیں اور غزلیں پیش کیں۔ جلسے کی نظامت مختار خان نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' 2 جولائی 2012

ہندوستانی پرچار سبھا کی فری اردو کلاسوں کا جلسۂ تقسیم اسناد

ممبئی: ہندوستانی پرچار سبھا کی جانب سے اردو فری کلاسوں کا جلسۂ تقسیم اسناد بڑے تزک واحتشام کے ساتھ منایا گیا۔ اس جلسے کی صدارت ہندوستانی پرچار سبھا کے ٹرسٹی وصدر جناب فرانسس میتھیو نے فرمائی۔ ان کے علاوہ جلسے میں محترمہ ڈاکٹر مادھوری چھیڑا، محترمہ کملیش بخشی، ڈاکٹر سشیلا گپتا اور جناب سدھا کر گپتا بھی جلوہ گر تھے۔ مشہور ادیب محترم نور پرکار، ڈاکٹر کلیم ضیا، محترم محمد حسین یوسف پرکار، جناب سید قاسم علی، جناب عارف

اعظمی اور جناب عبداللہ خان کی موجودگی نے محفل کی رونق میں مزید چار چاند لگادیے۔ اپنے خطبۂ صدارت میں جناب فرانسس میاتھیو نے جناب محمد حسین پرکار کو کلاسوں کی روزافزوں ترقی پر اور جلسے کی کامیابی پر مبارکباد دی اور اردو کی ترقی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی پرچار سبھا میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی ترقی وترویج کا کام جاری وساری ہے، ہم نے اِس کام کو آگے بڑھانے میں کچھ نئے تجربات بھی کیے ہیں جیسے ممبئی ومضافات اور ممبئی کے باہر کالجوں کے طلبا کے لیے تقریری مقابلے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کالج و یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے آل انڈیا پیمانے پر مضمون نویسی کے مقابلے رکھے اور عہدِ حاضر کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مختلف عنوانات دے کر انھیں اظہار خیال کی

دعوت دی۔ اِس طرح ہم نے ملک کے نوجوانوں میں تحریری اور تقریری صلاحیت اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں دعوتِ فکر بھی دی ہے۔ اردو سے اپنی رغبتوں کا ذکر کرتے ہوئے BA کے طلبہ نے اپنی پڑھائی کو جاری رکھنے کے لیے نئے کلاسوں کی درخواست کی تھی، اِس پر صدر جلسہ نے کہا کہ اگر آپ اپنی پڑھائی منقطع نہیں کرنا چاہتے تو ہم اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ آپ مزید دو سالوں تک ایم اے سطح کا کورس کریں اگر آپ اِس سلسلے کو مزید وسعت دینا چاہتے ہیں تو ہم آپ کی مدد کریں گے۔ صدرِ جلسہ کے ہاتھوں اردو کے جملہ کامیاب طلبہ (ابتدائی سے بی اے سطح تک) کو سند دی گئی اور کتابوں کی شکل میں انعام سے سرفراز کیا گیا۔

پریس نوٹ، ممبئی، 19 اپریل 2012

مغربی بنگال:

منٹو صدی پر تقریب

کلکتہ: برصغیر کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو (11 مئی 1912 تا 18 جنوری 195) کو وہ مقام حاصل ہے جہاں حقیقت اور افسانہ ایک ہوجاتے ہیں۔ ان کے افسانے غضب کے ہیں جو تقسیم الم اور درد سے قلبی لگاؤ رکھتے ہیں۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ، کھول دو، کالی شلوار، ان کے شاہکار افسانوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان کی دنیا ہمارے اردگرد کی جیتی جاگتی دنیا ہوتے ہوئے بھی دھیرے دھیرے بدلتی جاتی ہے۔ منٹو ترقی پسند بھی تھے لیکن جدید نظریہ کے بھی قائل تھے۔ اس ضمن میں خود منٹو کا کہنا ہے کہ نفیس زیورات کبھی بھی خالص سونے سے تیار نہیں کیے جاسکتے ہیں۔ ان کے مطابق ادب یا تو ادب ہے یا ادب نہیں ہے۔ ہر مصنف اپنی تحریروں میں انسانیت کا قلعہ تیار کرنا چاہتا ہے۔ منٹو کی بھی یہی خوبی تھی۔ بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے احساسات کی ترجمانی کی، جذبات سے خود کو اپنی تحریروں میں الگ رکھا۔ ان پر فحاشی کے الزامات ہیں جو بالکل بھونڈے ہیں۔ انھوں نے سماج کے گندے پن کو ظاہر کیا ہے جس پاکستان میں ان پر مقدمات چلے اسی پاکستان نے 2005 میں اس کی یاد میں ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔ بھارتیہ بھاشا پریشد میں منٹو کی صد سالہ تقریب کے موقعے پر مقررین نے کھل کر اس عظیم افسانہ نگار کے تعلق سے اظہار خیال کیا۔ شرکا میں امرمترا، پروفیسر شمبھو ناتھ، صدیق عالم اور کلیم حاذق خاص مقررین تھے۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' کولکاتہ، 1 جولائی 2012

اعزاز و اکرام:

مہاراشٹر ساہتیہ اکادمی انعامات

ممبئی: مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی نے 2009 اور 2010 کے انعامات کا فیصلہ کرلیا ہے جس کے مطابق، مشہور شاعر اور 'ذہن جدید' کے مدیر زبیر رضوی اور برصغیر کے صف اول کے افسانہ نگار سلام بن رزاق کو سنت گیانیشور قومی ایوارڈ دیا جائے گا۔ یہ انعام 51-51 ہزار روپے نقد اور توصیفی اسناد پر مشتمل ہوتا ہے۔ زبیر رضوی کو 2009 اور سلام بن رزاق کو 2010 کے ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اکادمی کا ایک اور قومی ایوارڈ ولی دکنی سے منسوب ہے جو 30-30 ہزار روپے اور توصیفی سند پر مشتمل ہوتا ہے۔ 2009 کے اس ایوارڈ کے لیے مشہور شاعر اور مدیر 'شاعر' افتخار امام صدیقی اور 2010 کے ایوارڈ کے لیے معروف جدید افسانہ نگار علی امام نقوی کا نام منتخب کیا گیا ہے۔ سراج اورنگ آبادی سے منسوب ریاستی ایوارڈ اورنگ آباد سے تعلق رکھنے والے مشہور افسانہ نگار نورالحسنین اور جدید لب و لہجے کے شاعر منصور اعجاز (ایوت محل) کو دیا جائے گا۔ ہارون رشید ایوارڈ برائے صحافتی خدمات کے لیے جن ناموں کا انتخاب کیا گیا ہے وہ اس طرح ہیں: 2009 کے لیے عبدالحئی انصاری (انقلاب)، شعیب ہاشمی، لطیف جعفری اور خان شمیم۔ 2010 کے لیے محمد اقلیم (راشٹریہ سہارا)، محمد تقی شاداب (ورق تازہ، نانڈیز)، قاضی ارشاد (پرلی) اور فیروزہ تسی (کوکن)۔ ترجمہ نگاری کا ایوارڈ معین الدین عثمانی (جلگاؤں) اور منیشا پٹوردھن کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے جب کہ نئی صلاحیت کے لیے دیا جانے والا ساحر لدھیانوی ایوارڈ شفیع احمد شفیع اور عزیز نبیل (بھیونڈی ضلع تھانے) کے حصے میں آیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' 13 جولائی 2012

سنیل اُتسو

مظفر نگر: عظیم مجاہد آزادی شمس العلما پروفیسر رشید پاشا مرحوم کی یاد میں 1980 سے قائم پاشا اردو لائبریری نے مشہور شاعر، کوی اور مضمون نگار سنیل اُتسو کو ہندی اردو کے لیے ان کی 25 سالہ خدمات کے اعتراف میں انھیں آنجہانی صحافی اور مشہور کوی تلسی نیل کنٹھ ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ اس تقریب کی صدارت اتر پردیش اردو اکادمی سے منشی پریم چند ایوارڈ یافتہ مشہور مضمون نگار ڈاکٹر پردیپ جین نے کی۔ بعد میں کوی سمیلن اور مشاعرہ کا انعقاد بھی عمل میں آیا، جس کی صدارت استاد شاعر حضرت عثمان عادل نے فرمائی اور نظامت کے فرائض نوجوان شاعر ایاز احمد طالب نے انجام دیے۔ سنیل اُتسو کو اِس ایوارڈ میں توصیفی سند کے علاوہ 5000 روپے نقد بھی پیش کیے گئے۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 12 جون 2012

استاد امجد علی خاں

نئی دہلی: دہلی کی وزیراعلیٰ شیلا دکشت نے دہلی سکریٹریٹ میں ستار نواز استاد امجد علی خاں، ٹھمری گلوکارہ گرجا دیوی اور انگریزی کے ناول نگار رسکن بانڈ کو لائف ٹائم ایوارڈ سے نوازا۔ انعام یافت گان نے اپنے اپنے میدان میں کئی دہائیوں تک قومی اور بین الاقوامی سطح پر قابل قدر خدمات انجام دیں جس کے اعتراف میں انھیں دہلی حکومت نے نوازا اور 11-11 لاکھ روپے کے چیک دیے۔ استاد امجد علی کا تعلق موسیقی کے سینیا گھرانہ سے ہے۔ انھیں ستار ان کے والد اور استاد حافظ علی خاں نے بجانا سکھایا تھا۔ انھیں پدم شری ایوارڈ سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ اس موقعے پر شیلا دکشت نے کہا کہ فن کار اور مصنف کسی بھی قوم کی دولت مانے جاتے ہیں اور وہ سماج کو راہ دکھاتے ہیں۔ استاد امجد علی خاں نے ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد خوشی اظہار کرتے ہوئے وزیراعلیٰ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں بے حد مشکور ہوں کہ مجھے اس ایوارڈ سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 جون 2012

پروفیسر قاضی زین الساجدین

میرٹھ: آج چودھری چرن سنگھ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کے پریم چند سیمینار ہال میں میرٹھ شہر کے قاضی پروفیسر زین الساجدین کے اعزاز میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ یہ پروگرام ان کو صدر جمہوریہ کے ذریعے

اعزاز عطا کیے جانے کی خوشی میں دیا گیا جوان کو ابھی حال ہی میں دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ قاضی زین الساجدین علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں پروفیسر کے عہدہ پر رہتے ہوئے ریٹائر ہوئے تھے اور وہ ادبی و سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں۔ ان خدمات کے لیے سال 2011 میں صدر جمہوریہ کے ذریعہ اعزاز دیے جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ یہ اعزاز ان کو عربی زبان میں ان کی

کارکردگی کے لیے پیش کیا گیا۔ ان کو شال، بکے و مومنٹو پیش کیے گئے۔ پروگرام کی صدارت شعبہ اردو کے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اور نظامت ڈاکٹر آصف علی نے کی۔

پریس ریلیز، میرٹھ، 23 جون 2012

محمد خلیل

نئی دهلی: معروف سائنسی صحافی، مصنف اور تبصرہ نگار محمد خلیل کو گزشتہ دنوں ہندی زبان میں سائنسی خدمات کے اعتراف میں آتما رام ایوارڈ برائے 2008 سے صدر جمہوریہ نے نوازا۔ محمد خلیل کے گزشتہ 3 دہائی سے زائد عرصے سے ہندی اور اردو کے رسالوں میں سائنسی موضوعات پر متعدد مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے موضوعات بچوں کا ادب، خواتین کا ادب، ماحولیات، حیوانات، توانائی، صحت اور سائنس دانو ں کے سوانح ہوتے ہیں۔ محمد خلیل کی گراں قدر خدمات کے لیے ملک کے کئی ادارے اعزازات سے نواز چکے ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 جون 2012

پی پی سریواستو رند

غازی آباد: دہلی کی ایک مستند ادبی، ثقافتی اور سماجی انجمن 'سروبھاشا سنسکرتی سمان سمیتی' نے امسال اردو زبان کے منفرد لب و لہجے کے معتبر اور معروف بزرگ شاعر پی پی سریواستو رند کو ان کی مجموعی اردو خدمات کے پیش نظر 'ساہتیہ شرومنی پنڈت دامودر داس چترویدی سمان 2012' سے سرفراز کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 جون 2012

شکیل اختر

نئی دهلی: معروف خطاط اور آرٹسٹ شکیل اختر کے اعزاز میں جامع مسجد میں واقع ہوٹل الحرم میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ سماجی کارکن عرفان قریشی کی صدارت میں ہوئے ادبی پروگرام میں خطاط شکیل اختر کی علمی ادبی و ثقافتی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے محمد گلفام نے کہا کہ پرانی دہلی ہمیشہ سے علم و فن کا گہوارہ رہی ہے اور آج بھی بے شمار فنکار بےلوث اپنی فنی خدمات بغیر کسی نام و نمود کے انجام دے رہے ہیں۔ عرفان قریشی نے اپنے خطاب میں کہا کہ اگر جدید دور میں اردو خطاطی کو فروغ دینے کے لیے شکیل اختر آرٹسٹ جیسے فنکار اپنی خدمت پیش کریں تو ہماری نئی نسل میں فن خطاطی کو دوبارہ عروج حاصل ہوسکتا ہے۔ شکیل آرٹسٹ نے اس موقعے پر کہا کہ وہ شکیل اکادمی کے زیر اہتمام مفت مسلم بچوں کو فن خطاطی کی تربیت دے سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج یہ فن آہستہ آہستہ ختم ہوتا جارہا ہے اس لیے ہم سب کو مل کر فن خطاطی کی بقا و سلامیت کے لیے اپنا تعاون دینا نہایت ضروری ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 جون 2012

مست حفیظ رحمانی

سیتاپور: مست حفیظ رحمانی کا نام ادب کی ان معتبر ہستیوں میں شمار کیا جاتا ہے جو اردو ادب کی زینت ہیں۔ مذکورہ بات ڈاکٹر انیس الحسن بسوانی نے قصبہ لہرپور میں دبستان ادب کے ذریعے منعقدہ ایک شام مست کے نام میں مقالہ پڑھتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ سیتاپور کی سرزمین ہمیشہ سے ہی علم و ادب کا گہوارہ رہی ہے۔ اس سرزمین نے ریاض خیرآبادی، مضطر خیرآبادی، جگر بسوانی جیسی متعدد ہستیوں کو جنم دیا جن کی بدولت اردو ادب میں چار چاند لگے۔ صنف سخن کی شاید ہی ایسی کوئی بڑی ہستی رہی ہو جس کا تعلق کسی نہ کسی شکل میں سیتاپور سے نہ رہا ہو۔ دنیا بھر میں اس سرزمین پر جنم لینے والی ہستیوں نے ہمیشہ اپنا لوہا منوایا ہے۔ مرزا اسداللہ خاں غالب، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری وغیرہ نے بھی اس سرزمین سے فیض حاصل کیا ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 29 جون 2012

رسم اجرا:

آدمی لہولہو

اودگیر: شاعر کو ذمے دار، متوازن شخصیت اور شفاف فکری کا حامل ہونا چاہیے۔ ان صفات سے متصف شاعر ڈاکٹر مقبول احمد مقبول کی شاعری کو ذوق تفکر اور مضبوط قوت ارادی کا پراثر امتزاج کہا جاسکتا ہے۔ یہ بات ڈاکٹر مقبول احمد مقبول کے شعری مجموعے 'آدمی لہولہو' کی رسم اجرا کے موقع پر قطب سرشار نے اپنے صدارتی خطاب

کے دوران ڈاکٹر مقبول کی شاعری کے حوالے سے کہی۔ رسم اجرا 4 جون کو پریس کلب بشیر باغ حیدرآباد میں ممتاز بزرگ شاعر و ماہر اقبالیات حضرت مضطر مجاز کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ رسم اجرا کے بعد اپنے خطاب میں انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر مقبول احمد مقبول شعری اظہار کا سلیقہ رکھتے ہیں ان کی غزلوں میں بیشتر اشعار ایسے موجود ہیں جو زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی ترجمانی کرتے ہیں۔

پریس ریلیز، اودگیر، 21 جون 2012

ہندوستانی فلمیں اور اردو

دربهنگه: ابتدا ہی سے فلموں کا اردو سے گہرا اور اٹوٹ رشتہ رہا ہے جو ترسیل کے ضمن میں آسان سے آسان ترین شکل میں اپنائی جاتی رہی ہے۔ آج کی فلموں کے تناظر میں ہمیں اپنا دل کشادہ رکھنا چاہیے کیوں کہ اس میں اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی کے الفاظ بے دریغ استعمال کیے جارہے ہیں لیکن بنیاد اردو ہی ہے اور سب سے زیادہ اسی زبان کے الفاظ فلموں میں مل رہے ہیں مقررین نے ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر امام اعظم کی مرتبہ کتاب 'ہندوستانی فلمیں اور اردو' کی رسم اجرائی تقریب میں کیا جو ماہنامہ

'سہیل' کے زیر اہتمام ہوٹل کریسٹ ووڈ' کولکاتا میں 23 جون 2012 (سنیچر) کو منعقد ہوئی تھی۔ اس کتاب کا اجرا جناب محمد ندیم الحق (ایم پی' راجیہ سبھا) اور ایگزیکیوٹیو ایڈیٹر روزنامہ 'اخبار مشرق' نے کرتے ہوئے کہا کہ آج فلموں میں ہندی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو کے الفاظ کثرت سے استعمال ہو رہے ہیں۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب امین الدین صدیقی (ایڈیٹر' روزنامہ 'آزاد ہند') نے کہا کہ مدرسوں اور فلموں کا اردو پر بڑا احسان ہے۔ ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی، پروفیسر سلیمان خورشید، انیس رفیع وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ مرتب ڈاکٹر امام اعظم نے ماہنامہ 'سہیل' اور بطور خاص جناب جمیل منظر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میں شامل مضامین قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے الفاروق ایجوکیشنل ویلفیئر ٹرسٹ' گنگوارہ (دربھنگہ) کے زیر اہتمام ایک روزہ قومی سیمینار میں پڑھے گئے اور چند مضامین 'تمثیل نو' دربھنگہ کے خصوصی گوشہ سے شامل کیے گئے ہیں جو فلموں کے ہر پہلو کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد صدر جلسہ جناب ظہیر انور (ڈراما نگار) نے کہا کہ فلموں میں عام زبان ہی استعمال ہوتی ہے تاکہ ترسیل میں رکاوٹ نہ ہو۔ انھوں نے ابھی کتاب کی اشاعت بھی کی۔ اس تقریب کی نظامت شکیل انصاری نے کی۔ پریس ریلیز، دربھنگہ، 23 جون 2012

سہ ماہی 'طنز و مزاح' کا نواں شمارہ

کرناٹک: انجمن خوش دلانِ کرناٹک کے ترجمان سہ ماہی 'طنز و مزاح' کے نویں شمارے کی رسم رونمائی اور جناب رگھوتم راؤ (دیسائی) کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا ہونے پر بتاریخ 10 جولائی 2012، ساڑھے سات بجے شام بہ مقام 'اردو ہال' (حمید شاہ کامپلیکس، بنگلور) ایک رنگارنگ تقریب منعقد ہوئی۔ محترمہ ڈاکٹر زبیدہ بیگم صدر نشین انجمن خوش دلان کرناٹک نے صدارت کی۔ اردو کے ممتاز افسانہ نگار (ومعتمد، حمید شاہ ٹرسٹ) جناب فیاض قریشی نے سہ ماہی 'طنز و مزاح' کا اجرا کرتے ہوئے رسالے کی تواتر کے ساتھ اشاعت کو فال نیک قرار دیا اور اس توقع کا اظہار کیا کہ آئندہ کسی توقف کے بغیر یہ رسالہ اپنا سفر جاری رکھے گا۔ انھوں نے اِس ضمن میں انجمن خوش دلان کے عہدہ داران اور اراکین کی کاوشوں کو سراہا اور یہ یقین بھی دیا کہ انجمن خوش دلان کرناٹک کی سرگرمیوں کے لیے اردو ہال مہیا کیا جائے گا۔ انجمنِ خوش دلانِ کرناٹک کے فعال معتمد اور 'طنز و مزاح' کے مدیر جناب (پروفیسر) محمد خلیل احمد نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے 'طنز و مزاح' کے نویں شمارے کی مشمولات پر سیر حاصل روشنی ڈالی۔

پریس نوٹ، کرناٹک، بنگلور، 11 جولائی 2012

درد کے الفاظ

مظفر نگر: قمر ادبی سوسائٹی کے زیر اہتمام نوجوان شاعر ڈاکٹر محمد عارف خالد کے اردو- ہندی میں شائع مجموعہ 'درد کے الفاظ' کا اجرا کی تقریب عمل میں آئی جس میں مقررین نے کہا کہ ڈاکٹر محمد عارف خالد اردو ادب کے نئے ستارے ہیں، جو ایک نئے فلسفے کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ راج محل ریسٹورینٹ میں منعقدہ اس تقریب کی صدارت ڈاکٹر صداقت علی دیوبندی نے کی، اور نظامت عبدالحق سحر نے انجام دی۔ مہمانِ خصوصی چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی شعبۂ اردو کے صدر جناب محمد اسلم جمشید پوری اور شری رام گروپ آف کالجز کے چیئرمین ڈاکٹر ایس سی کل شریشٹھ موجود تھے۔ ڈاکٹر ایس سی کل شریشٹھ نے کہا کہ گو کہ وہ شاعری سے ذوق نہیں رکھتے لیکن ڈاکٹر محمد عارف خالد کا شعری مجموعے 'درد کا الفاظ' پڑھنے کے بعد ان کے دل میں شاعری کرنے کا احساس بیدار ہوا ہے۔ صدارت کر رہے ڈاکٹر صداقت علی صاحب نے فرمایا شاعری تخلیق کار کے دلی جذبات کا آئینہ ہوتی ہے، ڈاکٹر محمد عارف خالد نے 'درد کے الفاظ' کو شعری جامہ پہنا کر اپنے دل میں درد رکھنے والوں کو درد کی شدت برداشت کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے اپنا درد بھی بیان کیا ہے۔ ایاز احمد طالب نے کہا کہ ڈاکٹر عارف خالد مزاجاً روایتوں کی پاسداری میں یقین رکھتے ہیں وہ ادب کے شاندار ماضی سے روحانی و ذہنی طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ تخلیق کار ونا شرمت دھرم سنگھ نے اردو، ہندی میں شائع شدہ مجموعۂ کلام کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ 'درد کے الفاظ' میں ڈاکٹر عارف خالد نے اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو الفاظ میں کے ذریعے پیش کیا ہے۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 6 جولائی 2012

سائے سائے اور متاعِ قمر

نئی دہلی: اردو کو چار چاند لگانے میں زبان ولسان کے ساتھ ساتھ اردو مشاعروں اور شعری نشستوں کا عمل دخل ہمیشہ سے رہا ہے۔ پرانی دہلی میں انھیں چھوٹی چھوٹی شعری نشستوں کی وجہ سے یہاں کی تہذیبی روایات زندہ ہیں۔ اردو کی ترقی و ترویج اور فروغ میں طبی شخصیات کا بھی بڑا رول رہا ہے، اردو اور طب یونانی کا رشتہ بہت گہرا اور اہم ہے۔ ان خیالات کا اظہار اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے غالب اکادمی میں انجمن فروغ اردو اور ریکس ریمیڈیز پرائیویٹ لمیٹڈ کے باہمی اشتراک اور اردو اکادمی کے تعاون سے منعقد ایک ادبی و شعری محفل میں معروف شاعر درد دہلوی کی تخلیق 'سائے سائے' اور ویریندر قمر بدر پوری کے شعری مجموعہ 'متاعِ قمر' کے اجرا کے موقع پر کیا۔ ان دونوں کتابوں کا اجرا پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر و حکیم اسلم جاوید، الحاج شعیب اکرم اور نیلم دواخانہ کے حکیم امام الدین ذکائی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 10 جولائی 2012

پاکستان کا سفرنامہ

نئی دہلی: زینت مسعود زینب کی کتاب 'پاکستان کا سفرنامہ' کے اجرا کی تقریب ان کی رہائش گاہ سریتا وہار میں منعقد ہوئی۔ کتاب کے رونمائی معروف ناول نگار مشرف عالم ذوقی، معروف شاعر کمال جعفری، ڈاکٹر نجمی رحمٰن اور عامر رحمان کے ہاتھوں ہوئی۔ اس موقع پر مشرف عالم ذوقی نے کہا کہ زینت مسعود زینب ہم سب کے لیے ایک مثال ہیں۔ انھوں نے کہا کہ عام طور پر 60 سال کی عمر کے بعد قلم سونے لگتا ہے، زینت مسعود نے اس عمر میں آ کر قلم کی ذمے داری سنبھالی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی چار اہم کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں اچھے سفرناموں کی کمی ہے اور اس کمی کو بہت حد تک زینت مسعود زینب نے پورا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 جولائی 2012

اپنے لوگ

دیوبند: ممتاز ادیب و قلم کار مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کی نئی تصنیف 'اپنے لوگ' کا اجرا ایک پُرشکوہ تقریب میں کیا گیا۔ پروفیسر حامد تحسین نے کہا کہ نسیم اختر شاہ قیصر نے ہر موضوع پر لکھا ہے اور دادِ تحقیق دی ہے، جامعہ امام محمد انور شاہ کے استاذ مولانا عبدالرشید بستوی نے کہا کہ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر اس عہد کے ممتاز قلم کار ہیں اور شخصیات پر تو ان کے مضامین اپنا الگ ذائقہ اور لطف رکھتے ہیں۔ معروف شاعر جلیس نجیب آبادی نے 'اپنے لوگ' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ نسیم اختر شاہ قیصر کی تحریریں انشا و ادب کا بہترین شاہکار ہیں، ان کی پچھلی دو کتابیں 'میرے عہد کے لوگ'، جانے پہچانے لوگ' اس کا ثبوت ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 جون 2012

وفیات:

پروفیسر وہاب اشرفی

پٹنہ: ممتاز ادیب و تنقید نگار پروفیسر وہاب اشرفی کا 15 جولائی کو صبح پٹنہ میں انتقال ہوگیا۔ وہ 76 سال کے تھے اور کچھ عرصے سے بیمار چل رہے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ 4 بیٹے اور 2 بیٹیاں ہیں۔ مرحوم 35 سے زائد کتابوں کے مصنف تھے۔ 2 جون 1936 کو کاکو جہان آباد، میں پیدا ہوئے تھے وہ اردو، فارسی اور

انگریزی ادب میں پوسٹ گریجویٹ تھے۔ فارسی میں گولڈ میڈلسٹ تھے۔ 2007 میں انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا تھا۔ یہ ایوارڈ ان کی کتاب 'تاریخ ادب اردو' پر دیا گیا تھا۔ انھیں بہار اردو اکادمی نے مجموعی خدمات کے اعتراف میں 1982 میں ایوارڈ دیا تھا۔ ان کی مختلف کتابوں پر انعامات دیے جا چکے ہیں۔ 1992 سے 1997 تک وہ یونیورسٹی سروس کمیشن کے چیئرمین رہے۔ وہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے۔ ان کی مشہور کتابوں میں کاشف الحقائق کا تنقیدی جائزہ، معنی کی تلاش، مثنوی و مثنویات، نقوش ادب، تیسری آنکھ، آگاہی کا منظرنامہ وغیرہ ہیں۔ 3 درجن سے زائد کتابوں

کے مصنف وہاب اشرفی کو ان کے ادبی کارنامے کے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 'غالب سمان' اور 'بھاشا بھارتی' سمان سے نوازا گیا تھا۔ ان کے انتقال پر وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہاب اشرفی اردو ادب کے مشہور نقاد تھے۔ ان کی وفات سے اردو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ آر جے ڈی سپریمو اور سابق وزیر اعلیٰ لالو پرساد یادو، پارٹی کے قومی جنرل سکریٹری اور ممبر پارلیمنٹ رام کرشن یادو، بہار اسمبلی کونسل میں سابق ڈپٹی لیڈر ڈاکٹر اسلم آزاد، سابق وزیر عبدالمالک، ماہر جمالیات پروفیسر شکیل الرحمٰن، ستیہ وتی کالج کے لیکچرار ڈاکٹر شیخ عقیل احمد اور لطف الرحمٰن سمیت دیگر اردو ادیبوں نے وہاب اشرفی کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 جولائی 2012

اشفاق محمد خاں

نئی دہلی: جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے سابق استاد ڈاکٹر اشفاق محمد خاں کا 4 جولائی کو صبح لکھنؤ میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 75 سال کے تھے اور جے این یو کے شعبہ اردو میں خدمات سے سبکدوش ہونے کے بعد اندر انگر لکھنؤ میں عرصے سے قیام پذیر تھے۔ ان کے پسماندگان میں ان کی اہلیہ کاسنی بیگم ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد پر ان کا تحقیقی مقالہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ دلچسپ خاکوں کے علاوہ انھوں نے لکھنؤ کے روز وشب پر ایک شہر نامہ تحریر کیا۔ ڈاکٹر اشفاق قائم گنج کے رہنے والے تھے۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں پروفیسر محمد حسن کے ریٹائر ہونے کے بعد ماس میڈیا ڈپلومہ کورس کی تمام ذمے داریاں انھوں نے سنبھالیں۔ اس کے علاوہ محمد حسن کی ادارت میں نکلنے والے عصری ادب سے بھی وہ وابستہ رہے تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 جولائی 2012

ڈاکٹر عابد حسین

دہلی: مشہور زمانہ ماہر معاشیات انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کے اعلیٰ افسر اور مثالی سفارت کار عابد حسین کا لندن میں 85 برس کی عمر میں 21 مئی کو انتقال ہوگیا۔ تقریباً ڈھائی مہینے بعد ملنے والی تفصیلات کے مطابق انھیں دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔ عصر کے وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ سے منسلک قبرستان میں 29 مئی 2012 کو عزیز واقارب، دوست واحباب اور ارباب حل وعقد کے جم غفیر نے ان کا جسد خاکی سپرد خاک کیا۔ 1988 میں عابد حسین کو ملک کے تیئں اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا تھا ان کی شادی چین و ہند تنازعہ سے متعلق 'سائینو انڈین کانفلکٹ اینڈ انٹرنیشنل پالیٹکس ان دی انڈین سب کونٹینینٹ' نامی شہرت یافتہ کتاب کی مصنفہ ترلوک کارکی سے ہوئی تھی۔ پسماندگان میں ان کی اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 جولائی 2012

ارشد علی

کوٹہ: مشہور شاعر وادیب مخمور سعیدی کے اکلوتے چھوٹے بھائی ارشد علی خاں، کا انتقال 9 جون 2012 کو ٹونک، راجستھان میں ہوگیا۔ 9 مئی 2012 کو ڈاکٹروں نے آخری اسٹیج کا کینسر بتایا اور ایک ماہ میں انتقال بھی ہوگیا۔ وہ تقریباً 69 سال کے تھے۔ وہ 'چھوٹے میاں' کے نام سے زیادہ جانے جاتے تھے۔ ارشد علی شعر بھی کہتے تھے اور اُن کا کلام کچھ رسالوں میں چھپتا بھی تھا۔ مخمور صاحب کی وفات پر ان کے درج ذیل اشعار دل کو چھونے والے ہیں جو ماہنامہ 'ایوانِ اردو' کے اپریل 2012 کے شمارے میں شائع ہوئے تھے:

یوں، ساتھ چلنے والوں سے منہ موڑتے نہیں
بھائی! کسی کا ایسے تو دل توڑتے نہیں
منزل کے آتے آتے لگے سانس پھولنے
اتنے بھی تیزگام میاں دوڑتے نہیں
اچھا تھا اپنے ساتھ ہی لے جاتے تم اسے
جو منحصر تھا تم پہ اسے چھوڑتے نہیں
یادوں میں تو بسے ہو مگر کس لیے جناب
خوابوں کا سلسلہ بھی کوئی جوڑتے نہیں

ارشد علی خاں کو اردو پروف ریڈنگ پر عبور حاصل تھا۔ انھوں نے ہندی سے اردو اور اردو سے ہندی درجنوں کتابوں کے ترجمے کیے۔

پریس نوٹ، کوٹہ، 9 جون 2012

فردوس سلطان پوری

ممبئی: اردو کے مشہور شاعر مجروح سلطانپوری مرحوم کی اہلیہ فردوس سلطان پوری کا 14 جولائی کی صبح دس بجے کے قریب انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحومہ کی عمر 82 برس تھی اور وہ گزشتہ کئی مہینوں سے علیل تھیں۔ ان کی تدفین کل بعد نماز مغرب، جو ہو قبرستان، جوہو، سانتا کروز (مغرب) ممبئی، میں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر ادبی حلقے کے ممتاز لوگ اور فلم سے وابستہ مقتدر حضرات بھی موجود تھے۔ پسماندگان میں ایک بیٹا عندلیب سلطانپوری اور تین بیٹیاں نوگل، نو بہار اور صبا ہیں۔ مجروح سلطانپوری نے اپنے شعری مجموعے 'غزل' کا انتساب اپنے اس مطلع کے ساتھ بیگم فردوس ہی کے نام کیا تھا:

تو اے بہارِ گریزاں کسی چمن میں رہے
مرے جنوں کی مہک تیرے پیرہن میں رہے

بحوالہ بزمِ قلم گروپ

عثمان علی جونپوری

ممبئی: کہنہ مشق اردو صحافی عثمان علی جونپوری 6 جولائی کی صبح انتقال ہوگیا۔ بعد نماز عصر انھیں ممبئی کے دھاراوی علاقے میں واقع قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ عثمان علی جونپوری کے پسماندگان میں ایک اہلیہ تین بیٹیاں اور دو بیٹے شامل ہیں۔ عثمان علی نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ممبئی سے شائع ہونے والے اردو روزنامہ 'ہندوستان' سے کیا تھا جہاں وہ کتابت کیا کرتے تھے پھر اس کے بعد انھوں نے روزنامہ 'انقلاب' میں ملازمت کی اور اس کے بعد ادارتی ذمے داریاں سنبھالی۔ اردو روزنامہ 'صحافت' سے وہ کئی مہینوں تک وابستہ تھے۔ ادارت کی تقریباً مکمل ذمے داریاں انھیں کے کاندھوں پر تھیں۔ صحافت سے استعفیٰ دینے کے بعد انھوں نے دوبارہ ہندوستان اخبار میں کام کرنا شروع کیا، یہ ان کی زندگی کا آخری اخبار تھا جہاں دوران ملازمت انھوں نے آخری سفر کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 7 جولائی 2012

خراجِ عقیدت:

مہدی حسن کو دلیپ کمار کا خراجِ عقیدت

ممبئی: شہنشاہ غزل مرحوم مہدی حسن کے ساتھ قربت کا ذکر کرتے ہوئے شہنشاہ جذبات دلیپ کمار نے کہا ہے کہ مہدی حسن کے اس دنیا میں نہیں رہنے کی خبر کو سہنا ان کے اور ان کی بیوی سائرہ کے لیے انتہائی مشکل تھا۔ 89 سالہ اداکار دلیپ کمار نے کہا کہ ہندوستان میں پیدا ہونے اور پاکستان میں اس دنیا سے جانے والے غزل گو مہدی حسن اپنی جادوئی آواز کے ذریعے سماج کے ہر طبقے کے لوگوں کو جوڑنے کی قوت رکھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے اور سائرہ کو اس سانحہ عظیم کو برداشت کرنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔ حسن میاں اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ شہنشاہ جذبات نے اپنے بلاگ پر لکھا ہے کہ حالیہ برسوں میں پھیپھڑوں کی بیماری کی وجہ سے ان کا آنا جانا بند ہوگیا تھا۔ فون پر رابطہ ہوتا تھا لیکن اب وہ رابطہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ لیکن ان کی آواز آج بھی کانوں میں رس گھولتی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 جون 2012

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद
Government of India
کونسل کی بہترین مطبوعات
وہ بھی بغیر کسی پریشانی کے بالکل مفت
اب دستیاب ہیں
آپ کے اپنے کمپیوٹر پر
کمپیوٹر سیکھنا اب ہوگا آسان
ہر گھر میں پہنچا
ڈیجیٹل کمپیوٹر لرننگ پروگرام
لوگ ان کریں ...
www.urducouncil.nic.in

URDU DUNIYA Monthly, August 2012, Vol.14, Issue: 08
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2011-13
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication : 24/7/2012
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

پروفیسر وہاب اشرفی

ولادت:2جون1936،وفات:15جولائی2012

4جولائی2012(قومی اردو کونسل میں ان کی آمد پر لی گئی تصویر)

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor :Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000